مقالاتِ سلیمان

(حصہ دوم)

شاہ معین الدین احمد ندوی

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

جملہ حقوق محفوظ

انا لامن سلیمان وانہ لا بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلسلۂ دار المصنفین

(نمبر ۱۰۱)

مقالاتِ سلیمان

حصّہ دوم

یعنی مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ

((مرتبہ))

شاہ معین الدین احمد ندوی

در مطبع معارف اعظم گڈھ طبع گردید

کتبہ اقبال احمد ۱۱۱۱ سنہ ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۸ء

فہرست مضامین

مقالاتِ سلیمان

جلد دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا قلم نصف صدی تک رواں رہا، اس طویل مدت میں انھوں نے مستقل تصانیف کے علاوہ مذہبی، علمی، تاریخی، اور ادبی مختلف موضوعوں پر سیکڑوں مقالے لکھے، جو علوم و معارف کا گنجینہ ہیں، اُن کا بڑا حصہ معارف میں شائع ہوا، اور کچھ الندوہ، الہلال اور دوسرے اخبارات اور رسالوں میں شائع ہوئے۔

سید صاحبؒ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھاتے تھے، اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑتے، اور تلاش و تحقیق کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے، چنانچہ انھوں نے جس موضوع پر بھی لکھا ہے، معلوم ماخذوں کے لحاظ سے اس میں اضافہ کی بہت کم گنجائش چھوڑی ہے، اور بعض چیزوں میں تو اُن کو اولیت کا درجہ حاصل ہے، اور انھوں نے آیندہ لکھنے والوں کے لئے نئی راہ کھول دی ہے، یہی خصوصیت اس مجموعے کے مضامین میں بھی ہے، رُباعیٔ واقدی، پیرو واقدی، سُنت، پھر سُنت خاص طور سے تلاش و تحقیق کا شاہکار ہیں، اور عرب امریکہ میں تو ان سے پہلے کسی سیاح قلم کا قدم نہ پہنچا تھا،

ان مضامین میں اگرچہ بڑا تنوع ہے لیکن ان کا مرکزی نقطہ اسلامی علوم و فنون، اور اسلامی تاریخ و تہذیب کی مرقع کشی اور اس کی تحقیق و تنقید ہے، اس لئے ان میں کثرت کے باوجود

ایک طرح کی وحدت ہے، اُردو میں اس کے معلم اول مولانا شبلیؒ تھے، سید صاحب نے اس کو کمال تک پہنچا دیا، اور ان دونوں کی تصانیف اور طریقۂ تحقیق نے ایک مستقل مکتب فکر قائم کر دیا، اور اس موضوع پر لکھنے والوں نے انہی کے نقش قلم کی تقلید کی، اگر تنہا انہی کے تصانیف اور مضامین پڑھ لئے جائیں، تو مذہب اسلام، اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تاریخ و تہذیب کے تمام اہم پہلو سامنے آجائیں گے، اس اعتبار سے یہ مضامین مسلمانوں کی علمی تاریخ کا بیش بہا خزانہ ہیں کل مضامین کئی جلدوں میں آئیں گے، اس کی پہلی جلد جو اسلامی ہند سے متعلق مضامین پر مشتمل ہے، گذشتہ سال شائع ہو چکی ہے، زیر نظر دوسری جلد علمی مضامین پر مشتمل ہے، باقی حصے بھی انشاء اللہ آئندہ شائع ہوتے رہیں گے، وما توفیقی الا باللہ،

کتابوں کی ترتیب اشاعت کا ایک تو پرانا سادہ طریقہ ہے، دوسرا تصحیح و تحشیہ وغیرہ، یعنی ایڈٹ کرنے کا جدید طریقہ، ہم نے سید صاحب کی سنت پر عمل کیا ہے، انھوں نے مولانا شبلی کے مقالات اور خود اپنے ادبی مقالات کا مجموعہ نقوش سلیمانی پرانے سادہ طریقہ سے شائع کیا، ہمارے لئے ایڈٹ کی "بدعت حسنہ" کے مقابلہ میں "سنت سلیمانی" زیادہ قابل تقلید تھی،

معین الدین احمد ندوی

۱۷ر مارچ ۱۹۶۸ء

دار المصنفین اعظم گڈھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہندوستان میں علم حدیث

اہل تاریخ پر روشن ہے کہ ہندوستان میں اسلام دو راستوں سے داخل ہوا خشکی سے اور تری سے، خشکی کا راستہ درۂ خیبر کا تھا، جہاں سے ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں نے چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کے آغاز سے داخل ہونا شروع کیا، لیکن ان سے صدیوں پہلے اہل عرب تاجر اور سوداگر کی حیثیت میں سندھ اور ملیبار سے لیکر گجرات تک بحر ہند کے پورے سواحل پر پھیل چکے تھے، وہ اپنے ساتھ اپنا دین، اپنا قرآن اور اپنے علوم بھی لائے تھے، اور اس سے سالہا سال پہلے کہ اسلام کا کوئی تیغ زن سپاہی اس سرزمین پر قدم رکھے یہاں مسلمان عربوں اور عراقیوں کی نوآبادیاں قائم تھیں، اور مسجدیں تعمیر اور آباد تھیں، یہی مسجدیں اسلام کی ابتدائی درسگاہیں تھیں جنمیں وہ بیٹھکر قال اللہ وقال الرسول کا آوازہ بلند کرتے تھے،

صحابہ اور ہندوستان

حضرت عمرؓ کے عہد سے سواحل ہند پر عربوں کی تاخت شروع ہوتی ہے، اور یہ وہ زمانہ تھا جب ہر کلمہ گو کے لب و دہن "اخبرنا اور حدثنا" کی خوشبو سے معطر تھے، یعنی صحابہ کرام کا عہد تھا، اسلام کا یہ پہلا مجاہد قافلہ تھانہ پر حملہ آور ہوا تھا، جو ان دنوں (بمبئی کے بجائے) بحر ہند کا آباد بندرگاہ تھا، اور اس کے بعد بھروچ (واقع گجرات) اس مقدس

بحری عسکر کی دوسری منزل گاہ تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں فوجوں میں دیارِ نبوی سے مشرف ہستیوں کی کچھ تعداد یقیناً شامل ہوگی، اور اس لحاظ سے ہندوستان بھی اُن خوش قسمت ملکوں میں ہے جن کی خاک صحبت یافتگانِ نبوی کے پانوں سے لگ کر ہماری آنکھوں کا کحل الجواہر بن چکی ہے،

ہندوستان میں پہلا محدث

۹۳ھ میں مسلمانوں نے سندھ پر حملہ کیا، اور فتح کیا، اور یہ ملک اُس وقت سے تیسری صدی ہجری کے شروع تک عربوں کے قبضہ میں رہا، ۱۵۹ھ میں خلیفہ مہدی کے حکم سے جو فوج ہندوستان کی طرف روانہ ہوئی، اس میں ربیع بن صبیح السدی البصری بھی تھے، جن کو تابعی ہونے کا شرف حاصل تھا، یہ بھی اُن بزرگوں میں تھے جنھوں نے احادیث کے منتشر اوراق کے یکجا کرنے میں سب سے پہلے حصہ لیا تھا، بلکہ صاحبِ کشف الظنون کا بیان ہے کہ

قیلَ ھُوَ اول من صنّف و بوّب فی الاسلام،	کہا گیا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اسلام میں تصنیف کی،

ابن سعد میں ہے :-

خرج غازیاً الی الهند فی البحر فمات فدفن فی جزیرۃ من جزائر البحر سنة ستین ومایة (ج ۷ ق ۲ - ص ۳۶)	وہ غزا کے لئے ہندوستان سمندر میں گئے تو وہیں انتقال کیا، اور کسی جزیرہ میں ۱۶۰ھ میں دفن ہوئے،

ہندوستان میں ایک تابعی

ہندوستان میں ایک تابعی کا نام حباب بن فضالہ ملتا ہے، انھوں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالکؓ کے دیدار سے آنکھیں روشن کی تھیں، ہندوستان آنے والی فوج میں اُن کا نام لکھا گیا تھا، انھوں نے حضرت انسؓ سے جا کر

فتویٰ پوچھا تھا کہ والدین کی اجازت کے بغیر جہاد کے لئے جا سکتا ہوں یا نہیں، انھوں نے واپس جانے کا مشورہ دیا، معلوم نہیں واپس گئے یا ہندوستان آئے، [۱]

ہندوستان کے ایک تاجر تبع تابعی

اسرائیل بن موسیٰ حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، یہ ہندوستان بکثرت آتے جاتے رہتے تھے، اسی لئے نزیلِ ہند ان کا لقب ہی ہو گیا تھا، ابنِ حبان نے ثقات میں لکھا ہے کان یسافر الی الھند، یہ ہندوستان کا (تجارتی) سفر کیا کرتے تھے، [۲]

دو نو مسلم سندھی محدث

ان لوگوں میں جو دوسری صدی ہجری میں حدیث و سیر کے امام تھے، ابو معشر نجیح سندھی بھی ہیں، یہ مدینہ جا کر رہے، اس لئے مدنی کہلانے لگے، یہ اپنے وقت میں فنِ مغازی و سیر کے امام تھے، بلکہ ان کا نام اس مختصر فہرست میں داخل ہے، جو مغازی و سیر کے واقعات کو سب سے پہلے قید تحریر میں لائے، [۳] سنہ ۱۷۰ھ میں وفات پائی، مرتے دم تک زبان میں سندھیت کا اثر باقی تھا، عربی حروف کے مخارج ٹھیک نہیں ادا کر سکتے تھے، تاہم شاگردوں کا ٹھٹھ کا ٹھٹھ لگا رہتا تھا، جب انھوں نے وفات پائی تو خود خلیفہ ہارون رشید نو مسلم ہندی محدث کی نمازِ جنازہ کا امام تھا،

دوسرے بزرگ رجاء السندی ہیں، جو ایران پہونچ کر اسفرائینی کہلائے، فنِ حدیث میں یہ کمال پیدا کیا کہ مشہور محدث حاکم اُن کے حال میں لکھتے ہیں، رکن من ارکان الحدیث [۴] (یہ حدیث کے ارکان میں سے ایک رکن ہیں) وہ نہ صرف خود محدث تھے، بلکہ اُن کے خاندان میں اور بہت سے حفاظِ حدیث پیدا ہوئے سنہ ۲۲۱ھ میں وفات پائی،

---

[۱] میزان الاعتدال ذہبی جلد اول ص ۲۰۸ [۲] تہذیب التہذیب ابن حجر جلد اول صفحہ ۲۶۱ [۳] تاریخ علمائے ہند ص ۲۳، و ص ۱۷۹ نولکشور؛ [۴] تہذیب التہذیب ج ۳ - ص ۲۶۷،

درۂ خیبر کے راستہ سے پہلا محدث

درۂ خیبر کے راستہ سے یہاں مسلمان پانچویں صدی ہجری کی ابتدا میں داخل ہوئے، سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۲ھ میں لاہور فتح کیا، سلطان مسعود کے عہد میں ایک بزرگ شیخ اسماعیل لاہور سے ہندوستان وارد ہوئے، حدیث و تفسیر کے جامع البحرین اور بڑے موثر البیان تھے، بے شمار آدمی یہاں اُن کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، ۴۴۸ھ میں لاہور میں وفات پائی۔[1] آثار تاریخ علمائے ہند میں ہے،

"از عظمائے محدثین و مفسرین بود داول کسے است کہ علم حدیث و تفسیر بہ لاہور آورد"

دوسرا محدث صغانی

شیخ موصوف کے بعد یہاں ڈیڑھ سو برس تک اندھیرا گھپ چھایا رہتا ہے بالآخر ساتویں صدی کے شروع میں مشارق الانوار کے مصنف صغانی نے یہاں علم حدیث کی روشنی پھیلائی، مگر یہ روشنی گھر میں کم اور گھر سے باہر زیادہ پھیلی،

ان کا نام حسن بن محمد صاغانی ہے، گو اُن کا خاندان ماوراء النہر اور پھر غزنین سے تعلق رکھتا تھا، مگر ان کے پدر بزرگوار نے ہندوستان میں سکونت اختیار کر لی تھی، وہ ۵۷۷ھ میں لاہور میں پیدا ہوئے، اور ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی، پھر یمن و حجاز و عراق میں جا کر علم کی تکمیل کی، اور لغت و حدیث کے امام قرار پائے، اور بغداد میں بیٹھکر خلیفہ مستنصر باللہ عباسی کے نام سے مشارق الانوار نام حدیث کی کتاب تصنیف کی، اور بھی اس فن کی دوسری کتابیں لکھیں، ۶۱۵ھ میں بغداد گئے، اور خلیفہ بغداد اور سلطان غزنین و ہند کے درمیان سفارت کا فرض انجام دیا، ۶۵۰ھ میں وفات پائی،

مشارق الانوار مشکوٰۃ کی طرح حدیث کی مختلف کتابوں کا مجموعہ ہے، فرق یہ ہے کہ مشکوٰۃ کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے، اور مشارق انوار کی ترتیب احادیث کے ابتدائی الفاظ پر ہے یعنی

---

[1] فہرست ابن ندیم ص ۱۳۶،

مثلاً من سے شروع ہونیوالی اذا سے شروع ہونے والی صیغۂ ماضی سے شروع ہونیوالی حدیثیں وغیرہ علمائے محدثین نے اس کتاب کی بڑی قدر کی، اور بے شمار لوگوں نے اس کی شرحیں لکھیں، اور خود یہ کتاب مدارس کے نصاب میں داخل ہوگئی،

الغرض امام صاغانی غزنوی لاہوری تنہا محدث ہیں، اور مشارق الانوار اس دور کی تنہا خدمت حدیث ہے، جو اس عرصۂ دراز میں انجام کو پہنچی لیکن چونکہ امام ممدوح کا تعلق زیادہ تر ملک عرب و عراق سے رہا، اس لئے اُن کا اثر اس ملک کے علماء پر بہت کم پڑا، اور اگر پڑا بھی تو صرف اسی قدر کہ اُن کو اپنے نصابِ تعلیم کے لئے حدیث میں ایک اپنے ہم وطن کی کتاب مل گئی، اور وہ بدستور اپنے علم دانشمندی و علم دانائی میں مصروف رہے، منطق و فلسفہ اور علم کلام کے بعد فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اور وہ بھی عقلی طریق سے، یہی سبب ہے کہ اصولِ فقہ جیسا ضروری علم بھی معقولات اور کلامیات کا ایک ضمیمہ ہو کر رہ گیا،[1]

علم دانائی اور دانشمندی اور حدیث سے بے توجہی

واقعہ یہ ہے کہ درۂ خیبر سے جو مسلمان قومیں وارد ہوئیں، وہ ترکستان، خراسان، اور افغانستان سے آئی تھیں، گو کہ ترکستان و خراسان تیسری صدی میں علمِ حدیث کا گہوارہ تھے، اور امام بخاری، امام مسلم نیشاپوری، امام ترمذی، امام نسائی، ابو داؤد سجستانی، ابنِ ماجہ قزوینی، انہی اطراف و دیار کی سرزمین کی خاک سے پیدا ہوئے تھے، مگر عباسی سلطنت کی کمزوری کے بعد جب ان ممالک میں خود مختار غیر عربی حکومتیں قائم ہوئیں، تو یہ ذوق گھٹتا گیا، اور آخر تاتاریوں کے سیلاب بلا کے بعد تو ہر جگہ سناٹا چھا گیا، مذہبی علوم کی ضرورت تو صرف اس لئے پیش آتی تھی کہ عہدۂ قضا کے ممتاز منصب کو حاصل کیا جائے، اور اس کے لئے صرف فقہ دانی کی ضرورت تھی، فقہ کو فارسی میں دانش کہہ سکتے ہیں،

---

[1] امام صغانی کے حالات، طبقات و تراجم کی تمام کتابوں میں ہیں،

اس لئے علم فقہ کا نام علم دانائی اور فقیہ کا دانا اور دانشمند قرار پایا، چنانچہ اس عہد سے لیکر آجتک ان اطراف میں حدیث وتفسیر کا نہیں، بلکہ علم ودانائی کا رواج ہے، چنانچہ آج بھی ترکستان، خراسان وسرحد سے جو طلبہ علم دین کی طلب کے لئے ہندوستان آتے ہیں، وہ صرف ونحو کے بعد صرف فقہ کے بھوکے ہوتے ہیں، یہی سبب ہے کہ ان ممالک میں فقہ اور فتاویٰ کی بے شمار کتابیں لکھی گئیں، اور حدیث کی طرف اعتنا اور التفات نہ ہوا،

بہرحال ہندوستان میں درۂ خیبر کے راستہ سے جو علمار وارد ہوئے، وہ اپنے ساتھ جو علم دین یہاں لائے، وہ صرف فقہ ودانائی کی کتابوں کا پشتارہ تھا کہ اس پر حکومت کے نظام کا مدار اور وہ ملک کا قانون اور سلاطین کے تقرب کا ذریعہ تھا، چنانچہ شروع عہد سے اخیر تموری عہد تک ہندوستان میں فتاویٰ اور قانون کے مختلف مجموعے تیار ہوئے، اور جن میں سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت فتاویٰ عالمگیری کو حاصل ہوئی،

عہد تموری سے پہلے تک یہاں حدیث کا رواج مطلق نہ تھا چنانچہ تغلق کے عہد تک حدیث میں صرف مشارق الانوار طلبہ کے زیر درس تھی، اور جس خوش نصیب کو مصابیح ہاتھ آجاتی تھی، وہ امام الحدیث سمجھا جاتا تھا، حضرت نظام الدین اولیاء نے اسی مشارق کا درس مولانا کمال الدین زاہد دہلوی سے لیا تھا، اور انھوں نے مولانا برہان الدین بلخی سے لیا[1]، اور انھوں نے خود مصنف سے؛

اس عہد میں اس ملک میں علم حدیث کے ساتھ لوگوں کو جو بے اعتنائی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں مسئلہ سماع کی تحقیق کے لئے علما رکی ایک مجلس منعقد ہوئی، مناظرہ کے ایک فریق شیخ نظام الدین سلطان الاولیاء

---

[1] تاریخ علمائے ہند نولکشور ص ۱۷۳،

تھے، اور دوسری طرف تمام علما تھے، شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جب میں کوئی حدیث بیان کرتا تھا تو علماء بڑی جرات اور بے باکی سے کہتے تھے کہ اس ملک میں حدیث پر فقہی روایت مقدم سمجھی جاتی ہے اور کبھی یہ کہتے تھے کہ چونکہ اس حدیث سے شافعی نے استدلال کیا ہے، اور وہ ہمارا مخالف ہے اسلئے ہم اس کو نہیں مان سکتے؛

لیکن یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس عظیم الشان مناظرہ میں کون سی حدیث صحیح پیش ہوئی تھی، تاکہ اس عہد کی حدیث دانی کا صحیح اندازہ ہو سکے، مورخ فرشتہ شیخ کے حال میں لکھتا ہے؛

"قاضی رکن الدین ..... بشیخ کردہ گفت اے درویش! در بابِ سرود و سماع چہ حجت داری، شیخ بحدیث نبوی السماع مباح لاھلہ[1] متمسک گشت قاضی گفت ترا بہ حدیث چہ کار تو مرد مقلدی، روایتے از ابوحنیفہ بیار تا بعرض قبول افتد شیخ گفت سبحان اللہ من حدیث صحیح مصطفوی نقل می کنم، و تو ازین روایت ابوحنیفہ می خواہی، شاید کہ ترا رعونت حکومت بریں می دارد، زود ازیں عہدہ معزول می شوی ...... پادشاہ چوں حدیث پیغمبر شنید، متفکر شدہ ہیچ نہ گفت۔"

سلطان علاء الدین خلجی کے عہدِ حکومت میں مولانا شمس الدین ترک ایک محدث مصر سے ملتان اس غرض سے آئے تھے کہ ہندوستان میں علم حدیث کو رواج دیں، حدیث اور متعلقات حدیث کی چار سو کتابیں ساتھ لائے تھے، اور حدیث کی ایک شرح لکھ کر بادشاہ کے نام پیش کرنا چاہتے تھے، مگر جب ملتان تک پہونچے تو اُن کو معلوم ہوا کہ بادشاہ نماز کا پابند نہیں اور جمعہ میں نہیں آتا، اُن کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہیں سے واپس چلے گئے، اور بادشاہ کو ایک

---

[1] اس فقرہ کو حدیث کہنا شاید فرشتہ کی غلطی ہو۔ یہ فقرہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں بطور فتویٰ نقل کیا ہے۔

رسالہ لکھ کر بھیجا جس میں لکھا تھا،

"من از مصر خدمت بادشاہ شہر دہلی کردہ بودم وتمنا برائے خدا تعالیٰ و مصطفیٰ ع

راندہب علم حدیث در دہلی ثابت کنم و مسلمانان را از عمل کردن روایت دانشمندان

بے دیانت برہانم"[۵]

غرض عام طور سے دہلی کے مرکز سے سلطنت کا جتنا حصہ متعلق رہا، وہاں نویں صدی ہجری کے بیچ تک علم حدیث سے عموماً بے خبری رہی، اس کی وجہ درحقیقت خدانخواستہ مسلمانوں کی اس سے بے اعتنائی نہ تھی، بلکہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مصر و عرب اور حج کے سفر کے لئے ان دونوں خشکی کا راستہ مستعمل تھا، اور لوگ یہاں سے افغانستان ترکستان وایران وعراق ہوکر حدود عرب میں داخل ہوتے تھے، یہ راستہ اس قدر دور دراز اور پُرخطر تھا، کہ بمشکل ہی آمدورفت ممکن تھی، شاہانِ دہلی نے اس وقت تک سمندر کے سواحل تک دخل نہیں پایا تھا، اس لئے دہلی کا مرکز علم حدیث کے سرچشمہ سے بے تعلق تھا۔

بہمنیہ اور علم حدیث بہمنیوں نے سب سے پہلے دکن میں اپنی حکومت قائم کی، اور سواحل تک ان کا کہیں کہیں گذر ہوگیا، تو اس فیض کی کچھ چنگاریاں نظر آنے لگیں، بہمنیوں میں سلطان محمود بہمن علم کا بڑا قدرداں گذرا ہے، سلاطین ہند میں سب سے پہلے اُس نے علم حدیث کی اشاعت کی طرف توجہ کی ہشتشہ میں سنہ ۷۹۹ھ تک اس کا زمانہ ہے، فرشتہ سلطان کے حال میں لکھتا ہے:-

"وجہت محدثاں اخبار حضرت نبوی صلعم در شہر ہائے کلاں وظائف مقرر کردہ در تعلیم ایشاں می کوشید"

---

[۵] تاریخ فیروز شاہی برنی ص ۲۹۷۔

مگر درحقیقت عرب اور ہندوستان کو ایک کرنے کی سعادت سلاطینِ گجرات کی قسمت میں تھی، مسلمان اس پر پہلی صدی سے لے کر آٹھویں صدی کے وسط تک کئی ناکام حملے کر چکے تھے، آخر علاء الدین خلجی نے ان تمام ناکامیوں کو اپنی کامیابی سے بدل دیا، اور اسی کے ساتھ محمد شاہ تغلق کے عہد میں دوسرا ہی گورنر ظفر خاں جب وہاں پہونچا تو اُس نے مرکز کی کمزوری کو دیکھ کر گجرات کی خود مختاری کا منصوبہ کرلیا، اور آخر فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں ظفر خاں نے مظفر شاہ کا خطاب اختیار کرکے گجرات کی مستقل حکومت سنہ ۸۱۰ھ میں قائم کرلی، اور ۸۱۳ھ میں وفات پاکر اپنے سعادتمند بیٹے احمد شاہ اوّل کے لئے جگہ خالی کردی، یہی وہ خوش نصیب سلطان ہے، جس نے گجرات کو عرب اور ہندوستان کے بیچ میں سلسلۃ الذہب بنا دیا، اور اس طرح بحرِ عرب کے دونوں کنارے مل گئے، اور بحری راستہ کی آمد و رفت نے سالوں کا راستہ مہینوں میں طے کردیا، اور انتظام اور پابندی کے ساتھ جہازات آنے جانے لگے، حاجیوں کے قافلے سال بسال سلاطینِ بیجاپور و گجرات کی نگرانی میں سمندر کے راستہ سے جانے لگے اور اسی راستہ سے علم کے مشتاق عرب کے دیار کا بھی رُخ کرنے لگے، اور اس طرح علمِ حدیث کا تخم عرب سے ہندوستان کو منتقل ہونے لگا، اور ہندوستان کے مختلف شہروں کی زمین اور آب و ہوا کی موافقت سے اُس نے برگ و بار پیدا کرنا شروع کیا۔ بالآخر اکبر نے دو اسلامی حکومتوں کا فصل بھی بیچ سے نکال دیا، اور گجرات فتح کرکے دہلی کو سورت اور کھنبایت کے راستہ سے سیدھے مکۂ معظمہ اور مدینۂ منورہ سے ملا دیا،

الغرض سفر کی آسانی اور آمد و رفت کی کثرت نے علمائے ہند کو حجازی علوم سے آشنا ہونے کا موقع بہم پہونچایا، اس وقت دہلی اور سمندر کے بیچ میں گجرات، بیجاپور، اور مالوہ (منڈو) تین اسلامی ریاستیں حائل تھیں، اس کے بعد دلّی پڑتی تھی، چنانچہ بحرِ عرب کے اس کنارے کی

علمی موجیں بھی اسی ترتیب سے بحرِ ہند کے اس جانب کے سواحل تک بہ ترتیب آتی تھیں،

ایران میں صفویوں کے تعصب کا اثر | خوش قسمتی یا بدقسمتی سے ایک قومی و مذہبی سانحہ نے کم از کم ہندوستان کے لئے خیر و سعادت کا سامان پیدا کر دیا، اس زمانہ میں ایران میں صفویوں نے عروج حاصل کر کے شیعیت کو اپنا سرکاری مذہب قرار دیا، اور قزلباشوں کے تعصب نے ایران کے سبزہ زار کو علمائے سنت کے لئے گرم تنور بنا دیا، اس لئے اُن کے بڑے بڑے علماء نے ملک کو خیر باد کہہ کر عرب اور ہندوستان کی راہ لی،

سب سے پہلے بزرگ جو باہر سے اس تبرک کو سینہ سے لگا کر ہندوستان وارد ہوئے، وہ مولانا نور الدین احمد شیرازی تھے، یہ غالباً وہ زمانہ تھا جب گجرات میں اسلام کی نئی نئی سلطنت قائم ہوئی تھی، اور احمد شاہ اول (۸۱۳ھ تا ۸۴۶ھ) تخت نشین تھا، مولانا نور الدین میر سید شریف جرجانی کے شاگرد تھے، صحیح بخاری کی سند اُن کی اتنی عالی تھی کہ وہ حجاز و یمن پہنچی، تو بڑے بڑے محدثین نے اس کو شوق و ذوق اور فخر کے ساتھ حاصل کیا[۱]،

ہندوستان میں علم حدیث کا آغاز | علم حدیث کے ہندوستان میں فروغ کا حقیقی زمانہ نویں صدی ہجری کا خاتمہ اور دسویں صدی کا آغاز ہے۔ یہ وہ عہد تھا جب مصر و شام و حجاز امام الحدیث حافظ محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی (المتوفی سنہ ۹۰۲ھ) کے فضل و کمال کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اور حافظ موصوف کے فیض و افادہ کی کرنیں دنیائے اسلام کے ہر گوشہ میں پڑ رہی تھیں، مدینہ منورہ میں آکر اُن کے کمال نے نورٌ علیٰ نور کا مرتبہ حاصل کیا،

حافظ سخاوی کے تلامذہ | ہندوستان کے مختلف صوبوں میں سب سے پہلے گجرات نے اپنا طبعی حق پایا، یعنی بحرِ عرب کے اس پار کی شعاعیں سب سے پہلے یہیں آکر پڑیں اور یہاں سے وہ آگرہ کی مسجدوں اور

---

[۱] النور السافر بحوالہ یادِ ایام مولانا سید عبد الحی مرحوم،

مدرسوں کے مناروں پر جاکر عکس انداز ہوئیں،

حافظ سخاوی کے تلامذہ نے سب سے پہلے غالباً مولانا راجح بن داؤد گجراتی ہیں، ۹۰۴ھ میں وہ حافظ موصوف کے حلقہ میں داخل ہوئے، اور الفیہ حدیث کی سند حاصل کی، اس کے بعد وہ گجرات وارد ہوئے، لوگوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا، ۹۲۰ھ میں احمد آباد میں وفات پائی،[۱]
اس کے بعد مولانا وجیہ الدین محمد مالکی آئے، اُن کی بڑی قدر ہوئی، سلطان گجرات نے اون کو ملک المحدثین کا خطاب دیا، وہ یہیں کے ہو رہے، ۹۲۹ھ میں وفات پائی،[۲]

انہی کے ہم عصر مولانا علاء الدین احمد نہروالی (گجرات) ہیں، عرب جاکر حافظ ابن فہد اور نور الدین شیرازی سے حدیث کی سند حاصل کی آخر عمر مکہ معظمہ میں گذار دی، اور وہیں اپنا سلسلۂ درس جاری رکھا، ۹۴۹ھ میں وفات پائی،[۳] اُن ہی قریب العہد حافظ سخاوی کے دوسرے شاگرد جمال الدین محمد بن عمر حضرمی، مظفر شاہ حلیم سلطان گجرات کے زمانہ میں آئے، سلطان نے خود زانوے ادب اُن کے سامنے تہ کیا، اور اپنا استاد بنایا، احمد آباد گجرات میں ۹۳۱ھ میں وفات پائی،[۴]

دہلی کے مرکز میں پہلا محدث

لیکن وہ اصلی شخصیت جس کے پرتو سے اس سرزمین کے شمالی وجنوبی دونوں گوشوں کا منور ہونا مقدر تھا، وہ سید رفیع الدین صفوی شیرازی کی ذات والاصفات تھی، یہ معقولات میں محقق دوانی کے شاگرد تھے، عرب پہنچے، اور حدیث کا فیض حافظ سخاوی سے حاصل کیا، اور شرف سعادت کا یہ سرمایہ لے کر وہ گجرات وارد ہوئے، یہ زمانہ دلی میں سلطان سکندر لودی کا تھا، اس قدردان علم کے شہرہ نے سید موصوف کو بھی گجرات سے دلی کھینچا، سلطان نے حسن عقیدت کے ساتھ محدث موصوف کا خیر مقدم کیا، اور سلطان کی اجازت سے

---

۱ الضوء اللامع جلد ۳ ص ۲۲۲ ۲ یاد ایام ص ۳۴ ۳ ایضاً ص ۵۴،

۴ ایضاً ص ۳۴،

ممدوح نے آگرہ میں سکونت اختیار کی، اور درس و تدریس کا بازار گرم کیا، مشتاق دور دور سے آئے اور اپنی اپنی قسمت کے مطابق متاعِ خیر و برکت حاصل کرتے رہے[۱]۔

غالباً خالص ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روح پرور نغموں سے اُس کے محراب و در گونج اٹھے، سید موصوف نے ۹۵۴ھ میں وفات پائی، گو انھوں نے بقول مولانا عبدالحق محدث دہلوی (اخبار الاخیار) لائق اولاد نہیں پائی، تاہم بدایونی کی تصریح کے مطابق اپنی چند روحانی اولاد یادگار چھوڑی، جن میں قابلِ ذکر شیخ ابوالفتح تھانیسری ہیں، یہ غالباً سب سے پہلے ہندوستانی ہیں، جو محدث کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ ملا بدایونی لکھتے ہیں:-

"علم حدیث در ملازمت سید رفیع الدین محدث درست گردانیدہ"

(ج ۳ - ص ۱۲۹)

شیخ ابوالفتح نے پچاس برس تک آگرہ ہی میں اپنے استاد ہی کے محلہ میں بیٹھکر علوم عقلی و نقلی کا درس دیا، اور بے شمار اشخاص اُن کے دامنِ تربیت میں پلکر شہرۂ آفاق ہوئے، جن میں ایک خود ملا بدایونی، نیز مولانا کمال الدین حسین اور ملا عیسیٰ (شیخ کے فرزند) نامور ہوئے[۲]۔

ملا عیسیٰ اکبر کے زمانہ میں آگرہ کے مفتی ہوئے، اور ملا بدایونی اکبر کے امام مقرر ہوئے مولانا کمال الدین حسین دراصل شیرازی تھے، ان کے باپ مولانا حسن شیرازی صفویوں کی دار و گیر سے بھاگ کر شیراز سے مکہ معظمہ چلے گئے تھے، اور وہاں سے سید رفیع الدین محدث کے قافلہ کے ساتھ سکندر لودی کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ مولانا کمال الدین حسین نے

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۲۲۶ [۲] بدایونی سوم ص ۱۲۹۔

بادشاہی تعلق گوارا نہ کیا، اور زہد و عبادت کے سجادہ سے باہر قدم نہیں اٹھایا[51]، سید محمد جونپوری کے ایک اور شاگرد سید جلال تھے، اور سید جلال[52] کے شاگرد میر سید محمد امروہی تھے، جو اکبر کے عہد میں ہندوستان کے میرِ عدل تھے،

پہلا شارح بخاری | سید ابو الفتح کے ایک دوسرے معاصر جو ہندوستان زاد تھے، سید عبد الاول حسینی تھے، اُن کے باپ جونپور کے قصبہ زید پور کے رہنے والے تھے، یہاں سے دکن چلے گئے تھے، وہیں یہ پیدا ہوئے، وہاں سے گجرات پہونچے، اور گجرات سے عرب گئے، اور وہاں کے خزانہ سے علمِ حدیث کے زر و جواہر سینہ میں بھر کر لائے، یہ سب سے پہلے ہندوستانی عالم ہیں، جنہوں نے صحیح بخاری کی شرح لکھنے کی عزت حاصل کی، فیض الباری کے نام سے صحیح بخاری کی شرح لکھی، اور فیروزآبادی کی سفر السعادۃ کا خلاصہ کیا[53]،

بخاری کا حافظ | مولانا عبد الملک عباسی گجرات کے باشندے تھے، ایک واسطہ سے حافظ سخاوی کے شاگرد تھے، تقریباً ۹۷۰ھ میں وفات پائی، اُن کو صحیح بخاری پوری زبانی یاد تھی، اور اس کے معانی و مطالب کے پورے حافظ تھے، اور اسی طرح زبانی یہ صحیح بخاری کا درس دیا کرتے تھے[54]،

حافظ ابنِ حجر کے تلامذہ | اب وہ زمانہ آیا جب مادی و روحانی دونوں سلطنتوں میں انقلاب رونما ہو چکا تھا، ہندوستان کے افق پر اب مغل اعظم کے اقبال کا ستارہ چمک رہا تھا، اور عرب میں حافظ سخاوی کے بجائے جن کی وفات کو پچاس برس گذر چکے تھے، اور جن کے تلامذہ بھی دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، اب حافظ ابنِ حجر مکی (صواعق محرقہ کے مصنف) کا شہرہ تھا، جو زکریا انصاری، بلقینی، سمہودی، اور ابو الحسن بکری کے شاگرد تھے، ۹۷۳ھ میں وفات پائی،

---

[51] بدایونی سوم ص ۱۲۶، [52] تاریخ علمائے ہند ص ۸۰ نولکشور، [53] یادِ ایام مولانا سید عبد الحی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء و تاریخ علمائے ہند ص ۳۰۰، [54] ایضاً،

عہدِ اکبری | بادشاہ اکبر کے ابتدائی عہد میں جب بیرم خانخاں امورِ سلطنت کا متکفل تھا، اُس نے علوم و فنون کے دوسرے مشاہیر کے ساتھ حضرات محدثین کو بھی گجرات سے دلّی اور آگرہ آنے کی دعوت دی، ان میں سب سے پہلے گھر کی "دولت" یاد آئی، یعنی میر سید عبدالاوّل جونپوری کو باصرار تمام گجرات سے دلّی بلوایا، ۹۶۵ھ میں یہیں وفات پائی[1]

میر کے تلامذہ میں ایک شیخ طیب محدث سندھی تھے، جنھوں نے گجرات کے قیام کے زمانہ میں شیخ سے حدیث پڑھی تھی، اور تقریباً پچاس برس تک ایلچ پور اور برہان پور میں بیٹھکر اس فنِ شریف کی خدمت کی[2]

اسی عہد میں شیخ عبدالمعطی مکی، جو شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری کے شاگرد تھے، یہاں آئے، اور ۹۰۳ھ میں وفات پائی، شیخ الاسلام انصاری کے دوسرے شاگرد جو مصری تھے، شہاب الدین احمد عباسی وہ بھی گجرات آئے، اور ۹۹۲ھ میں وفات پائی، ابوالحسن بکری اور ابن حجر مکی کے تلامذہ شیخ محمد بن عبداللہ فاکہی المتوفی ۹۹۲ھ، سید عبداللہ عیدروس المتوفی ۹۹۰ھ، شیخ سعید شافعی حبشی المتوفی ۹۹۱ھ گجرات وارد ہوئے[3]

ابن حجر مکی کے ایک اور شاگرد شیخ یعقوب صرفی کشمیری ہیں، ۹۰۸ھ میں پیدا ہوئے، علومِ عقلی کا درس مولانا جامی کے شاگرد مولانا محمد شاہ آنی سے لیا، اور حدیث کی سند حافظ ابن حجر مکی سے حاصل کی، عین عالمِ شباب میں ۲۶ برس کی عمر میں ۱۰۰۳ھ میں وفات پائی تفسیر قرآن مجید (ناتمام) کے علاوہ شرح صحیح بخاری اور مغازی النبوۃ دو کتابیں لکھیں[4]، شیخ احمد مجدد الف ثانی نے حدیث کا فیض انہی سے پایا،

---

[1] اخبار الاخیار صفحہ ۲۳۰ و ۲۴۰۔ [2] یاد ایام ص ۱۲، [3] ۴۶ و ۴۷ [4] تحفۃ الفضلاء معروف بہ تاریخ علما ص ۲۵۵ ؛ بدایونی جلد سوم،

اس زمانہ میں کشمیر ایک اور محدث کے وجود سے مفتخر ہوا، ملا محمد شگرف محدث کشمیری حرمین جاکر ابن حجر مکی کے شاگرد ہوئے، اور واپس آکر اپنے وطن میں طلبہ کو درس دیا،[1]

کشمیر کے ایک اور نامور محدث کا نام حاجی (شاید حاجی محمد) ہے، اُن کے بزرگ ہمدان کے تھے، اور سید علی ہمدانی کے ساتھ کشمیر آئے تھے، حاجی کی ایک فارسی تصنیف شرح شمائل ترمذی ہے، اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چند بار مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوئے، اور ابن حجر مکی اور میر جمال الدین محدث صاحب روضۃ الاحباب کے شاگرد مولانا صادق محدث کے تلمذ سے فیض یاب ہوئے، ۱۰۰۶ھ میں وفات پائی، ان کی شرح شمائل کا نسخہ پٹنہ کے کتب خانہ میں ہے،[2]

محدث سرہندی کا — اس عہد کے ایک نامور مولانا عبد الرحمٰن محدث سرہندی کا نام ملتا ہے، جن کے لئے سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ وہ حضرت مجدد الف ثانی کے استاذ حدیث تھے، اس سے زیادہ کچھ اور حال معلوم نہ ہوا،[3]

ابو الحسن بکری کے تلامذہ — اسی عہد میں ایک ذات گرامی مکہ معظمہ میں درس وارشاد کی مسند پر جلوہ گر نظر آتی ہے، اور جس کے فیوض کی بارش ہندوستان میں مسلسل معلوم ہوتی ہے، اُن کا نام اُنکی کتابوں میں ابو الحسن بکری مرقوم ملتا ہے، یہ مصر کے رہنے والے شافعی المذہب اور ابو بکر صدیق رضی کی نسل میں تھے، مکہ معظمہ میں سکونت پذیر تھے،[4]

حضرت ابو الحسن بکری اور علامہ ابن حجر ہیثمی کی دونوں معاصر ہیں، اس لئے آیندہ سلسلۂ تلمذ ان بزرگوں کے دوہرے تعلقات سے مضبوط و مستحکم نظر آتا ہے،

---

[1] تاریخ علمائے ہند ص ۹۰، [2] فہرست حدیث فارسی کتب خانہ پٹنہ جلد نہم فارسی ص ۵۱، [3] تاریخ علمائے ہند ص ۱۰، [4] ابجد العلوم نواب صدیق حسن خاں،

ابھی تک ہندوستان میں علم نبوی کی روشنی چمک چمک کر بجھ بجھ جاتی تھی،

شیخ علی متقی | لیکن دسویں صدی کے بیچ میں یک بیک ہندوستان کی قسمت چمکتی ہے، اور اُس کے اقبال کا ستارہ پورب کے اس شہر میں طلوع ہوتا ہے جس کو شاہجہان کی قدردانی نے "شیراز ماست" کا خطاب دیا تھا، لیکن شاید اس لئے کہ اس کی نسبت کا فخر ملک کے صرف ایک ہی حصہ کو حاصل نہ ہو، بلکہ ہندوستان کے تینوں خطے پورب پچھم (پنجاب) اور دکن کو برابر حاصل رہے اس کو تینوں خطوں سے برابر کی نسبت عطا کی گئی، ہندوستان کی یہ قسمت بیدار اور ستارۂ درخشاں شیخ علی متقی کی ذات تھی، شیخ کا اصلی اور خاندانی وطن جونپور تھا، برہان پور دکن میں ۸۸۵ھ میں پیدا ہوئے، اور وہیں شیخ باجن برہان پوری سے بچپن میں بیعت کی، جوانی میں ملتان جاکر شیخ حسام الدین متقی سے علم ظاہر و باطن کی تکمیل کی، ایک عجیب اتفاق یہ ہے کہ شیخ کے جسمانی باپ (والد) کا نام بھی حسام الدین تھا، اور روحانی باپ (استاذ و مرشد) کا نام بھی حسام الدین ہی تھا، اور متقی کا مشہور لقب بھی شاید انہی استاد و مرشد کی نسبت سے حاصل ہوا، یہاں سے جاذبۂ توفیق نے مرکز کی طرف کھینچا، گجرات ہو کر ۹۵۳ھ میں دیارِ عرب کی طرف لنگر اٹھایا، اس وقت عمر شریف "۶۸" برس کی تھی، آج مسلمانوں کو اپنے اسلاف کے اس علمی ولولۂ شوق سے عبرت حاصل کرنی چاہیے، کہ اڑسٹھ برس کا بڈھا جوانوں کا شوق لے کر خشکی و تری کی مصیبتوں کو برداشت کر کے علم کی تکمیل کے لئے ملک عرب کا رُخ کرتا ہے،

شیخ علی متقی نے عرب پہونچ کر حجاز کے مشہور و معروف اساتذہ اور شیوخ سے چند سال علم ظاہر و باطن کی تحصیل کی، ان شیوخ میں شیخ ابن حجر مکی، (صواعق محرقہ کے مصنف) شیخ ابوالحسن بکری اور محمد بن محمد سخاوی ہیں) محمد بن عبدالرحمن مشہور سخاوی نہیں، جو اس سے پچاس برس پہلے ۹۰۲ھ میں مدینہ منورہ میں وفات پا چکے تھے) شیخ نے چند ہی سال میں اپنی فطری استعداد، روحانی ذوق

اور ربانی توفیق سے یہ مرتبہ حاصل کرلیا کہ استاد شاگرد اور شاگرد استاد کے مرتبہ میں آگئے، اور ۹۵۷ھ سے ۹۷۱ھ تک حدیث شریف کی وہ دائرۃ المعارف ترتیب دی، جو کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال کے نام سے مشہور ہے، اور ساتھ ہی ایک مختصر مجموعہ منتخب العمال کے نام سے بھی لکھا، یہ وہ کتابیں ہیں جنھوں نے امام رزین اور حافظ سیوطی کے مجموعوں پر خطِ نسخ پھیر دیا،

شیخ اس درمیان میں (۹۶۱ء تک) دو دفعہ ہندوستان (گجرات) آئے، اور سلطان محمود گجراتی نے یہ قدردانی کی کہ حقیقت میں اپنی سلطنت لاکر آپ کے قدموں میں ڈال دی،[1] اور آپ کے اور آپکے مدرسہ اور طلبہ کے لئے وظائف کی بہت بڑی رقم مقرر کردی، ۹۷۵ھ میں شیخ نے ۹۵ برس کے سن میں وفات پائی لیکن اس حالت میں بھی کہ بدن میں جنبش کی قوت تک نہ تھی، علمی شوق و ذوق کی جو کیفیت تھی، ان کے فرزند معنوی اور شاگرد کے شاگرد شیخ عبدالحق محدث کے الفاظ میں پڑھو،

"واشتغال وے بتتبع سنن و احادیث نبوی صلعم چناں تا آخر حیات بود کہ دراں وقت بمقتضائے عادتِ بشری جنبیدن ممکن نہ باشد، شب و روز بتالیف کتب احادیث و تصحیح و مقابلہ آں مشغول بودے"[2]

شیخ کے آغوشِ تربیت میں ہندوستان کے متعدد باکمال پل کر جوان ہوئے: شیخ عبدالوہاب متقی منڈوی برہان پوری، شیخ محمد طاہر پٹنی (احمد آباد گجرات)، شاہ محمد بن فضل اللہ برہان پوری شیخ عبداللہ و شیخ رحمت اللہ سندھی و شیخ برخوردار سندھی؛

عبدالوہاب متقی | شیخ عبدالوہاب متقی منڈو (مالوہ) کے رہنے والے تھے، برہان پور میں پیدا ہوئے

[1] اس کا تفصیلی حال ظفر الوالہ بمظفر والہ ص ۲۱۵ مطبوعہ لندن، اور مرآۃ احمدی ج دوم ص ۹ میں پڑھو:

[2] اخبار الاخیار ص ۲۴۲ طبع ہاشمی میرٹھ ۱۲۷۸ھ،

بیس[۲۰] برس تک گجرات و دکن کی سیر کی، اور یہاں کے علمار سے استفادہ کر کے عرب گئے سنہ ۹۶۳ھ
میں شیخ علی متقی کے حلقۂ صحبت میں داخل ہوئے، اور شیخ کی وفات (سنہ ۹۷۵ھ) تک بارہ[۱۲] برس
متصل جلوت و خلوت میں شیخ کے ہمراہ رہے، شیخ کی تصنیفات کا مسودہ لکھنا، اور اُن کو صاف
کرنا شاگرد کا کام تھا، آخر کامل صحبت نے اُن کو بھی کامل کر دیا، یہاں تک کہ اُن کی وفات
کے بعد حرمین محترمین اور مصر و شام و یمن کے علمار نے اُن کو شیخ کا جانشین تسلیم کیا، اور شیخ عبد الوہاب
شیخ عبد الوہاب متقی ہو کر مشہور ہوئے،

شیخ عبد الوہاب صرف ایک دفعہ سنہ ۹۷۲ھ میں ہندوستان آئے، اور پھر اسی سال واپس گئے
سنہ ۱۰۰۱ھ میں وفات پائی، تلامذہ اور مستفیدین کا انبوہ کثیر اپنے پیچھے چھوڑا، صحاح ستہ کا درس اُن کے
حلقہ میں ہوتا تھا، اور روز و شب حدیث کی تدریس یا نادر کتابوں کی تصحیح و نقل و مقابلہ کے سوا کوئی کام نہ تھا[۵۱]

محمد طاہر فتنی

ملا محمد بن طاہر پٹن کے رہنے والے تھے، جو احمد آباد (گجرات) کے پاس اب تک آباد ہے،
اسی پٹن کو معرب کر کے فتن کہتے ہیں جس کی نسبت سے وہ محمد بن طاہر فتنی کہلاتے ہیں، بوہرہ تھے، شیخ
علی متقی کے ارشد تلامذہ میں تھے، مکہ معظمہ جا کر فیض حاصل کیا، اور استاد کی زندگی ہی میں دو کتابیں تصنیف
کیں، مجمع البحار لغت حدیث میں، اور مغنی اسمار الرجال میں، اُن دونوں کتابوں میں اپنے استاد کا جس ولولۂ
شوق اور غلبۂ محبت کیساتھ ذکر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاگرد کے دل میں استاد کی کتنی قدر و منزلت
تھی، مجمع البحار گو بظاہر حدیث کا لغت ہے مگر علمائے محدثین کے اعتراف کے مطابق وہ درحقیقت صحاح
ستہ کی شرح ہے، علاوہ ازیں تذکرۃ الموضوعات و قانون الموضوعات وغیرہ کتابیں اُن کی
تالیف ہیں،

ہندوستان واپس آکر بوہرہ قوم کو اہل سنت بنانے کے لئے یہ کوشش بلیغ کی، کہ اسی راہ میں

---

[۵۱] تفصیلی حالات کے لئے دیکھو اخبار الاخیار ص ۲۴۳، و مابعد و مرآۃ احمدی ج ۲ ص ۵۷؛

سنہ ۹۸۶ھ میں اجین کے قریب قصبہ سارنگ پور میں شہادت پائی، (مرآۃ احمدی ج ۲ ص ۲۷)

متقی کے تلامذہ | شیخ عبداللہ بن سعدالدین اور شیخ رحمت اللہ بن عبداللہ یہ دونوں بزرگوار سندھ کے تھے، اُن کے والد مدینہ منورہ ہجرت کرکے گئے تھے، شیخ علی متقی کے شاگردانِ خاص میں اور خلفار میں تھے، سنہ ۹۷۰ھ کے پس وپیش میں ہندوستان وارد ہوئے، اور احمد آباد گجرات میں قیام پذیر ہوئے، اور مشتاقانِ حدیث کو اپنے درس وافادہ سے سیراب کیا، لیکن اخیر عمر میں دونوں بزرگ چند سال کے فصل سے اسی ضعف اور پیری کے عالم میں حجاز واپس گئے، اور وہیں وفات پائی،[۱] شیخ رحمت اللہ کے بھائی شیخ حمید سندھی تھے، جو تفسیر وحدیث میں یدطولیٰ رکھتے تھے، خان اعظم کوکہ کے ساتھ عرب گئے، اور وہاں مقتدائے اہل حدیث ہوئے،[۲]

شیخ برخوردار سندھی نے حجاز ہی میں اپنی مسندِ درس قائم کی، چنانچہ شیخ محمد بن طاہر پٹنی نے اُن سے بھی فائدہ اٹھایا تھا،[۳]

شاہ محمد بن فضل اللہ کا آبائی وطن جونپور تھا، احمد آباد گجرات میں پیدا ہوئے، جوان ہوکر مکہ معظمہ چلے گئے، اور تقریباً ۱۲ برس تک شیخ علی متقی کے حلقۂ درس میں داخل رہے، پھر ہندوستان واپس آکر برہان پور میں سکونت اختیار کی، اور درس وتدریس کی محفل گرم کی، مسئلہ وحدت الوجود میں التحفۃ المرسلۃ الی النبی ایسی اہم کتاب تصنیف کی، کہ عرب وشام کے بڑے بڑے علمار شیخ عبدالغنی نابلسی اور شیخ ابراہیم کردی نے اُس کی شرحیں لکھیں، اتباعِ سنت میں ایسے کامل تھے، کہ نائب رسول اللہ کے لقب سے مشہور ہوئے، برہان پور میں مدرسہ قائم کیا، جس میں ہمیشہ فقہ وتفسیر وحدیث کا درس دیا کرتے تھے،

سنہ ۱۰۰۵ھ میں وفات پائی،

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۲۶۴، [۲] ایضاً ص ۲۶۴، [۳] اتحاف النبلاء نواب صدیق حسن خان مرحوم ص ۳۹۵

اسی عہد کے چند اور بزرگوار ذکر کے لائق ہیں، ایک سید یٰسین گجراتی جنھوں نے ہندوستان کے بعد عرب جاکر اس فیض کو حاصل کیا، بدایونی دورِ اکبری کے علماء کے حالات میں لکھتے ہیں،

"بشرف زیارت حج اسلام مشرف گشتہ و علم حدیث آنجا حاصل کردہ اجازت یافت و باز گشتہ بہند آمد"[1]

سید ممدوح نے پنجاب کا خطہ پسند فرمایا، اور لاہور میں اپنے درس کی مسند بچھائی، اس کے بعد سر منڈا کر درویش مجرد ہو گئے،

شیخ بہلول دہلوی شیخ عبداللہ اور شیخ رحمت اللہ جو گجرات آ گئے تھے، شیخ بہلول دہلوی نے گجرات جاکر ان کا دامن تھاما، اور حدیث کا درس لیا، اور دلی واپس آکر اس فنِ شریف کی تعلیم و تدریس میں عمر بسر کردی، ملا بدایونی لکھتے ہیں:

"علم حدیث را خوب ورزیدہ......... با اہلِ دنیا کارے ندارد و بافادہ و افادۂ طلاب مشغول است"[2]

اس عہد کے دوسرے بزرگ حاجی ابراہیم محدث ہیں، عرب جاکر فیوض و برکات سے مالا مال واپس آئے اور آگرہ میں زہد و ورع کے ساتھ علم حدیث کا درس دیتے تھے:

بدایونی میں ہے:-

"در آگرہ بزہد و ورع درس علوم دینی خصوصاً علم حدیث قیام داشت"

اس فیض و برکت کا اثر یہ تھا، کہ وہ اکبر کے عہدِ حکومت میں دار السلطنت میں بیٹھ کر امر معروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتے تھے، کوئی شاہی منصب قبول نہیں کیا، دربار میں جب جاتے تھے، آدابِ شاہی کے مقررہ مراسم و سجدہ اور کورنش اور تکلفات سے آزاد رہتے تھے اور وعظ و پند

---

[1] بدایونی ج ۳ ص ۱۳۰، [2] ایضاً ص ۱۱۳

فرماتے تھے،[۵۱]

شیخ عبدالنبی گنگوہی شیخ عبدالنبی گنگوہی بھی اسی دور کے اہلِ کمال میں ہیں، یہ بزرگ دادا یعنی حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے پوتے تھے، اکبر کے زمانہ میں پورے ہندوستان کے صدر الصدور (شیخ الاسلام) تھے، پہلے تصوف زمانہ کا رنگ غالب تھا، سماع وغنا سے ذوق تھا، پھر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی حاضری کا کئی دفعہ اتفاق ہوا، اور وہاں علم حدیث کا درس حاصل کیا، لوٹ کر آئے، تو وہ کچھ اور ہی چیز ہو گئے، بدایونی میں ہے،

"چند مرتبہ در مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ رفتہ علم حدیث را خواندہ و بعد از ان کہ باز گشتہ آمد از روش آبا و اجداد کرام و سماع و غنا را منکر بود و بر روش محدثین سلوک می نمود و بتقوی طہارت و نزاہت و عبادت ظاہری اشتغال داشت"[۵۲]

اکبر ان کا اس درجہ ادب کرتا تھا کہ اپنے ہاتھ سے اُن کے سامنے اُن کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا، دربار کے جاہ پرست افسروں کے رشک حسد نے شیخ کی مخالفت شروع کی، اور نتیجہ یہ ہوا کہ دربارِ شاہی سے پوری جماعت کا اثر جاتا رہا۔ اور اُن کی جگہ مُلّا مبارک ناگوری اور فیضی اور ابوالفضل نے لے لی،

مُلّا قاری اور اُن کے اُستاد اکبری دور کے ایک اور فاضل محدث مولانا میر کلاں محدث اکبر آبادی ہیں اُن کا سلسلۂ سند عرب کے بجائے عجم سے ہے، یہ میر شاہ شیرازی کے شاگرد تھے، اور وہ اپنے باپ سید جمال الدین محدث مصنف روضۃ الاحباب کے شاگرد تھے، اور عرب جاکر اپنے فضل و کمال کی تکمیل کی تھی، اور جمال الدین کو اپنے چچا سید اصیل الدین شیرازی سے تلمذ تھا، یہ جہانگیر کے استاد مقرر ہوئے تھے، ۹۸۱ھ میں وفات پائی،[۵۳] بدایونی لکھتے ہیں:۔

---

۵۱ بدایونی ج ۳ ص ۱۳۹ ۵۲ ایضاً بدایونی ج ۳ ص ۸۰ ۵۳ علمائے ہند ص ۲۳۰ و آثار الکرام آزاد ص ۲۰۷

"در حدیث آیۂ روزگار بود"[1]

مولانا میر کلاں کے شاگرد وہ فاضلِ یگانہ تھے، جو ملا علی قاری کے نام سے مشہور ہیں، ملا علی قاری گو رہنے والے ہرات کے تھے، مگر اس زمانہ میں ہرات تیموری ہی سلطنت کا ایک جزو تھا، اور ان کا فضل و کمال بھی تمامتر اساتذۂ ہند کا ممنونِ احسان ہے، اور اُن کی تصنیفات نے بھی یہیں زیادہ تر شہرت حاصل کی، اس لئے یہ محدثینِ ہند کی فہرست سے خارج نہیں ہو سکتے۔

ملا علی قاری کے والد کا نام سلطان محمد تھا، ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی، مشکوٰۃ مولانا میر کلاں سے پڑھی، یہاں سے یہ مکہ معظمہ گئے، اور ابو الحسن بکری، سید زکریا حسینی، ابن حجر مکی ہیتمی، شیخ عبد اللہ سندھی، قطب الدین نہروالی، (نہروالہ گجرات) مکی سے علومِ حدیث کی تکمیل کی، سنہ ۱۰۱۴ھ میں مکہ معظمہ میں وفات پائی، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ، شرح شفائے قاضی عیاض، شرح شمائل ترمذی، شرح نخبۃ الفکر (اصولِ حدیث) شرح ثلاثیات بخاری، تخریج احادیث شرح عقائد نسفی، نور القاری شرح صحیح بخاری، شرح صحیح مسلم، شرح حصن حصین، شرح اربعین نووی، شرح موطا امام محمد، سند الانام شرح مسند الامام (ابی حنیفہ) المصنوع فی معرفۃ الموضوع، تذکرۃ الموضوعات وغیرہ بے شمار کتابیں اور رسالے یادگار چھوڑے،

درس بخاری لاہور میں تاریخ میں پہلی دفعہ صحیح بخاری کے داخلِ درس ہونے کا ذکر اسی عہد میں ملتا ہے، مولانا محمد لاہور کے مفتی تھے، اور وہ حدیث شریف کا لاہور میں درس دیتے تھے، اور تقریباً نوے برس کے سن تک اس بابرکت شغل میں وہ مصروف رہے، جب صحیح بخاری اور مشکوٰۃ کا دورہ تمام ہوتا، تو اس خوشی میں وہ بہت دھوم دھام سے لوگوں کی دعوت کرتے تھے،

---

[1] بدایونی ج ۳ ص ۱۵۱،

شیخ عبدالحق محدث دہلوی | اکبر کے آخری عہد میں وہ بزرگ ہستی نمایاں ہوئی جس نے عہدِ جہانگیری میں اپنی جہانگیری کا سکہ بٹھا دیا، اور جس نے دہلی کے شاہی دارالسلطنت کو ہمیشہ کے لئے علوم دین کا دارالسلطنت بنا دیا، اور جس کی نسبت اہلِ علم کا اعتراف ہے،

"اوّل کسے کہ تخم حدیث در ہند کشت او بود"

گو نئی تاریخ کی روشنی میں بزرگوں کا یہ پرانا مقولہ صحیح نہیں، تاہم معنوی حیثیت سے اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں، مولانا عبدالحق محدث دہلوی کی ذات وہ ذات ہے جس نے ہندوستان میں رہ کر حدیث کے سربمہر خزانہ کو وقف عام کیا، اور دلپسند محققانہ تصنیفات کے ذریعہ سے علمائے ظاہر و باطن دونوں کی محفلوں سے تحسین و آفرین کی داد وصول کی،

شیخ عبدالحق دہلوی نسلاً ترک تھے ۹۵۸ھ میں دہلی میں پیدائش ہوئی، اپنے والد ماجد سے علوم کی تحصیل کی، پھر مکہ معظمہ جا کر شیخ عبدالوہاب متقی کے حلقۂ درس میں بیٹھے، اور ان سے صحاحِ ستہ کا درس حاصل کیا، اور ان کے مرید بھی ہوئے، شیخ کو اپنے استاد اور پیر سے جو عقیدت تھی اس کا اندازہ اخبار الاخیار کے صفحات سے ہو سکتا ہے، شیخ نے ہندوستان آکر دلی میں اقامت اختیار کی اور تقریباً سو سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے مشکوٰۃ کی مشہور عربی شرح لمعات اور فارسی شرح اشعۃ اللمعات ہے، نیز سیرۃ نبوی میں مدارج النبوۃ تصنیف کی، اور فیروزآبادی کی فارسی سفر السعادۃ کی فارسی شرح ایسی لکھی، جو حافظ ابن القیم کی زاد المعاد کے لگ بھگ ہے، ۱۰۵۲ھ میں وفات پائی،

جوہرناتھ کشمیری | شیخ کے معاصر کشمیر کے ایک نومسلم ہندو محدث جوہرناتھ کاشمیری ہیں، سلطان قطب الدین کے مدرسہ میں علوم عقلیہ کی تکمیل کے بعد عرب کی طرف رُخ کیا، اور وہاں پہونچ کر ابن حجر مکی، اور ملا علی قاری ہروی سے حدیث کی سند حاصل کی، وہ شالہ بنتے تھے، اور علوم دینیہ کا درس دیتے تھے

کئی نامور شاگرد پیدا ہوئے۔ ۱۰۲۶ھ میں وفات پائی۔[۱]

شیخ محمد قاسم | شیخ محمد قاسم سندھی، سندھ کے رہنے والے تھے، عرب جاکر اس فن میں ایسا کمال پیدا کیا کہ رئیس المحدثین کہلائے۔ وہیں انتقال کیا۔ ان کی اولاد برہان پور میں آباد ہوئی، اُن کے بیٹے شاہ محمد عیسیٰ جند اللہ اور اُن کے بیٹے بابا فتح محمد برہان پوری تین نسل تک علوم دینیہ اور علم حدیث کے وارث رہے۔[۲]

شیخ عبد الحق دہلوی کا سلسلہ | عالمگیر کے زمانہ میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے لائق فرزندوں اور شاگردوں کا ایک بابرکت سلسلہ پیدا ہوا جس نے اس فیض کو جاری کیا۔ شیخ کے فرزند مولانا نور الحق محدث دہلوی نے باپ کی علمی وراثت حاصل کی، باپ ہی سے حدیث کا درس حاصل کیا، اور تمام عمر اس فیض کو عام کرنے میں صرف کی، حضرت خواجہ محمد معصوم سے بیعت کی، صحیح بخاری کی فارسی میں تیسیر القاری کے نام سے کئی جلدوں میں شرح لکھی، جو ۱۳۰۲ھ میں مطبع علوی لکھنؤ میں ایک والیٔ ٹونک کے شوق سے چھپ چکی ہے۔ انھوں نے امام مالک کی موطا کی بھی شرح لکھی ہے، جو پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں میری نظر سے گذر چکی ہے، صحیح مسلم کی بھی شرح بنام منبع العلم لکھنی شروع کی تھی، مگر ناتمام رہی، شاہجہاں کے زمانہ میں آگرہ کے قاضی تھے ۱۰۷۳ھ میں وفات پائی،

شیخ نور الحق دہلوی کے ایک صاحبزادے حافظ فخر الدین ہیں، یہ بھی اپنے باپ کی متروکہ علمی دولت کے وارث ہوئے، انھوں نے فارسی میں اپنے والد کی ناتمام شرح صحیح مسلم موسوم بہ منبع العلم کی تکمیل کی، یہ شرح کتب خانہ پٹنہ میں موجود ہے، نیز حصن حصین کی بھی شرح لکھی،[۳]

---

[۱] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴ و اسرار الابرار، [۲] ایضاً ص ۱۶۰ و اسرار الابرار ملا داؤد مشکوٰتی قلمی،
[۳] حدائق الحنفیہ،

حافظ فخر الدین کے فرزند شیخ الاسلام ہیں، جو محمد شاہ کے زمانہ میں تھے، صحیح بخاری کی فارسی شرح لکھی، اور دو رسالے طرد الاوہام عن اثر الامام الہمام اور کشف الغطا عما لزم للموتی عن الاحیاء لکھے، حدیث اپنے باپ سے پڑھی، یہ شرح بخاری تیسیر القاری کے حاشیہ پر شرح شیخ الاسلام کے نام سے چھپی ہے،

شیخ الاسلام کے صاحبزادے سلام اللہ ہیں، انھوں نے بھی اپنے باپ ہی کی وراثت علمی پائی، یہ دہلی چھوڑ کر رام پور چلے آئے تھے اور محدث رام پوری کے نام سے مشہور ہیں، انھوں نے موطا کی شرح محلّی سنہ ۱۲۱۵ھ میں لکھی، نیز صحیح بخاری اور شمائل ترمذی کا فارسی میں ترجمہ کیا، اور اصولِ حدیث پر عربی میں ایک رسالہ لکھا، سنہ ۱۲۲۹ھ میں وفات پائی[۵۱]، شیخ عبد الحق محدث دہلوی کا یہ سلسلۂ فیض وہ ہے جو سلسلۂ نسب کے ساتھ ساتھ چلا ہے، لیکن ایک دوسرا سلسلہ یہ ہے جو صرف روحانی فیض تک محدود ہے،

شیخ دہلوی کے ایک نامور شاگرد اسی سلسلۂ نقشبندیہ کے ایک اور بزرگ زادہ خواجہ خاوند معین الدین ہیں جو خواجہ خاوند محمود المعروف بحضرت ایشاں المتوفی سنہ ۱۰۵۲ھ کے فرزند تھے، جنھوں نے علوم حدیث وتفسیر وفقہ واصول میں شیخ سے کسب کمال کیا، اور اپنے والد بزرگوار سے خرقۂ خلافت پایا، کتاب رنجوانی ان کی تصنیف ہے[۵۲]،

شیخ دہلوی کے ایک اور نامور شاگرد ملا حیدر کشمیری ہیں، پہلے اپنے وطن کے علماء ملا جوہر ناتھ اور بابا قطب الدین سے علوم کی تحصیل کی، پھر دلّی آکر شیخ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے اور حدیث وتفسیر وفقہ کی تکمیل کی، اور واپس جاکر درس وتدریس اور ہدایت وارشاد میں مصروف ہوئے، والی کشمیر نے ہرچند چاہا کہ وہ قضاء کا عہدہ قبول کریں مگر وہ راضی نہ ہوئے، سنہ ۱۰۵۶ھ میں وفات پائی[۵۳]،

---

[۵۱] خزینۃ الاصفیاء مفتی سرور لاہوری ص ۲۰۸ [۵۲] خزینۃ الاصفیاء ص ۳۳۴ [۵۳] تاریخ علمائے ہند ص ۵۴، واسرار الابرار ۱۰ الو د تمرکاتی

مُلا حیدر کے شاگرد بابا داؤد مشکاتی کشمیری ہیں[1]، علوم عقلیہ کے ساتھ فقہ و حدیث و تفسیر کی تعلیم اُن سے حاصل کی، حدیث دانی میں یہ کمال پیدا کیا، کہ مشکوٰۃ بزبان یاد تھی، اور اسی نسبت سے مشکاتی کے لقب سے مشہور ہوئے، اسرار الابرار کشمیر کے مشائخ اور علماء کے حالات اور ملفوظات میں اُن کی ایک تصنیف ہے، اُس کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین کے کتب خانہ میں ہے، اس میں کہیں کہیں صحیح بخاری اور احادیث کے حوالے نظر آتے ہیں ۱۰۹۷ھ میں وفات پائی،[2]

شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے فرزند مُلا نور الحق دہلوی کے حلقۂ درس کے ایک نامور فاضل میر سید مُبارک محدّث بلگرامی ہیں، میر موصوف نے شیخ کے گھر میں رہ کر اور اُن کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر علم حدیث میں وہ کمال پیدا کیا کہ آزاد بلگرامی نے اُن کو قطب المحدثین قرار دیا آثر الکرام میں ہے

"وازاول تا آخر ایام اقامت دہلی درخانہ شیخ نور الحق بن شیخ عبد الحق قدس اللہ اسرارہما، سکونت ورزیدہ و علم حدیث ازاں جناب اخذ کردہ و دریں فن اشرف مہارتے تمامے بہم رساند و تمام عمر در خدمت کلام نبوی فنا ساخت و بہ لقب محدث لبند آوازہ گشت و لہذا اورا دریں کتاب بہ قطب المحدثین یاد کردہ،"

۱۰۶۴ھ میں سند فراغ حاصل کی، اور بقیہ عمر عام علوم اور خصوصاً علم حدیث کی درس و تدریس میں بسر کی، امر معروف اور نہی عن المنکر میں ایسے سخت تھے، کہ بڑے بڑے امراء ان کی ڈانٹ سے دب جاتے تھے، ۱۱۱۵ھ میں وفات پائی،[3]

میر سید مبارک کے تلامذہ میں میر عبد الجلیل بلگرامی سب سے نامور ہوئے، علم حدیث کا نور اس خانوادہ میں میر سید مُبارک ہی کے مُبارک قدم سے جلوہ افروز ہوا، آزاد لکھتے ہیں :۔

"علم حدیث از قطب المحدثین میر سید مُبارک بلگرامی سند نمود،"

---

[1] تاریخ علمائے ہند صفحہ ۵۔ [2] اسرار الابرار ملا داؤد مشکاتی [3] تاریخ علمائے ہند صفحہ ۵۳ مآثر الکرام جلد اول صفحہ ۹۴

میر عبدالجلیل کے فضل و کمال کا ستارہ عالمگیر کے عہد میں طلوع ہوا، اور محمد شاہ کے زمانہ تک درخشان رہا، آخر میں بھکر واقع سندھ میں وقائع نویس تھے، وہاں صحیح بخاری کا ایک نسخہ ہاتھ آیا، عہدہ سے برطرفی کے بعد بھی محض اس کی نقل کی خاطر چھ مہینے اور وہاں گذارے ۱۰۷۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۳۸ھ میں وفات پائی،

علامہ میر عبدالجلیل کے آغوشِ تربیت میں علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے پرورش پائی، حدیث و سیر اپنے نانا میر عبدالجلیل سے حاصل کی، لکھتے ہیں:-

"لغت و حدیث و سیر نبوی و فنون ادب از خدمتِ قدسی منزلت جدی و استاذی حضرت علامی میر سید عبدالجلیل بلگرامی اخذ نمود"

۱۱۵۱ھ میں عرب جاکر اس تخم بارآور کی مزید سیرابی کی، اور مولانا حیات سندھی سے صحیح بخاری پڑھی، اور صحاح ستہ کی اجازت حاصل کی[51] صحیح بخاری کی ایک نا تمام شرح ضوء الدراری کے نام سے لکھی[52]

ضوء الدراری مصنف کے قلم کا اصلی نسخہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے دیکھا تھا، اس کے مقدمہ کی چند سطریں نواب صاحب نے اپنی تالیف الحطہ فی اخبار الصحاح الستہ میں نقل کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے ۱۱۵۱ھ میں جب مدینہ منورہ کا سفر کیا، اور صحیح بخاری کا درس لیا، اور ساتھ ہی علامہ قسطلانی کی شرح ارشاد الساری نظر سے گذری تو روزانہ سبق کے برابر برابر وہ قسطلانی کی تلخیص کرتے چلے گئے، لیکن اس طرح وہ کتاب الزکوٰۃ سے آگے نہ بڑھ سکے،[53]

---

۵۱ مآثر الکرام جلد اول ص ۱۶۲،

۵۲ ابجد العلوم نواب صدیق حسن خان ص ۹۲۱،

۵۳ الحطہ فی اخبار الصحاح الستہ نواب صدیق حسن خان، ص ۹۷-

استدراک و اضافہ

شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی

مضمون کے پہلے حصہ میں ایک نہایت اہم شخصیت نظر انداز ہوگئی اور وہ شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی ہیں، جن سے ہندوستان میں سلسلۂ سہروردیہ کا آغاز ہوا ہے۔

عام تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ شیخ بہاء الدین کے دادا کمال الدین علی شاہ قریشی مکہ معظمہ سے خوارزم گئے تھے، اور وہاں سے ملتان آکر آباد ہوئے، شیخ معین الدین بیجاپوری نے اپنے تذکرۃ الاولیاء میں لکھا ہے کہ شیخ بہاء الدین ھبار (صحیح ہبار) بن اسود بن مطلب بن اسد قرشی کی اولاد سے تھے، قلعہ کوٹ کرور (متصل ملتان) میں ۵۷۸ھ میں پیدا ہوئے، بارہ برس کے ہوئے، تو علم کی تحصیل کے لئے خراسان و بخارا کا سفر کیا، پندرہ برس کے سن میں علوم ظاہری کی تکمیل کی، اور درس و افادہ کی مجلس گرم کی، پھر جاذبہ شوق نے حرمین کی طرف کھینچا، اور عراق ہو کر مکہ معظمہ گئے، حج ادا کیا، پھر مدینہ منورہ جا کر شیخ کمال الدین محمد محدث یمنی سے حدیث کا درس لیا، اور مدت مدید تک (فرشتہ نے ۵۲ برس تک لکھا ہے[1]) مدینہ منورہ میں حدیث کا درس و شغل رکھا، الفاظ یہ ہیں:-

"نزد شیخ کمال الدین کہ از محدثین کبار بودہ پنجاہ و سہ سال در مدینہ منورہ بگفتن درس حدیث اشتغال داشت، کتب حدیث خواندہ و اجازت حاصل نمودہ"

یہاں سے بیت المقدس ہو کر وہ بغداد پہونچے، اس وقت بغداد میں مدرسہ نظامیہ زندہ تھا، اور شیخ شہاب الدین سہروردی جو اسی مدرسہ کے فاضل تھے، اور ان کے عم محترم شیخ ابو النجیب عبد القاہر سہروردی دو برس تک ۵۴۵ھ سے ۵۴۷ھ تک اس کے مدرس اعلیٰ رہ چکے تھے، اور شیخ شہاب الدین نے اپنے چچا سے کسب کمال کیا تھا، شیخ بہاء الدین زکریا جب بغداد پہونچے ہیں

[1] فرشتہ جلد دوم ص ۴۰۴، نولکشور،

تو شیخ ابو النجیب سہروردی کا ۵۶۳ھ میں انتقال ہو چکا تھا، اور ان کی جگہ پر شیخ شہاب الدین سہروردی کا مسند آرا تھے، شیخ بہاؤالدین نے شیخ شہاب الدین سہروردی سے بیعت کی اور ان کے فیض صحبت سے مستفید ہوئے اور ظاہر و باطن سے آراستہ ہو کر ہندوستان واپس آئے، اور ملتان میں سکونت اختیار کی، یہ وہ وقت تھا جب سلطان قطب الدین ایبک کی حکومت تھی، سلطان قطب الدین نے ملتان اور اوچہ ناصر الدین قباچہ کو، اور دہلی کا تخت شمس الدین التمش کو سپرد کیا تھا، قطب الدین کی وفات کے بعد ناصر الدین قباچہ نے شریعت کی ترویج اور احکام دین کے اجرار میں نہایت سستی اور بے پروائی برتی تو شیخ الاسلام نے بے محابا سلطان التمش کو اس کی اطلاع دی، اور جب ناصر الدین قباچہ نے باز پرس کی، تو فرمایا، میں نے جو کچھ کیا، خدا کے حکم سے کیا، تم سے جو کچھ ہو سکے، وہ کر گذرو، یہ کلمہ حق سُن کر ناصر الدین کانپ اٹھا،[۱]

شیخ نے ۶۶۶ھ میں وفات پائی۔

پچھلے صفحات میں حسب ذیل تین بزرگوں کے تذکرے صرف دو سطروں میں تھے، یہاں تفصیل سے لکھے جاتے ہیں،

مولانا برہان الدین محمود — امام صغانی کے شاگرد مولانا برہان الدین محمود دہلوی تھے، وہ امام مرغینانی صاحب ہدایہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے، سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے، اور مشارق الانوار کا درس دینا شروع کیا، ۶۸۶ھ میں وفات پائی، اور دہلی حوض شمسی کے پورب میں دفن ہوئے، اُن کے خاص شاگرد مولینا کمال الدین زاہد دہلوی تھے،

مولانا کمال الدین زاہد دہلوی — انھوں نے مشارق الانوار کی سند مولانا برہان الدین محمود سے حاصل کی، اور علم حدیث میں یگانۂ روزگار تھے، اور دہلی میں اس کا درس دیتے تھے، بڑے متقی اور پرہیزگار

---

[۱] اخبار الاخیار ص ۲۵۔

تھے، سلطان غیاث الدین بلبن نے چاہا کہ ان کو اپنا امام مقرر کرے، مگر انھوں نے قبول نہیں کیا، حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء نے حدیث ان ہی سے پڑھی تھی[۱]،

حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء

حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء اس عہد کے مشہور فاضل وادیب ومحدث تھے، ادب میں مقاماتِ حریری زبانی یاد کی تھی، اور اس کے کفارہ کے طور پر دہلی آکر مولانا کمال الدین زاہد دہلوی سے مشارق الانوار کا درس حاصل کیا، اور اس کو زبانی یاد کیا، حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء کے حالات میں سب سے قدیم تذکرہ سیر الاولیاء ہی، جو حضرت میر خورد دہلوی کی تصنیف ہے، اور مصنف صرف ایک دو واسطہ سے حضرت کے حالات بیان کرتا ہے، اور اُن کی بہت سی تحریری یادداشتیں اس کی نظر سے گذری ہیں، میر خورد دہلوی نے اس اصل سند کی پوری عبارت سیر الاولیاء میں نقل کی ہے، جو مولانا کمال الدین نے حضرت نظام الدین کو لکھ کر دی تھی

حضرت سلطان الاولیاء نہایت متبع سنت تھے، اُن کے یہاں سماع کی مجلس میں جیسا کہ سیر الاولیاء اور فوائد الفواد میں ہے مزامیر اور تالیاں نہیں بجائی جاتی تھیں، صرف غزلیں گائی جاتی تھیں، فقہائے احناف کے نزدیک محض گانا بھی مکروہ تھا، اور فقہائے شوافع اس کو جائز کہتے تھے، حضرت سلطان الاولیاء بھی اس مسئلہ میں شافعی مسلک کو درست سمجھتے تھے، اس بنا پر اُن کے عہد کے جاہ طلب علماء نے اُن کے خلاف شورش برپا کی، اور آخر دربارِ شاہی کے اہتمام سے مجلسِ مناظرہ کی نوبت آئی حضرت سلطان الاولیاء نے نفس غناء کے جواز کی جب حدیثیں پیش کیں تو علمائے احناف نے کہا کہ تم مقلد ہو تم کو حدیث سے کیا مطلب؟ اگر فقہ حنفی کی کوئی روایت ہو تو پیش کرو، حضرت سلطان الاولیاء افسوس کے ساتھ فرماتے تھے، کہ وہ ملک کیونکر آباد رہیگا،

---

[۱] اخبار الاخیار ص۹۶،

جس میں لوگوں کی رایوں کو احادیثِ نبوی ؐ پر ترجیح دیجاتی ہو،

میر خورد دہلوی نے سیر الاولیاء میں اس مناظرہ کی پوری تفصیل نقل کی ہے، مگر کہیں اس فقرہ کا حوالہ نہیں ہے جس کو فرشتہ نے حضرت کی زبانِ مبارک سے حدیث کہہ کر لکھا ہے، اور اس سے زیادہ شک یقین سے بدل جاتا ہے، جو فرشتہ کی اس روایت پر میں نے اوپر کسی صفحہ کے حاشیہ میں کیا تھا،

حضرت سلطان الاولیاء کے ملفوظات مثلاً فوائد الفواد مصنفہ حسن دہلوی اور افضل الفوائد مصنفہ امیر خسرو دہلوی میں بکثرت حدیثیں آپ کی زبان سے مذکور ہیں، اور اُن کے رموز و نکات آپ نے بیان فرمائے ہیں، آپکے خلفاء میں بھی اس فن کے کاملین گذرے ہیں،

نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رح
فقہ و اصول مولانا عبد الکریم شروانی اور افتخار الدین گیلانی سے پڑھا، علمِ حدیث کی نسبت نہیں معلوم کہ کس سے پڑھا، مگر اُن کے ملفوظات میں حدیثیں بکثرت ملتی ہیں، حضرت سلطان الاولیاء کے خلیفہ تھے، وہ غنا بھی نہیں سنتے تھے، ایک دفعہ اُن کے خیدہ فقار غنا سُن رہے تھے، حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلوی ؒ مجلس سے اُٹھ گئے، لوگوں نے بیٹھنے پر اصرار کیا، فرمایا "یہ خلافِ سُنّت ہے"، لوگوں نے کہا کہ اپنے پیر کے مسلک سے تم ہٹ گئے، فرمایا پیر کا عمل حجت نہیں ہو سکتا، کتاب و سُنّت سے کوئی دلیل لاؤ، بعض اصحاب غرض نے یہ فقرہ حضرت سلطان الاولیاء تک پہونچایا، فرمایا :-

"راست می گوید"[1]

مولانا شمس الدین یحیٰی اودھی
حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی ؒ کی طرح یہ بھی اودھ کے تھے، اور حضرت سلطان الاولیاء کے مرید تھے، فرید الدین شافعی شیخ الاسلام اودھ کے شاگرد تھے،

---

[1] اخبار الاخیار ص۸۲

حدیث میں مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی، اور دہلی میں درس دیتے تھے، سلطان محمد تغلق نے اُن کو کشمیر میں اشاعتِ اسلام کے لئے نامزد کیا تھا، مگر سلطان کی وفات سے تجویز ناقص رہ گئی، [۱] ۷۴۵ھ میں وفات پائی۔

مولانا فخرالدین زرادی یہ بھی دہلی کے علمائے مشاہیر اور حضرت سلطان الاولیاء کے جاں نثار مریدوں میں ہیں۔ دہلی کے بڑے محدثین میں تھے، جب ہدایہ پڑھاتے تھے، تو اس کی حدیثوں کے مقابلہ میں صحیحین کی حدیثیں پیش کرتے تھے۔ اور اُن کو ترجیح دیتے تھے، مرید ہونے کے بعد درس و تدریس چھوڑ دیا تھا، سلطان محمد تغلق نے جب دکن فتح کیا تو وہاں گئے۔ اور وہاں سے حج کے لئے عرب گئے، عرب سے بغداد گئے، اور وہاں سے علم حدیث کی تکمیل کی واپسی میں جہاز تباہ ہو گیا، اور وہ درخوش آب پانی کی تہ میں چلا گیا۔[۲]

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری بہاری شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری بہاری کی تعلیم کا زمانہ دہلی میں گذرا، دہلی وہ اس وقت پہونچے، جب حضرت سلطان الاولیاء رحلت فرما چکے تھے، یہ نہیں معلوم کہ انھوں نے حدیث کی کون سی کتاب پڑھی، اور کس سے پڑھی، مگر اتنا یقینی ہے کہ وہ احادیثِ نبوی کے کسی مجموعہ سے مشرف تھے، اور زیادہ قرینہ یہی ہے کہ مجموعہ مشارق الانوار ہو، اُن کے مکتوبات و تالیفات میں احادیثِ نبوی کے بکثرت حوالے اور روایتیں ہیں، کبھی اصل عبارت لکھتے ہیں، اور زیادہ تر فارسی ترجمہ فوائد المریدین جو شیخ کا ایک مختصر رسالہ ہے، وہ تمام تر احادیثِ نبوی کے حوالوں سے بریز ہے، اس کے شروع میں ایک جگہ امام ابو یعلیٰ کا حوالہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسند ابو یعلیٰ کی حدیثیں بھی ان کی نظر سے گذری تھیں، مکتوبات میں ایک جگہ ایک حدیث کی نسبت لکھتے ہیں کہ حدیث برادرم فخرالدین نوشتہ بود،[۳] اس فخرالدین سے میرے گمان میں مولانا فخرالدین زرادی

---

[۱] اخبار الاخیار ... [۲] ایضاً ... [۳] مکتوب ہفتدہم بنام امام مظفر۔

مراد ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ شیخ کو حدیث کا فیض اسی نظامی جماعت سے پہنچا ہے؛

مجھ سے میرے ایک معتبر بزرگ نے بیان فرمایا ہے کہ حضرت حسین نوشہ توحید بہاری جو حضرت شیخ شرف الدین کے معتقد اور شیخ کے مرید جانشین امام مظفر بلخی بہاری کے مرید تھے، اور سفر حجاز میں ان کے رفیق تھے، معدن المعانی میں لکھا ہے کہ امام نووی المتوفی ۶۷۶ھ کی شرح صحیح مسلم شیخ کے مطالعہ میں تھی،

مکتوبات دوصدی کے جامع نے جس نے ۷۶۹ھ میں اس کو جمع کیا، دیباچہ میں آپ کی نسبت لکھا ہے :-

"محی سنن نبوی مظہر آثار مصطفوی قامع دین اہل البدع، بانی دین اہل الورع"[۱]

شیخ نے ۷۸۲ھ میں وفات پائی،

شیخ بھکاری کاکوروی | کاکوری لکھنؤ کے ضلع میں ایک مشہور قصبہ ہے۔ یہ بزرگ یہیں کے رہنے والے تھے ۹۰۰ھ میں ولادت ہوئی، مولانا ضیاء الدین مدنی محدث اور قاضی عبد اللطیف ہراتی کے شاگرد تھے، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے پوتے شیخ عبد الرزاق کے مرید تھے ۹۱ سال کی عمر میں ۹۸۱ھ میں وفات پائی، کاکوری کے تمام مخدوم زادے انہی کی اولاد میں ہیں۔ حضرت شیخ اپنے وقت کے بڑے محدث تھے، ان کی حدیث کی سندیں اب تک موجود ہیں، اصول حدیث میں منبع نام ایک کتاب بھی اُن کی تصنیف ہے[۲]

کشمیر میں سلسلۂ حق | مضمون کے شروع کے صفحات میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے سلسلۂ تلمذ کا ذکر تھا، کشمیر میں ملا حیدر شیخ کے شاگرد تھے جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ ملا حیدر نے اس سلسلہ کو اور پھیلایا، جن میں سے بابا داؤد مشکاتی کا حال تم پڑھ چکے، ملا کے صاحبزادوں کا ذکر نہیں آیا؛

---

[۱] مکتوبات دوصدی ص ۳۲۲، [۲] تذکرہ علمائے ہند ص ۳۳،

ان میں سے ایک خواجہ محمد فاضل تھے، جو بابا داؤد مشکاتی کے ہم سبق تھے۔[۵] ملا عنایت اللہ سال محدث کشمیری ملا حیدر کے صاحبزادوں کے شاگرد ہوئے۔ اور اس درجہ اس فن میں انہماک اور ذوق و شوق پیدا کیا کہ تمام عمر اسی کی خدمت میں صرف کردی، بخاری شریف کا شروع سے آخر تک ۳۶ دفعہ درس دیا تھا، ۸۰ برس کے سن میں ۱۱۲۵ھ میں وفات پائی۔[۵]

صوبہ بہار میں علم حدیث اور سلسلۂ حق

اورپہ دور اکبری کے محدثین میں ایک نام سید یٰسین گجراتی کا گذرا ہے۔ جو حرمین جا کر اس سرچشمہ سے بہرہ مند ہوئے تھے، واپس آئے تو پہلے پانچ دریاؤں والی زمین (پنجاب) کو سیراب کیا، پھر تذکروں میں لکھا ہے کہ وہ اس کے بعد بنگالہ کے ملک کو چلے گئے۔ اس کے بعد اُن کا پتہ نہیں چلتا، لیکن خوش قسمتی سے پھلواری شریف سے سندِ حدیث کا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آیا ہے[۵] جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سید موصوف یہاں سے بہار گئے، اور وہاں بھی اس فیض کو جاری کیا، غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ بہار کی خانقاہ سے قال اللہ وقال الرسول کا ترانہ سمع نواز ہوا، اس سلسلۂ سند سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ المحدثین مولانا سید یٰسین کے درس سے دہلی "حافظ الوقت" مولانا شیخ عبدالرزاق نامی ایک بزرگ نے فائدہ اٹھایا، اور ان سے "شیخ الوقت" مولانا عبدالنبی نے اور ان سے اُن کے صاحبزادے مولانا عبدالمقتدر محدث نے اور اُن سے اُن کے بھتیجے اور شاگرد محمد عتیق بن عبدالسمیع بہاری نے اور ان ہی کی دی ہوئی یہ سند ہے۔ جو پھلواری میں محفوظ ہے،

مولانا عتیق بہاری نے اس گجراتی فیض کے ساتھ دہلوی سلسبیل کو ملا کر دو آتشہ بنالیا تھا' مولانا دور عالمگیری کے علماء میں ہیں، اس عہد میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحبزادہ

---

[۵] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۲؛ [۵] اسرار الابرار قلمی؛ [۵] (دیکھئے ص ۳ پر)

مولانا نورالحق محدث دہلوی اور ان کے شاگرد مولانا جمال الدین تھے۔ مولانا محمد عتیق بہاری نے سلسلۂ حق کی ان دونوں کڑیوں کو بھی ملالیا تھا،

مولانا محمد عتیق محدث بہاری کے تلامذہ میں شیخ محمد وجیہ بن شیخ امان اللہ جعفری پھلواروی ہیں، انہی کو یہ سند دی گئی تھی، اس سند میں ان کتابوں کا بھی ذکر ہے جن کی اجازت شیخ نے اپنے شاگرد کو دی تھی، ان میں حسب ذیل کتابوں کے نام ہیں، مشکوٰۃ، صحیح بخاری، صحیح مسلم، مصابیح، مشارق الانوار صغانی، شمائل ترمذی، حصن حصین جزری، کتاب الاذکار نووی، مسند امام اعظم ابوحنیفہ، مسند احمد بن حنبل، موطا امام مالک، مسند امام شافعی، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، لطائف ابن حبان، جامع المسانید ابن جوزی، ان میں سے تین پہلی کتابیں یعنی مشکوٰۃ، بخاری شریف اور مسلم شریف کے سبقاً پڑھے جانے کا اور بقیہ کتب کی اجازت کا ذکر ہے،

شیخ محمد وجیہ کے شاگرد، اُن کے صاحبزادہ ملا وحید الحق محدث پھلواروی ہیں، انھوں نے درس و تدریس اور تحریر و تالیف سے اس فن کی اشاعت کی لیکن وہ تمامتر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تصنیفات کے خوشہ چیں تھے، اس کے بعد ایک سو برس تک پھلواری میں معقولات کا زور شور رہا، آخر مولانا آل احمد صاحب نے سو برس کے بعد اس فیض کو یہاں پھر جاری کیا،

یہ سب کچھ ہوچکا تھا لیکن ہندوستان میں علم حدیث کی اصلی شوکت و رونق دو فاروقی خانوادوں کے ذریعہ سے حاصل ہوئی، جن میں ایک حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقی ہیں

حاشیہ ص ۳۴) اس سلسلہ سند کی دستیابی کے لئے ہم اپنے محترم مخدوم حضرت مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی قادری چشتی کے ممنون ہیں، یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ حضرت شاہ صاحب کو علماء اور مشائخ کی تاریخ سے پوری واقفیت اور دلچسپی ہے،

مجددی خانوادہ کا پہلا علمی اتصال شیخ عبدالحق دہلوی کے سلسلہ سے ہوا مگر بہت جلد شیخ دہلوی کی جگہ شاہ ولی اللہ کے گھرانے نے لے لی، اور دونوں سرچشموں سے مل کر ہندوستان میں جو فیض پھیلا، اُس نے ملک کے چپہ چپہ کو سیراب کر دیا،

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی

شیخ احمد سرہندی نے معقولات مولانا کمال الدین کشمیری سیالکوٹی اور علم حدیث مولانا عبدالرحمٰن سرہندی اور مولانا یعقوب کشمیری سے حاصل کیا. یاد ہوگا کہ مولانا یعقوب صرفی کشمیری، شیخ ابن حجر مکی کے شاگرد تھے، اور وہ یہ فیض عرب سے ہندوستان لائے تھے. اس کے بعد وہ حرمین تشریف لے گئے، اور وہاں کے بڑے بڑے محدثین کرام کی صحبت اٹھائی. شیخ عبدالرحمٰن بن فہد سے جو اُن کے زمانہ کے ایک بڑے محدث تھے، حدیث مسلسل سنی اور صحاح ستہ کا اجازہ حاصل کیا[1]، ولادت ۹۷۱ھ میں اور وفات ۱۰۳۴ھ میں ہوئی،

فن حدیث میں ایک اربعین یعنی چالیس منتخب حدیثوں کا مجموعہ آپ کی تالیف ہے، جو عام طور سے چھپا ہوا ملتا ہے. اس کے علاوہ جس نے آپ کے مکتوبات کا مطالعہ کیا ہے وہ شہادت دیگا کہ آپ کا پایہ علم حدیث میں کتنا بلند تھا، لیکن حضرت مجدد الف ثانی کا اصلی کارنامہ یہ نہیں ہے کہ وہ درس حدیث کی مسند بچھا کر بیٹھے، بلکہ یہ ہے کہ انھوں نے علی الاعلان دربار شاہی کے بدعات و منکرات کے خلاف بغاوت کی، اور اس کی سزا (قید) خوشی خوشی برداشت کی. اہل سنت جو شاہی اثر سے شیعیت میں جذب ہو رہے تھے، اُن کو دلائل کے زور، اور دلی ہمت کی قوت سے باہر نکالا، عامیانہ تصوف جو سنت کے مسلک سے کوسوں دور ہو گیا تھا، اس کو جادۂ شریعت کے قریب لائے. اور شریعت و طریقت کی قلمی و لسانی جنگ جو پانچویں صدی کے شروع سے اب تک قائم تھی. اس کو مصالحت سے بدل دیا، اور صوفیہ اور فقہا کی چھ سو برس کی باہمی دست و گریبانی کا

---

[1] ابجد العلوم نواب صدیق حسن خان و تاریخ علمائے ہند،

خاتمہ ہوا، اور مدرسہ وخانقاہ کی باہمی آویزش انجام کو پہونچی، علمار کو صحیح تصوف سے اور صوفیہ کو مسلکِ سنت سے آشنا کیا، اور ہر ایک فرقہ نے دوسرے کو نوید بشارت دی کہ

بِللّٰہ الحمد میانِ من و او صلح فتاد

حضرت مجدد نے اپنی تعلیم کی بنیاد اتباعِ سنت پر رکھی، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ علم حدیث اور شمائل کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ مبذول ہوگئی، اور اُن کے بعد صوفی محدثوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہندوستان میں قائم ہوگیا،

حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی معاصر تھے، پہلے اس معاصرت نے منافرت کی صورت پیدا کی، مگر دونوں بزرگوں کی اخلاص پسندی نے ایک کو دوسرے سے آشنا کردیا، اور دونوں میں یہ اتحاد پیدا کردیا کہ آئندہ اسلام کی علمی و روحانی خدمت کے لیے یہ دونوں خانوادے متحد ہوگئے،

سلسلۂ مجددیہ حضرت مجدد الف ثانی کی متعدد اولادوں میں سے صرف دو آپ کی وفات کے بعد آپکے جانشین ہوئے، ایک عروۃ الوثقیٰ حضرت محمد معصوم اور دوسرے خازن الرحمۃ شیخ محمد سعید حضرت محمد معصوم سنہ ۱۰۰۹ھ میں پیدا ہوئے، اور سنہ ۱۰۸۰ھ میں وفات پائی، تذکروں میں ہے کہ ۹ لاکھ آدمیوں نے آپکے دستِ مبارک پر بیعتِ توبہ کی، اور سات ہزار خلفار مدارجِ علیار تک پہنچے، ان ہی میں ایک مولانا نور الحق محدث دہلوی خلف مولانا عبد الحق محدث دہلوی ہیں،

حضرت محمد معصوم رحمۃ اللہ علیہ نے گو اپنا درس ۱۸ برس کے سن میں خود اپنے والد بزرگوار کی خدمت میں ختم کرلیا تھا، مگر یہیں اُس وقت جب داراشکوہ اور عالمگیر تاج و تخت کے حصول کے لئے دست و گریباں تھے، حضرت مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے، وہاں کے علمار سے علوم حدیث کی سند لے رہے تھے، اور خود اُن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سند تقسیم فرما رہے تھے

دوسرے صاحبزادہ شیخ محمد سعید سرہندی بھی متبحر فقیہ و محدّث تھے، اپنے والد ماجد سے فیض حاصل کیا، اور ۱۰۷۰ھ میں وفات پائی، علم حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح پر ایک حاشیہ آپ کی یادگار ہے[۱]

حضرت محمد معصوم کے صاحبزادے شیخ محمد افضل سرہندی ہیں، حرمین کی زیارت سے ممتاز تھے، کتابوں کے اتنے شائق تھے، کہ جو کچھ ملتا تھا، اس سے کتابیں خرید لیتے تھے، شاہ ولی اللہ دہلوی نے اُن سے حدیث کی سند حاصل کی تھی، ۱۱۴۶ھ میں وفات پائی،[۲]

اب گیارہویں صدی کا خاتمہ ہے، اتنے دنوں میں زمانہ نے ایک عظیم الشان پلٹا کھایا، ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی حکومت بد سے بدتر ہوتی گئی، اور عالمگیر کے جانشین اب ایک سے ایک کمزور تر ہو رہے تھے؛ اور ادھر حرمین میں درسِ حدیث کی مسند پر ابنِ حجر مکی اور اُن کے تلامذہ در تلامذہ کے بجائے کچھ اور نئے خانوادوں کے ارکان متمکن تھے جن میں ہر ایک دوسرے سے بڑھکر پیدا ہو رہا تھا؛

اس عہد میں حرمین میں دو ہندوستانی محدّث مسند نشیں ملتے ہیں، عبداللہ لاہوری مکہ معظمہ میں اور ابوالحسن سندھی مدینہ منورہ میں، افسوس ہے کہ پیش نظر ذخائر میں ان بزرگوں کے مزید حالات معلوم نہیں ہوتے، ان کے علاوہ دنیائے اسلام کے چند اور اعیانِ حدیث جلوہ افروز نظر آتے ہیں جن میں محمد بن سلیمان مغربی (مراکش) حسن عجمی (عجم) شیخ عبداللہ بن سالم البصری (عراق) احمد نخلی، تاج الدین حنفی، شیخ احمد بن سالم البصری محمد بن علاء الدین بابلی، شیخ ابراہیم کردی شیخ ابراہیم کردی کردستان کے رہنے والے تھے، بغداد، شام، مصر، اور حرمین کے شیوخ سے فیض حاصل کیا تھا، اور اس عہد میں اگلے زمانہ کے بزرگوں کی سی ہمت کا نمونہ دکھایا تھا، کردی

---

[۱] تاریخ علمائے ہند ص ۱۹۰ [۲] ایضاً ص ۱۸۲

فارسی، ترکی، اور عربی چار زبانوں میں گفت گو کرتے تھے، ۱۱۰۱ھ میں وفات پائی، "انا علیٰ فراقک یا ابراھیم لمحزونون" تاریخِ وفات ہے،

شیخ ابراہیم کردی کے صاحبزادے شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی ہیں، اپنے والد کے علاوہ محمد بن سلیمان مغربی، حسن عجمی، احمد نخلی، شیخ عبد اللہ بن سالم بصری، شیخ عبد اللہ لاہوری، شیخ تاج الدین حنفی سے اجازے اور سندیں حاصل کیں، یہی وہ بزرگ ہیں جن کے حلقۂ درس میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی جا کر شریک ہوئے تھے،

شیخ سالم بصری کے دو صاحبزادے، عبد اللہ بن سالم اور احمد بن سالم نے نہایت شہرت اور حسنِ قبول پایا، اور حقیقت یہ ہے کہ اس عہد میں علمِ حدیث کا فروغ اور حدیث کی کتابوں کی تصحیح و اشاعت کا اہم فرض انہی دو بھائیوں کی ہمتِ مردانہ سے ادا ہوا، شیخ عبد اللہ ابن سالم بصری نے بھی شیخ ابراہیم کردی سے اجازہ پایا تھا، اور اُن کے علاوہ دوسرے شیوخ سے بھی فائدہ اٹھایا تھا حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اُن کے حلقۂ درس میں بھی چند روز بیٹھے تھے، جیسا کہ انھوں نے اپنے رسالہ انسان العین میں اس کی تصریح کی ہے،

شیخ احمد بن سالم بصری کعبہ کے اندر بیٹھ کر بخاری شریف پڑھتے تھے، بخاری کی شرح ضیاء الساری انھوں نے لکھی ہے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے، کہ انھوں نے صحاح ستہ کے ۹ نسخے جمع کئے، اور نہایت محنت شاقہ اٹھا کر اُن کی ایسی تصحیح کی کہ اُن کے نسخے اُمہات اور اصول بن گئے، سب سے زیادہ صحیح بخاری کی تصحیح میں کوشش بلیغ کی، چنانچہ پورے بیس برس میں بخاری کی تصحیح انجام کو پہونچی، مسند ابن حنبل کی جلدیں جو منتشر تھیں، اُن کو مختلف مقامات سے یکجا کر کے اُن کی تصحیح کی، اُن کے یہ مصحح نسخے ہی وہ نسخے تھے، جن کی نقلیں اطراف و دیار میں پھیلیں، ۱۱۳۴ھ میں وفات پائی،

عبداللہ لاہوری اوپر کے سلسلہ میں ایک بزرگ کا نام عبداللہ لاہوری محدث گذرا ہے، جو اس زمانہ میں حرمین میں حدیث کا درس دیتے تھے۔ چنانچہ شیخ ابو طاہر مدنی اُن سے مستفید تھے، اس کے علاوہ اُن کا کچھ اور حال نہیں معلوم ہوتا۔

ابوالحسن سندھی اسی عہد کے ایک اور ہندوستانی محدث جو عرب کی سرزمین میں ایک پورے حلقۂ درس کے مرکز تھے شیخ ابوالحسن سندھی ہیں، مدینہ منورہ میں ایک مدرسہ دارالشفاء کے نام سے تھا، اور جو اب تک کسی نہ کسی حال میں باقی ہے، میں نے اس کی زیارت کی ہے، دارالشفاء کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اُس کے واقف نے یہ شرط کی ہے کہ اس میں قاضی عیاض کی کتاب الشفاء فی حقوق المصطفیٰ کا روزانہ درس دیا جائے، شیخ ابوالحسن سندھی گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں اس میں مدرس تھے ۱۱۳۹ھ میں وفات پائی، حرم نبوی میں بیٹھ کر حدیث کی متعدد کتابوں پر شروح اور تعلیقات لکھیں، چنانچہ جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ کی شرح لکھی۔ موصوف کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مسند ابن حنبل جو آٹھ جلدوں میں ہے، اور جس کی کسی نے اب تک شرح نہیں لکھی تھی، انھوں نے پچاس جزء میں اس کی شرح لکھی،[1] شیخ کے لائق تلامذہ میں سے دو کا تعلق ہندوستان سے ہے، حاجی عبدالولی طرخانی کشمیری اور شیخ محمد حیات سندھی۔

حاجی عبدالولی طرخانی کشمیری وہ اصل میں طرخان واقع ترکستان کے رہنے والے تھے، وطن سے نکل کر حرمین تشریف لے گئے، اور وہاں مدرسۂ دارالشفاء میں حدیث کی سند شیخ ابوالحسن سندھی سے حاصل کی، اور وہاں سے واپس آکر کشمیر میں شیخ الاسلام مولانا قوام الدین محمد کے یہاں قیام کیا، اور ان کو اپنی سند حدیث سے ممتاز کیا، ۱۱۶۰ھ میں چند شریروں کے ہاتھوں

---

[1] انظر فی اخبار الصحاح الستہ میں ہر کتاب کے تحت میں ان شروح کا ذکر نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے کیا ہے

سے شہادت پائی،[1]

شیخ محمد حیات سندھی | شیخ محمد حیات کا وطن سندھ میں عادل پور اور کوٹ سید موسیٰ قادری
کے اطراف میں ہے، چاچڑ قبیلہ کا نام ہے، شباب کا آغاز تھا کہ جاذبۂ شوق نے دامنِ دل
کھینچا، حرمین کی راہ لی، بالآخر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی، اور وہیں شادی بھی کر لی،
زیادہ تر شیخ ابوالحسن سندھی مدنی سے اور کسی قدر عبد اللہ بن سالم مصری مکی سے علمِ حدیث کی
تحصیل و تکمیل کی، اور تمام عمر اس فنِ شریف کی خدمت میں صرف کر دی، مصر و روم و شام
و ہند ہر جگہ اُن کے فضل و کمال کا غلغلہ بلند ہوا، اور ہر طرف سے طالب و مشتاق کا ہجوم
ہوا، ۱۱۶۳ھ میں وفات پائی، ہندوستان کے اہلِ علم میں سے جن کو شیخ کے تلمذ کا شرف
حاصل ہوا، اُن میں حسبِ ذیل اصحاب قابلِ ذکر ہیں،

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی | علامہ آزاد گو ہندوستان ہی میں اپنے نانا میر عبد الجلیل بلگرامی
کے واسطہ سے شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے سلسلہ میں داخل ہو کر حدیث کی بعض کتابیں
پڑھ چکے تھے، مگر ۱۱۵۰ھ میں وہ جب عرب گئے، تو مدینہ منورہ پہونچ کر شیخ محمد حیات
سندھی کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے، اور صحیح بخاری سبقاً سبقاً پڑھی، اور حدیث کی
دوسری کتابوں کی سند لی، صحیح بخاری اس اہتمام سے پڑھی کہ روزانہ جس قدر بخاری
پڑھتے تھے، اسی قدر قسطلانی شرح بخاری کی تلخیص کرتے جاتے تھے، اس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے؛
علامۂ ممدوح شیخ کے بیحد معترف تھے، مآثر الکرام فی تاریخ بلگرام میں ان کا حال لکھا ہے،[2]

شاہ محمد فاخر الہ آبادی | الہ آباد کے اس خانوادۂ علم و تصوف کا آغاز شاہ محمد افضل الہ آبادی[3]
سے ہوتا ہے، یہ اصل میں سید پور کے جو غازیپور کے مشہور قصبوں میں ہے، رہنے والے تھے، جونپور میں علوم ظاہری

---

[1] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۷: [2] مآثر الکرام جلد اول ص ۱۶۴،

کی، اور کالپی میں علوم باطن کی تعلیم پائی، نقشبندی طریقہ کے بزرگ اور سنت کے متبع تھے، ۱۰۳۰ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۱۲۴ھ میں وفات پائی تصوف اور فارسی ادبیات کی متعدد کتابوں کے شارح ہیں، ان کے جانشین ان کے بھتیجے، اور داماد شاہ خوب اللہ ہوئے، جو اپنے عہد کے مشہور عالم وصوفی ومورخ تھے، فقہ وتصوف کے علاوہ وفیات الاعلام اُن کی سب سے اہم تصنیف ہے، جس میں علماء اور مشائخ کے تذکرے ہیں، ۱۱۴۴ھ سال وفات ہے، اُن کے صاحبزادے شاہ محمد فاخر الہ آبادی ہیں، شاعر بھی تھے، زائرؔ تخلص تھا، اپنے بڑے بھائی شیخ محمد طاہر سے تعلیم پائی، اکیس ۲۱ برس کے سن میں اپنے پدر بزرگوار کی جگہ پر بیٹھے، اٹھائیس برس کے سن میں حج کے لئے گئے، اور مدینہ منورہ پہونچ کر شیخ محمد حیات سندھی سے حدیث کی تحصیل کی، دو حج کئے تھے، تیسرے حج کا ارادہ تھا، کہ راہ میں برہان پور میں وفات پائی ۱۱۶۴ھ تاریخ وفات ہے، قرۃ العینین فی رفع الیدین، نور السنہ اور درۃ التحقیق ان کے مشہور رسالے ہیں، شاہ صاحب ممدوح غالبًا اپنے ساتھ عرب سے صحیح مسلم کا ایک نسخہ لائے تھے، جو اُن کے مدرسہ میں موجود تھا، اس نسخہ کی نقل کتب خانہ حبیب گنج میں ہے، شاہ محمد فاخر اور آزاد بلگرامی نے شیخ محمد حیات سندھی سے مدینہ منورہ میں ایک ساتھ استفادہ کیا تھا، اس لئے مآثر الکرام میں اُن کا حال لکھا ہے۔[1]

مدراس میں علم حدیث

مدراس اور کرناٹک کا علاقہ اسلامی علم کے زیر سایہ بہت اخیر زمانہ میں یعنی عالمگیر کے عہد میں آیا، تاہم اس کا ساحلی حصہ مدت دراز سے عرب تاجروں کا جولانگاہ تھا، ملیبار میں اُن کی بڑی آبادی تھی، مصر اور عرب سے اُن کے براہ راست بحری تعلقات تھے، اس بنا پر یہ بآسانی قیاس میں آسکتا ہے، کہ یہاں علم حدیث مصر اور عرب کے

[1] تفصیلی حالات کے لئے دیکھو مآثر الکرام ج دوم ص ۲۱۰ (دیکھو مابعد)

راستہ سے براہ راست داخل ہوا ہوگا، لیکن چونکہ اس دیار کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے، یا میرے پیش نظر نہیں ہے، اسلئے کوئی تصریحی بات نہیں کہی جا سکتی، بہرحال عالمگیر کے بعد بارہویں صدی کے بیچ میں جب نظام دکن کی ملکی وسعت کے اندر کرناٹک کا علاقہ آیا، اور ارکاٹ میں ایک اسلامی ریاست قائم ہوئی، تو اہل علم نے بھی ادھر کا رُخ کیا، اس عہد کے لوگوں میں شیخ محمد اسعد حنفی مکی قابل ذکر ہیں، شیخ مذکور شیخ تاج الدین مکی کے شاگرد تھے، شیخ عبداللہ ابن سالم مصری مکی نے ضیاء الساری کے نام سے صحیح بخاری کی جو شرح لکھی تھی، اس کا اصلی نسخہ شیخ اسعد نے اُن کے لڑکے سے خرید لیا تھا، اور اس کو لے کر وہ مدراس آئے تھے، علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے ارکاٹ میں وہ نسخہ اُن کے پاس دیکھا تھا، اس گرانقدر نسخہ کو ہندوستان آنے پر علامہ موصوف نے شیخ کو ملامت کی، اور کہا کہ اس گرانقدر خزانہ کو اسلامی مرکز سے اتنی دور سفر میں لے آنا مناسب نہ تھا، انھوں نے کہا کہ میری محبت نے گوارا نہ کیا کہ میں تھوڑی دیر کے لئے بھی اس کو اپنے سے جدا رکھوں، یہ وہ زمانہ تھا جب نظام الدولہ ناصر جنگ (والی حیدرآباد دکن) اور فوج کے افغانوں کے درمیان کشمکش جاری تھی، اور ارکاٹ میں فتنوں کا طوفان برپا تھا، اس بنا پر شیخ نے شرح بخاری کا یہ نسخہ اورنگ آباد دکن میں بھجوا دیا، اور وہ خود ناصر جنگ کی شہادت کے بعد مظفر جنگ کے ساتھ ۱۱۶۶ھ میں شہید ہوئے، میر آزاد لکھتے ہیں کہ وہ نسخہ اس وقت تک اورنگ آباد میں محفوظ ہے[۵۱]، اب خدا جانے وہ کہاں ہو؛

شیخ محمد اسعد کے متعلق میر آزاد لکھتے ہیں،

"در منقولات خصوص حدیث و فقہ بے نظیر بود،"[۵۲]

آخر زمانہ میں شاہ محی الدین ویلوری المتوفی ۱۲۴۲ھ کے دم سے یہاں علم حدیث کی ترقی ہوئی

---

[۵۱] الحطہ فی اخبار الصحاح الستہ نواب صدیق حسن خان مرحوم ص ۹۵ [۵۲] مآثر الکرام آزاد جلد دوم ص ۱۹۰،

شیخ نورالدین احمد آبادی گجراتی

اسی عہد کے ایک اور قابلِ ذکر بزرگ شیخ نورالدین احمد آبادی
گجراتی ہیں، ۱۰۶۳ھ میں پیدا ہوئے، فارسی اپنی ماں سے پڑھی، عقلیات اخوند احمد سے حاصل کیں
اور علوم نقلی اور حدیث سید محمد ابو المجد محبوب عالم سے پڑھیں، مولانا کے علم و فضل کا شہرہ اطراف
ملک میں پھیلا تو طلبہ جوق درجوق آنے لگے، یہ دیکھ کر شیخ الاسلام خان صدر صوبہ گجرات نے بھی ایک
لاکھ سے زیادہ کے صرف سے ہدایت بخش نام ایک مدرسہ قائم کیا، ۱۱۰۲ھ میں مدرسہ کی بنیاد پڑی ۱۱۰۹ھ
میں وہ پورا ہوا، ۱۱۴۳ھ میں مولانا نے حج ادا کیا، واپس آکر ۱۱۵۵ھ میں وفات پائی، تفسیر
علم کلام، منطق وغیرہ کی تصنیفات کے علاوہ نور القاری کے نام سے صحیح بخاری کی شرح لکھی۔[1]

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی

ہندوستان کی یہ کیفیت تھی جب اسلام کا وہ اختر تابان نمودار ہوا جس کو
دنیا شاہ ولی اللہ دہلوی کے نام سے جانتی ہے، مغلیہ سلطنت کا آفتاب لبِ بام تھا، مسلمانوں
میں رسوم و بدعات کا زور تھا، جھوٹے فقراء اور مشائخ جا بجا اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں
بچھائے اور اپنے بزرگوں کے مزاروں پر چراغ جلائے بیٹھے تھے، مدرسوں کا گوشہ گوشہ منطق و
حکمت کے ہنگاموں سے پُرشور تھا، فقہ و فتاویٰ کی لفظی پرستش ہر مفتی کے پیشِ نظر تھی، مسائلِ فقہ میں
تحقیق و تدقیق سب سے بڑا مذہبی جرم تھا، عوام تو عوام خواص یکسر قرآن پاک کے معانی و مطالب اور
احادیث کے احکام و ارشادات اور فقہ کے اسرار و مصالح سے بے خبر تھے۔

شاہ صاحب کا وجود اس عہد میں اہلِ ہند کے لئے ایک موہبتِ عظمیٰ اور عطیۂ کبریٰ
تھا، شاہ صاحب کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم صاحب ایک عالم کامل تھے، معقولات میں
میرزاہد کے بے واسطہ شاگرد تھے، شاہ صاحب نے علوم رسمیہ کا درس اپنے والد سے لیا،
اور پندرہ برس کے سن میں تعلیم سے فراغت پائی، یہی وقت صبحِ سعادت کے ظہور کا تھا،

---

[1] تاریخ علمائے ہند ص ۲۴۸۔

مجددی نسبت اب تک ایک "مردکامل" کی تلاش میں بے قرار تھی، شیخ افضل سرہندی مجددی دولت کے اس عہد میں وارث تھے، شاہ صاحب نے اُن سے حدیث پڑھی ہندوستان میں جیساکہ شاہ صاحب نے جزء لطیف میں لکھا ہے، مشکوٰۃ کا ایک حصہ اور صحیح بخاری اور شمائل ترمذی پڑھی، ابھی تک بطحا اور یثرب کے چشموں سے سیرابی باقی تھی، تیس برس کی عمر میں ۱۱۴۳ھ میں سرزمین عرب کی راہ لی، اور دو برس وہاں رہ کر شیخ ابوطاہر مدنی سے کتب حدیث کا درس لیا، اس وقت شیخ کی مجلس میں صحیح بخاری کا درس ہو رہا تھا، اس میں شریک ہوئے، صحاح ستہ اور موطا امام مالک، مسند دارمی اور کتاب الآثار امام محمد کے اطراف ان کو سنائے اور بقیہ کتابوں کی سند اُن سے حاصل کی[1]، دو برس کے بعد ۱۱۴۵ھ میں ہندوستان واپس آئے، اور پورے تیس برس تک فیوض و برکات کا بادل اس علامۂ روزگار کے زبان اور قلم سے ہندوستان کی زمین پر برستا رہا، ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی،

حضرت شاہ صاحب کے کارناموں کی تفصیل کے لئے ایک مستقل دفتر کی ضرورت ہے لیکن ہم نہایت اختصار کے ساتھ اہلِ ہند پر اُن کے علمی و دینی احسانات کا ذکر کرتے ہیں

۱- مغلیہ دربار پر ہمایوں سے لے کر اب تک تشیع کا رنگ غالب تھا، دربار میں ایرانی امرار کی کثرت ہمیشہ رہی، اور اس کا اثر نیچے تک درجہ بدرجہ نمایاں تھا، اور شاہ صاحب کے عہد میں تو لکھنو کی نوابی کے سبب سے مسلمانوں پر اور زیادہ اثر پڑ رہا تھا، علمائے اہلِ سنت میں، اس اثر کے روکنے کی ہمت اور جرأت نہ تھی، حضرت مجدد الف ثانی جو اکبر اور جہانگیر کے عہد میں تھے، اُن کے مکتوبات اس غم و ماتم سے لبریز ہیں، حضرت شاہ صاحب پہلے

---

[1] ابجد العلوم نواب صدیق حسن خاں بحوالہ انسان العین مؤلفہ شاہ ولی اللہ دہلوی،

شخص ہیں جنھوں نے نہایت تحقیق، کدوکاوش، اور نہایت سنجیدگی اور متانت سے اس کام کو انجام دیا اور ازالۃ الخفاء عن تاریخ الخلفاء جیسی عالمانہ اور محدثانہ کتاب تالیف کی جس میں سیکڑوں، ہزاروں حدیثوں کے ذریعہ سے خلفاے راشدین کے مناقب فضائل کے وہ رموز و نکات کھولے جو اب تک نہیں کھلے تھے۔

۲- عقائد و کلام کی بے سرو پا لغو تلقینات کا جن پر اب تک علم دین کا گویا مدار سمجھا جاتا تھا، بھرم کھول کر رکھدیا، اور اُن کے مقابلہ میں کتاب و سنت کے اسرار و مصالح منظر عام پر لائے، اور ہندوستان کے علماء کو اُن کی سات سو برس کی غلط کاریوں پر متنبہ کیا۔

۳- قرآن پاک جو اصل میں اسلام کا مرکز و محور ہے، اور جو ہندوستان میں اب تک صرف تبرکاً تلاوت کے لئے مخصوص تھا، اس کے فہم و تعلیم کی طرف لوگوں کو دعوت دی، تفسیر کے اصول لکھے، قرآن کا فارسی میں مختصر لغت لکھا۔ قرآن پاک کے درس کا حلقہ قائم کیا، اور اس کو پڑھنے اور سمجھنے کی کتاب بنایا۔

۴- عربی زبان کی ناواقفیت، قرآن و حدیث کے سمجھنے میں عام لوگوں کے لئے مانع تھی، اس کو دور کرنے کے لئے اپنے عہد کی علمی زبان فارسی میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا، اور موطا کی فارسی میں شرح لکھی۔

۵- اب تک ہندوستان میں جو فقہ حنفی مروج تھی، وہ تمامتر فتاوی کی نقل در نقل کورانہ تقلید تھی، اور ہر وہ کتاب جس کو کسی حنفی عالم نے پہلے لکھدیا ہو، وہ استناد کے قابل سمجھی جاتی تھی، اور خاص امام ابوحنیفہ کا مسلک بن جاتی تھی، شاہ صاحب نے اس تقلیدی فقہ کی جگہ تحقیقی فقہ کا رواج دیا، ہر مسئلہ میں وہ ہر امام و مجتہد کی مختلف رایوں اور اجتہادوں اور ان کی دلیلوں اور سندوں سے واقف تھے، وہ ان میں باہم تطبیق یا ترجیح دیتے تھے،

مجتہدین کے اختلافات کے اسباب بتائے، اجتہاد و تقلید کی تشریح کی، اور کتاب و سنت کی اتباع و پیروی کی دعوتِ عام دی،

۶۔ شاہ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں کی تکمیل کی، تالیف و تحریر کے ذریعہ کتبِ حدیث کو عام کیا، حدیث کی اولین اور صحیح ترین کتاب موطا امام مالک کی فارسی اور عربی میں مجتہدانہ دو شرحیں لکھیں، صحیح بخاری کے تراجم کی شرح کی، اور "الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین" ایک رسالہ لکھا، فقہ و اسرارِ حدیث میں حجۃ اللہ البالغہ جلد دوم لکھی،

۷۔ خود ہندوستان میں حدیث کے درس و تدریس کے باقاعدہ حلقے قائم کئے، اور ان کے بعد ان کے تلامذہ نے تمام ملک میں پھیل کر اس فیض کو عام کیا،

۸۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے حسنِ نیت کا ثمرہ اُن کو یہ دیا کہ ان کو ایسی لائق اولادیں عطا کیں جنھوں نے اپنے والد بزرگوار کے ناتمام کاموں کی پوری تکمیل کی، اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ کو پیغامِ نبوی کے آوازہ سے معمور کر دیا، آج ہندوستان میں جہاں بھی قال قال رسول اللہ کی آواز سنائی دیتی ہے، وہ اسی خانوادۂ فضل و کمال کی خیر و برکت کی صدائے بازگشت ہے،

شاہ صاحب کی اولاد امجاد

شاہ صاحب کی چار اولادیں تھیں، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ، اور شاہ عبدالغنیؒ، اُن میں سے شاہ عبدالغنی نے بہت پہلے انتقال کیا، اور انہی کے صاحبزادے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ ہیں، ان بزرگوں نے اپنے والد بزرگوار کی وفات کے بعد اپنا الگ الگ حلقۂ درس قائم کیا، اُن میں سے ہر ایک کے حلقۂ درس سے بے شمار علماء کامل ہو کر اٹھے جنکی تفصیل اس مختصر مضمون میں نہیں سما سکتی ہے تاہم صرف مشاہیر و اکابر علما کی مختصر فہرست دیدینی ضروری ہے

شاہ عبدالعزیز صاحب | شاہ عبدالعزیزؒ نامور باپ کے نامور فرزند تھے ۱۱۵۹ھ میں پیدایش ہوئی، پندرہ سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت پائی، اور تمام علوم اپنے پدر بزرگوار سے پڑھے، اور اُن کے شروع کئے ہوئے کاموں کو آگے بڑھایا، درس و تدریس کا ہنگامہ برپا کیا، علم حدیث و سنت کو فروغ دیا، اور اہلِ تشیع کے رد میں تحفۂ اثنا عشریہ لکھی، قرآن کی فارسی میں تفسیر لکھی، محدثین اور کتبِ حدیث کے حال میں بستان المحدثین تالیف کی، اصولِ حدیث میں عجالۂ نافعہ نام چھوٹا سا رسالہ لکھا ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی، اپنے بعد مشہور تلامذہ کا بڑا مجمع یادگار چھوڑا،

شاہ رفیع الدین | شاہ رفیع الدین صاحب نے اپنے پدر بزرگوار سے علم کی تحصیل کی، علم حدیث کا درس دیا، متعدد رسالے لکھے، اور سب سے بڑا کام یہ کیا، کہ اب جب کہ فارسی کے بجائے اردو زبان ملک کی زبان ہو رہی تھی، قرآن پاک کا تحت اللفظ ترجمہ اس خوبی سے کیا کہ آج بھی اس سے بہتر اور صحیح تر ترجمہ مشکل ہے، اس کارنامہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اگر شاہ صاحب جیسے مقدس عالم اس کام کو اپنے وقت میں نہ کر گئے ہوتے، تو آج ہندوستان کے علماء ترکی و مصر کے علماء کی طرح وہم کی اس قید و بند میں گرفتار ہوتے کہ آیا قرآن پاک کا دوسری زبان میں ترجمہ جائز بھی ہے یا نہیں، مگر بحمد اللہ کہ شاہ صاحب کے اس عمل خیر نے اس ہنگامہ کو ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے فرو کر دیا شاہ صاحب کے اس ترجمہ نے لاکھوں اور کروڑوں مسلمانوں کو دین و ایمان کی راہ بتائی ۱۲۴۹ھ میں یہ شمع ربانی گل ہوئی،

شاہ عبدالقادر | شاہ عبدالقادر صاحب کو فقہ و تفسیر و حدیث میں ید طولیٰ حاصل تھا، قرآن کی اُردو میں موضح القرآن کے نام سے تفسیر لکھی، اور قرآن پاک کا ترجمہ کیا، حدیث کا درس جاری کیا ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی،

شاہ ولی اللہ صاحب کے تلامذہ

ان تینوں صاحبزادوں کے علاوہ شاہ صاحب کے فیض درس میں جو لوگ بیٹھے، اُن کے ناموں کو یکجا کرنا بہت مشکل ہے، تاہم چند نام تلاش سے ملتے ہیں، پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں صحیح بخاری کا ایک نہایت اہم نسخہ ہے، جو شاہ صاحب کی درس گاہ میں زیر درس رہا ہے، اور اس پر شاہ صاحب کے دست خاص سے ایک تحریر ہے اور ایک تحریر شاہ صاحب کے اس شاگرد کی ہے، جس نے ان سے یہ نسخہ پڑھا، اس شاگرد کا نام محمد ابن پیر محمد بن شیخ ابوالفتح بلگرامی الہ آبادی ہے، اس پر مولانا پیر محمد کے ہاتھ سے جو عربی عبارت ہے اس کا عربی ترجمہ یہ ہے :-

"دلی میں جمنا کے کنارے جامع فیروزی میں چہار شنبہ کے دن بتاریخ ۶ر شوال ۱۱۵۹ھ جامع صحیح امام بخاری شیخ محمد بن شیخ پیر محمد بن شیخ ابوالفتح عمری بلگرامی ثم الہ آبادی کے ہاتھ سے تمام ہوئی، ساتھ ہی شروع سے آخر تک اس کی قرأت بھی شیخ ولی اللہ عمری کے درس میں تمام ہوئی۔

پھر اس پر شاہ صاحب کے دست مبارک سے عربی میں بخاری تک، ان کی اپنی سند اور اجازت درج ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے درس میں کیا کیا کتابیں پڑھائی جاتی تھیں فرماتے ہیں :-

"شیخ محمد بن شیخ پیر محمد بن شیخ ابوالفتح عمری نسباً بلگرامی اصلاً، الہ آبادی مولداً نے صحیح بخاری مجھ سے پڑھی، خواجہ محمد امین پڑھتے تھے، اور وہ سنتے تھے، نیز بقیہ کتب صحاح ستہ کے اطراف مجھ سے پڑھے، اور موطا امام مالک اور مسند دارمی اور مشکوٰۃ کے کچھ حصے پڑھے اور میں نے اُن کو ان کی اجازت دی، میں نے یہ اجازت و سند شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے حاصل کی، اس کو وطن استاد احمد بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین بن معظم بن منصور

ابن احمد بن محمود نے اپنے ہاتھ سے لکھا، جو نسباً عمری، وطناً دہلوی، عقیدۃً اشعری، طریقۃً

صوفی، عملاً حنفی، اور تدریساً حنفی و شافعی، اور تفسیر و حدیث و فقہ و عربیت اور کلام

کا خادم ہے، سہ شنبہ ۲۳ شوال ۱۱۵۹ھ"

اس تحریر کے نیچے شاہ رفیع الدین صاحب کی یہ عبارت ہے:۔

"ایں خط والد بزرگوار است بے شبہ کتبہ الفقیر محمد رفیع"

اس نسخہ پر ایک اور عبارت ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہ عالم بادشاہ کے حکم سے ۱۲۰۱ھ میں محمد نامی کسی عالم نے اس میں شروع تا آخر تک اعراب لگائے، اور کسی مصحح نسخہ سے اس کا مقابلہ کیا۔[1]

خواجہ محمد امین جن کا شاہ صاحب کی اس تحریر میں ذکر ہے، شاہ صاحب کے مخصوص شاگردوں اور مریدوں میں ہیں، شاہ صاحب کے تلامذہ میں ایک بزرگ مولانا رفیع الدین مرادآبادی ہیں، مولانا رفیع الدین نے شاہ صاحب کے علاوہ شیخ محمد حیات سندھی کے شاگرد مولانا خیر الدین سورتی سے بھی حدیث پڑھی، امام نووی کی اربعین کی شرح لکھی اور اپنے سفر حج کے حالات میں فارسی میں ایک رسالہ لکھا ہے۔[2]

کشمیر کے ایک اور بزرگ شاہ محمد عاشق چلپی معروف بہ بابا محمد عثمان کشمیری ابن شیخ محمد فاروق شاہ صاحب کے تلامذہ میں ہیں۔ حدیث اور فقہ کا درس شاہ صاحب سے حاصل کیا تھا۔

شاہ عبدالعزیز کے تلامذہ

شاہ ولی اللہ صاحب کے فیض کو اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ اُن کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحب کے ذریعہ عام کیا، بہت سے مشاہیر علماء اور علم حدیث کے ماہر اُن کے حلقۂ درس سے پیدا ہوئے، جن میں قابل ذکر خود شاہ صاحب کے داماد مولانا عبدالحئی

---

[1] مولانا رفیع الدین صاحب کے حال کے لئے: دیکھو تذکرہ علمائے ہند: ص ۶۲، [2] ایضاً

اور بھتیجے مولانا اسماعیل شہید اور نواسے شاہ محمد یعقوب اور شاہ محمد اسحاق صاحب، اور اُن کے علاوہ حسب ذیل اصحاب ہیں،

مرزا حسن علی محدث لکھنوی، مولانا حسین احمد محدث ملیح آبادی، مولانا سلامت اللہ بدایونی کانپوری، مولانا رؤف احمد مجددی مصطفےٰ آبادی، مفتی صدر الدین خان دہلوی، سید قطب الہدیٰ رائے بریلوی، مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا خرم علی صاحب بلہوری وغیرہ — پھر ان میں سے ہر ایک کے سینکڑوں شاگرد پیدا ہوئے،

شاہ رفیع الدین کے تلامذہ — ایک تو خود شاہ رفیع الدین صاحب کے صاحبزادہ شاہ مخصوص اللہ المتوفی سنہ ۱۲۷۳ھ ہیں، دوسرے مولانا رشید الدین خان دہلوی المتوفی سنہ ۱۲۴۹ھ اور تیسرے شاہ ابوسعید صاحب عمری، مجددی دہلوی المتوفی سنہ ۱۲۴۹ھ،

شاہ عبد القادر صاحب کے تلامذہ — مفتی صدر الدین خان اور مولانا فضل حق خیر آبادی،

دلی کے دو چراغ — شاہ عبد العزیز صاحب کے بعد علم حدیث کے دو چراغ روشن ہوئے، ایک شاہ صاحب کے نواسہ مولانا شاہ اسحاق صاحب اور دوسرے شاہ ابوسعید صاحب کے صاحبزادہ شاہ عبد الغنی صاحب مجددی،

اس موقع پر ایک فرق سمجھ لیجئے، یہ شاہ عبد الغنی صاحب مجددی، اور اُن کے والد شاہ ابوسعید صاحب مجددی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان سے ان کا کوئی نسلی اتصال نہیں ہے،

اس خاندان کے تلامذہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے، لکھنؤ میں علم حدیث کا جو فیض پہنچا وہ بھی اس خانوادۂ علم وکمال کا مرہون منت ہے،

مرزا حسن علی محدث لکھنوی | سب سے زیادہ لکھنؤ میں جن بزرگ نے اس فیض کو عام کیا، اور خود فرنگی محل تک نے اُن سے رجوع کیا، وہ مرزا حسن علی محدث لکھنوی ہیں، اس نام کے اس وقت لکھنؤ میں دو بزرگ تھے، ایک محلہ یحییٰ گنج میں رہتے تھے، اور دوسرے محمود نگر میں رہتے تھے، پہلے صغیر اور دوسرے کبیر کہلاتے تھے، یہاں مقصود یحییٰ گنج کے مرزا حسن علی صغیر محدث لکھنوی ہیں، مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے شاگرد تھے، اور لکھنؤ آکر علم حدیث کی ترویج و تدریس میں کوشاں رہے، اور سینکڑوں آدمیوں نے اُن سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، علماے فرنگی محل نے بھی اُن سے علمِ حدیث کا فیض حاصل کیا، اور اسی وقت سے لکھنؤ کی درسگاہوں میں علم حدیث کا رواج ہوا، نصیرالدین حیدر کی سلطنت میں ۱۲۲۶ھ میں وفات پائی[1] اُن کے ایک شاگرد مولانا محمد علی صدرپوری ملیح آبادی ہیں، جو اخیر میں نواب ٹونک کے ملازم ہوگئے تھے، توحید و سُنت کی اشاعت اور رسوم و بدعات کے ابطال میں بڑی کوشش کی۔

مولانا حسین احمد ملیح آبادی | ان کے والد سرہند سے لکھنؤ اور لکھنؤ سے ملیح آباد جاکر آباد ہوئے، مولانا کی پیدائش یہیں ہوئی، مرزا حسن علی لکھنوی، مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی اور شیخ عمر محدث مکی سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، اُن کا ایک رسالہ جواز قرأت خلف الامام مشہور ہے، مولانا شاہ عبدالرزاق فرنگی محلی نے اُن سے حدیث پڑھی تھی، ۱۲۷۵ھ میں وفات پائی،[2]

شاہ محمد اسحاق | اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس میں بڑی برکت عطا فرمائی، تمام بڑے بڑے علماء ان کے شاگرد تھے، چند رسالے بھی اُن کی تصنیف ہیں، غدر کے بعد مکہ معظمہ ہجرت کرکے چلے گئے تھے، اور وہاں بھی یہ سلسلہ فیض جاری رہا، آخر وہیں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی، اُن کے تلامذہ میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری، نواب صدرالدین خاں دہلوی نواب قطب الدین خاں

---

[1] تذکرہ علماے ہند صفحہ ۴۸، [2] ایضاً ص ۵۰،

جنھوں نے کتب حدیث کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، مولانا سید نذیر حسین صاحب (بہاری) دہلوی مولانا عالم علی صاحب مراد آبادی، شیخ محمد صاحب تھانوی، مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی، مولانا قاری عبدالرحمٰن صاحب پانی پتی ہیں،

شاہ عبدالغنی صاحب مجددی | شاہ صاحب نے موطا اپنے والد مولانا شاہ ابو سعید صاحب سے پڑھی، مشکوٰۃ شاہ رفیع الدین صاحب کے صاحبزادے شاہ مخصوص اللہ صاحب سے، اور بقیہ کتابیں شاہ عبدالعزیز صاحب سے پڑھیں، شاہ صاحب کی مجلس درس میں وہی پڑھتے تھے، سنن ابن ماجہ پر ان کا حاشیہ ہے، جس کا نام انجاح الحاجہ ہے، چھپ چکا ہے، انگریزی تسلط کے بعد انھوں نے بھی ہجرت کی تھی، پہلے مکہ معظمہ میں رہے، پھر مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کرلی، اللہ تعالےٰ نے اُن دونوں بزرگوں پر یہ برکت عطا فرمائی، کہ تمام دنیا سے اسلام اُن کی زیر بار احسان ہوگئی، اور جہاں بھی کوئی قال قال رسول اللہ کہتا ہے، ان دونوں بزرگوں میں سے ایک کا واسطہ ضرور ہوتا ہے، حرمین کے تمام علماء نے ان کے حلقۂ درس سے فیض پایا، اور آج مدینہ منورہ میں جو سلسلہ سب سے زیادہ قلیل الوسائط لیکن کثیر البرکت ہے، وہ انہی دونوں بزرگوں میں خصوصاً حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کا ہے،

حضرت شاہ صاحب کے اسناد و اثبات الیانع الجنی فی اسناد الشاہ عبدالغنی چھپ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا کتنا شکر یہ ادا کیا جائے، کہ پچھلے سفر حج (۱۳۲۲ھ) میں شیخ عمری مغربی کے واسطہ سے اس سلسلہ کی سند اس گنہگار کو بھی عطا ہوئی۔

شاہ عبدالغنی صاحب کے تلامذہ | شاہ عبدالغنی صاحب کے تلامذہ اور مستفیدین کی فہرست حد شمار سے باہر ہے، لیکن ان میں سے دو صاحب سلسلہ بزرگ سب سے زیادہ مشہور و معروف ہیں، مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

ان دونوں بزرگوں کے فیوض و برکات عالم آشکارا ہیں، اور آج بھی ہمارے سامنے ہیں، ان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا

مولانا عبدالحی بڑھانوی اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کے تلامذہ

مولانا عبدالحی شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد اور شاگرد خاص اور مولانا شاہ اسماعیل شہید شاہ صاحب کے بھتیجے، اور مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے پوتے تھے، ان دونوں بزرگوں نے بھی درس و تدریس کی خدمت انجام دی لیکن زبان و قلم سے آگے بڑھ کر اپنے زور بازو سے بھی کتاب و سنت کی اشاعت اور شرک و بدعت کے رد کی کوشش کی، بنگال سے لے کر افغانستان کی سرحد تک کا دورہ کیا، وعظ و نصیحت کی، مناظرے کئے، جمعہ و جماعت کا اہتمام کیا، رسوم کا ابطال کیا، لوگوں کو جہاد کی دعوت دی، اور ان مہمات کے ساتھ ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری (جد بزرگوار مولانا ابوبکر محمد شیث صاحب جونپوری) نے ان ہی دونوں بزرگوں کے آغوش درس میں تعلیم پائی؛

مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری

مولانا سخاوت علی کچھ دنوں نواب ذوالفقار خاں رئیس باندہ کے مدرسہ میں مدرس تھے، پھر جونپور آکر درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، بہار و جونپور و اعظم گڈھ و بنارس سے بکثرت طلبہ اُن کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے؛ اور اُن کے ذریعہ سے قدیم جاہلانہ رسوم کے ابطال اور مذہبی شعائر کے اجرا میں بڑی مدد ملی، مشکوٰۃ کے طرز پر مولانا نے التقویم فی احادیث النبی الکریم ایک مفید کتاب لکھی، جو یمین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علی خاں (ٹونک) کے ایمائے ۱۳۱۳ھ میں مطبع صدیقی بنارس میں چھپی، حج کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے، اور وہیں ۱۲۷۴ھ میں وفات پائی؛ اُن کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ مولانا کرامت علی جونپوری، خواجہ احمد نصیر آبادی، مولانا رجب علی

جونپوری، مولانا محمد شریف جونپوری، ملا غلام محمد جگدیش پوری، مولوی شیخ محمد مچھلی شہری، مولانا محمد عمر غازیپوری، مولانا غلام جیلانی، غازی پوری، مولانا فیض اللہ مئوی اعظم گڈھی مولوی رحیم اللہ صاحب ساکن بستی، مولانا سید یعقوب صاحب دیسنوی بہاری، اور مولانا سید مصطفےٰ شیر صاحب دیسنوی بہاری مدرس مدرسہ خانقاہ[1] (سہسرام)

فرنگی محل اور علم حدیث

لکھنؤ میں فرنگی محل کا علمی مرکز عالمگیر کے عہد میں قائم ہوا، ملا قطب الدین اور ملا نظام الدین رحمہما اللہ کے عہد سے لے کر مولانا عبدالحلیم رحمۃ اللہ علیہ تک، اس خانوادہ فضل و کمال کی علمی کوششوں کا جولانگاہ منطق اور اصول کی کتابیں رہیں، اور تعجب ہے کہ اس قدر طویل زمانہ تک ہندوستان کی یہ مشرقی درسگاہ حدیث کے ترانۂ قدس سے ناآشنا رہی، بزرگوں سے جو کچھ سنا ہے، وہ یہ ہے کہ درس نظامی میں صرف مشکوٰۃ داخل تھی، اور وہی پڑھائی جاتی تھی، یہ بھی سنا ہے، کہ فرنگی محل میں صحیح بخاری کے پندرہ پارے موجود تھے، مگر وہ صرف تبرکاً رکھے رہتے تھے۔

ملا نظام الدین بہرحال فرنگی محل کی درسگاہ ایک مدت تک کتب صحاح کے درس سے خالی رہی، اور صرف کسی مختصر مجموعۂ حدیث پر قناعت کی گئی، حضرت ملا نظام الدین کی ایک تصنیف اُن کے پیر و مرشد حضرت سید عبدالرزاق بانسوی رحمۃ اللہ علیہ کے حال میں مناقب رزاقیہ کے نام سے ہے، اس میں ایک موقع پر یہ واقعہ درج ہے کہ ایک دفعہ سید صاحب نے جوانی سے پوچھا کہ تیمم کا طریقہ کیا ہے، لوگوں نے حنفی طریقہ سے بتایا، اس پر سید صاحب نے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے (کشف سے) کہ اگر صرف منہ اور کہنیوں تک ہاتھوں کا مسح کر لیا جائے، تو کافی

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند ص ۲۶۰)

حاضرین نے انکار کیا، ملّا صاحب اس موقع پر فرماتے ہیں:-

"اختلاف است فقہارا کہ در تیمم استیعاب ذراع یا بہ بند دست کفایت دارد حضرت امام اعظم وصاحبیہ رحمہم اللہ باول است، وامام شافعی بقول قدیم وجماعۃ بثانی واکثر احادیث صحاح مؤید قول امام شافعی وغیرہ است (ص ۱۹)

مولانا بحر العلوم | علمائے فرنگی محل میں سب سے پہلی ہستی جس کی تصنیفات کتب حدیث کے حوالوں سے لبریز ہیں، وہ مولانا عبد العلی بحر العلوم خلف الصدق ملا نظام الدین کی ذات ہے، مگر یہ بہ تحقیق معلوم ہوا ہے کہ اُن کو حدیث کی کتابوں کی باقاعدہ سند حاصل نہ تھی، اور اس کا کہیں ذکر ان کے حالات وتصنیفات میں نہیں ملتا، بلکہ علوم کی فراغت کے بعد انھوں نے محدثین کی کتابیں پڑھ کر اس فیض کو از خود حاصل کیا تھا،

متعدد طریقوں سے یہ روایت سنی ہے کہ مولانا عبد العلی (بحر العلوم) کی جب عقلی تصنیفات دلی میں مولانا شاہ عبد العزیز صاحب کی خدمت میں پہونچیں، تو حضرت شاہ صاحب نے دیکھ کر فرمایا کہ دینیات سے کورے ہیں، یہ سن کر مولانا عبد العلی نے فقہ میں ارکانِ اربعہ لکھ کر بھیجی جس میں محققانہ مسائل پر بحث اور احادیث کے حوالے ہیں، اس کو دیکھ کر شاہ صاحب نے فرمایا کہ اخاہ! ملا عبد العلی تو بحر العلوم ہیں[1]، ایک کامل وقت کی زبان سے جو لفظ نکلا، وہ چاردانگ عالم میں پھیل گیا، اور اتنا مقبول ہوا کہ لوگ بحر العلوم کی شہرت کے مقابلہ میں عبد العلی نام تو بھول گئے اور زبانوں پر بحر العلوم رہ گیا،

مولانا بحر العلوم کی دو تصنیفات ارکانِ اربعہ فقہ میں، اور فواتح الرحموت شرح مسلم الثبوت اصول میں ایسی کتابیں ہیں، جن میں احادیث اور کتبِ احادیث کے حوالے بکثرت ہیں، یہاں پر دو باتیں

---

[1] یہ واقعہ تھوڑے سے تغیر کے ساتھ تذکرہ علمائے فرنگی محل میں بھی موجود ہے، ص ۱۴۰، ۱۴۱،

قابلِ بحث ہیں، مولانا کو یہ کتابیں کہاں ملیں، اور ان میں سے اصلاً کون کون کتابیں ملیں،

پہلی بات کے متعلق یقینی ہے کہ لکھنؤ کے قیام کے زمانہ میں یعنی ۱۱۷۲ھ یا ۱۱۷۳ھ تک جب مولانا کی عمر ستائیس اٹھائیس سال کی تھی، یہ کتابیں نہیں لکھی گئیں، اور نہ لکھنؤ میں تالیف یا تحریر ہوئیں۔ فواتح الرحموت کا نام تو تاریخی ہے، جس سے ۱۱۸۰ھ نکلتے ہیں، یہ زمانہ غالباً مولانا کے شاہجہاں پور یا رامپور کے قیام کا ہے، کیونکہ بوہار (بنگال) کا مدرسہ اور کتب خانہ بہت بعد یعنی ۱۲۰۹ھ میں قائم ہوا، اور مولانا کا قیام یہاں ۱۲۰۹ھ کے بعد ہی سے ہوا، اغصانِ اربعہ وغیرہ میں لکھا ہے کہ مولانا کی اکثر تصنیفات شاہجہاں پور ہی کے زمانہ قیام میں تالیف پائی ہیں، اور یہ بھی سنا گیا ہے کہ نواب شاہجہاں پور حافظ الملک رحمت خان نے ایک بڑا کتب خانہ بھی فراہم کیا تھا، اور یہ سرمایہ بعد کو رامپور میں منتقل ہوا، ان وجوہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا بحر العلوم کو اسی کتب خانہ میں کتابیں ملیں.

دوسرے سوال کا جواب کچھ زیادہ اہم نہیں، ارکانِ اربعہ میں جو کچھ ہے اس کا ماخذ دو کتابیں ہیں، اس کی اصل بنیاد تو علامہ ابنِ ہمام کی فتح القدیر (شرح ہدایہ) ہے جس میں تمام کتبِ حدیث کے اقتباسات اور حوالے موجود ہیں، اور انہی کے مباحث اور حوالوں کا خلاصہ ارکانِ اربعہ ہے، اس کے علاوہ دوسرا ماخذ محدثین احادیث کا ایک مشہور مجموعہ جامع الاصول ہے، جس کا مولانا نے بارہا اس میں حوالہ دیا ہے، اور اسی سے حدیثیں نقل کی ہیں۔

فواتح الرحموت کی تصنیف کے وقت مولانا کے سرمایہ میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا تھا، اس وقت ابن ہمام کی فتح القدیر اور تحریر فی الاصول کے علاوہ ابنِ حجر اور سیوطی کی کتابیں بھی ان کو مل گئی تھیں، چنانچہ ابنِ حجر عسقلانی کی فتح الباری شرحِ صحیح بخاری اور جلال الدین سیوطی کی تفسیر درمنثور اور الاتقان فی علوم القرآن کے حوالے بکثرت ان کی اس کتاب میں ہیں، معلوم

ہوتا ہے کہ سیوطی کی یہ دونوں کتابیں ہندوستان اس زمانہ میں پہونچ چکی تھیں، میر غلام علی آزاد کی تالیفات میں بھی ان دونوں کتابوں کے حوالے ہیں،

تفسیر دُرِ منثور اور اتقان گو قرآن پاک سے متعلق ہیں، مگر اُن کی تمامتر بنیاد احادیث اور روایات پر ہے، اور ان میں نہ صرف صحاح ستہ کی حدیثیں بلکہ دوسری نادر کتبِ حدیث کی روایتیں بھی ہیں، اس بنا پر ان دونوں کتابوں میں حدیث کی تمام کتابوں سے روایتیں آگئی ہیں مولینا بحر العلوم ان ضمنی روایتوں کو نہایت خوبی کے ساتھ اپنے کام میں لاتے ہیں، اس طریقہ سے اُن کی تصنیف فواتح الرحموت میں حسب ذیل کتب حدیث کے نام اور حوالے ملتے ہیں، اور اُن کی روایتیں بعینہٖ درج ہیں، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابی داوٗد، موطائے امام مالک، حاکم، بزار، ابن حبان، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق، بیہقی، رسالہ سیوطی فی احادیث روایا الصحابۃ عن التابعین، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شرح مشکوٰۃ فارسی بھی اُن کے مطالعہ میں تھی، جس کا ذکر اسی کتاب میں جرح و تعدیل کے مسئلہ کے ضمن میں ہے، اور خبرِ واحد کے مسئلہ میں بھی شیخ کا حوالہ دیا ہے، ان کے علاوہ تفاسیر بالروایۃ، اور شروحِ حدیث میں سے حسب ذیل کتابوں کے حوالے ہیں معالم التنزیل بغوی، دُرِ منثور سیوطی، فتح الباری، حافظ ابن حجر، متاخر محدثین میں ابن ہمام (صاحب فتح القدیر والتحریر) اور ابن تیمیہ کے نام بھی آئے ہیں،

کتب حدیث اور ان کی روایتوں کے حوالے جس طرح فواتح الرحموت میں آئے ہیں اُن سے بالیقین معلوم ہوتا ہے کہ صحیح بخاری و مسلم مولانا کے مطالعہ میں تھیں، اور دیگر کتب حدیث کی روایتیں بالواسطہ اور زیادہ تر دُرِ منثور اور اتقان سے ماخوذ ہیں، اور مولانا نے اکثر خود ان واسطوں کا ذکر کر دیا ہے،

ملا مبین | مولانا بحرالعلوم کے علاوہ فرنگی محل کے علمائے متقدمین میں دو بزرگوں کے نام ہم کو اور ملے ہیں، ایک مُلّا مبین ہیں، جن کے حال میں اغصان اربعہ کے مصنف نے لکھا ہے،

"واحادیث بسیار حفظ داشت، چنانچہ ہنگام وعظ ترجمۂ ہزاراں احادیث بر زبان می آورد" (ص ۱۰)

اہل بیت کے مناقب اور اسمائے الٰہی کی شرح میں اُن کے دو رسالے ہیں ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی،

ملا حیدر | مُلّا مبین کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد حیدر صاحب غالباً اس خاندان میں پہلے شخص ہیں، جنھوں نے عرب جا کر اس فن کی سند حاصل کی ۱۲۴۰ھ میں وہ حج کے لئے روانہ ہوئے، دو مہینے مکہ معظمہ میں اور کچھ مہینے مدینہ منورہ میں رہے، مکہ معظمہ میں سید یوسف بطاح یمنی اور شیخ مُلّا عمر مکی سے صحیحین کی تحصیل کی، اور مدینہ منورہ جا کر وہاں کے شیوخ سے تکمیل کی، اور بعد کو پھر مکہ معظمہ میں آ کر قیام کیا، عرب سے واپس آ کر حیدرآباد گئے، اور وہیں رہ گئے،[۵۱]

مولانا عبدالرزاق | تیسرے بزرگ مولانا شاہ عبدالرزاق ہیں، حدیث کی کتابیں انھوں نے اپنے خاندان سے باہر مولانا حسین احمد محدث ملیح آبادی، اور مرزا حسن علی مرحوم محدث لکھنوی (تلامذۂ مولانا شاہ عبدالعزیز دہلوی) سے پڑھیں، اور پھر اپنے استادوں کے ساتھ مل کر حدیث کی تمام کتابیں شیخ محمد محسن انصاری سے اس طرح پڑھیں کہ وہ قرأت کرتے تھے، اور بہت سے علما سماعت کرتے تھے ۱۲۵۴ھ میں فراغت حاصل کی،

مولانا شاہ عبدالرزاق مرحوم کے دونوں صاحبزادوں، مولانا عبدالباسط اور مولانا حافظ عبدالوہاب نے اپنے والد ماجد سے حدیث پڑھی،[۵۲]

---

۵۱ تفصیل کے لئے دیکھو اغصان اربعہ ص ۱۰ و مابعد ۵۲ ایضاً ص ۱۱۰

مولانا عبدالحلیم | علماے فرنگی محل میں علم حدیث کے درس و تدریس کا باقاعدہ نظام مولانا عبدالحلیم (والد بزرگوار مولانا عبدالحئی) کے زمانہ سے شروع ہوا، مولانا عبدالحلیم نے مفتی محمد یوسف مرحوم اور دیگر علماے فرنگی محل سے علوم درسیہ کی تکمیل کی ۱۲۶۱ھ میں نواب ذوالفقار بہادر رئیس باندا (بندیل کھنڈ) کے مدرسہ میں مدرس ہوئے، پھر اپنے استاذ مفتی محمد یوسف صاحب مرحوم فرنگی محل کی جگہ پر جونپور کے مدرسہ امامیہ حنفیہ کے مدرس ہوئے، ۱۲۷۷ھ میں نواب سالار جنگ کی طلب پر حیدرآباد گئے، اور وہاں کے مدرسہ نظامیہ کے مدرس ہوئے، ۱۲۷۹ھ میں حرمین محترمین کی زیارت کے لئے گئے، اور وہاں کے علماء اور شیوخ سے کتب حدیث کی سند حاصل کی جن میں سب سے پہلے امام احمد بن زین دحلان شافعی کا ہے، نیز شیخ محمد جان حنفی، محمد بن محمد العرب الشافعی مدرس مسجد نبوی، اور مولانا شاہ عبدالغنی مجددی وغیرہ سے فیوض و برکات اور اجازت و سند حاصل کی، منطق و فلسفہ و کلام و اصول کے علاوہ حدیث و سیر و فقہ کے مسائل پر رسالے لکھے، مثلاً نور الایمان فی آثار حبیب الرحمٰن، برکات الحرمین، خیر الکلام فی مسائل الصیام، ایقاد المصابیح فی صلوٰۃ التراویح، الاسرار فی تحقیق الدعاء، غایۃ الکلام فی بیان الحلال والحرام، القول الحسن فیما یتعلق بالنوافل والسنن، عمدۃ التحریر فی مسائل اللون واللباس والحریر۔

۱۲۸۵ھ میں وفات پائی[1]

مولانا محمد نعیم صاحب | یہ مولانا بحرالعلوم کے پوتے اور مولانا عبدالحکیم صاحب کے صاحبزادے تھے، اپنے والد ہی سے تعلیم پائی، نہایت متقی و زاہد تھے، اور بزرگان سلف کی زندہ یادگار تھے، تعلیم سے فراغت پاکر عرب گئے، اور وہاں سے سند پائی، حدیث و فقہ کی کتابوں کا درس دیتے تھے، تیرھویں صدی کے اخیر اور چودھویں صدی کے شروع میں درس و افادہ میں

---

[1] تذکرہ علماے ہند صفحہ ۱۱۲، ۱۱۳

مشغول تھے، بہت سے علماء نے ظاہر و باطن میں آپ سے استفادہ کیا، منجملہ اوروں کے مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء بھی تھے۔

مولانا سید عبدالحی صاحب مرحوم مجھ سے بیان فرماتے تھے، کہ مولانا محمد نعیم صاحب کو حدیث کی کتابوں کا اتنا شوق تھا کہ جب امام طحاوی کی شرح معانی الآثار شروع شروع چھپ کر آئی، تو اس کے دام زیادہ تھے، اور مولانا کے پاس روپئے نہ تھے، تو انھوں نے اپنا ایک مملوکہ مکان خاص اس کام کے لیئے بیچا، اور اس کی قیمت میں سے یہ کتاب خرید کر منگوائی رحمہ اللہ تعالیٰ،

مولانا عبدالحی

فرنگی محل میں علم حدیث کی معراج کمال مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عہد میں ہوئی، تعلیم اپنے والد مولانا عبدالحلیم سے پائی تھی، ساتھ ہی دو مرتبہ حجاز جاکر وہاں کے علماء اور شیوخ سے سندیں حاصل کیں، پہلی مرتبہ اپنے والد ماجد کے ساتھ سنہ ۱۲۷۹ھ میں اور دوسری مرتبہ سنہ ۱۲۹۲ھ میں سید احمد دحلان اور شیخ عبدالغنی مجددی دہلوی مہاجر مدینہ سے حاصل کیں، مرحوم نے گو عمر بہت کم پائی سنہ ۱۲۶۴ھ میں پیدا ہوئے، ۱۷ سال کی عمر میں علوم کی تکمیل کی، اور سنہ ۱۳۰۴ھ میں وفات پائی کل چالیس[۴] برس کی عمر ملی، مگر اسی مختصر زمانہ میں مرحوم کے درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور تحقیق و تدقیق کے آوازہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیائے اسلام گونج اٹھی۔ اطراف و دیار سے علم کے طالب آپکے آستانہ پر جمع ہوئے، معقول و منقول کا یہ مجمع البحرین زندگی کے آخری لمحہ تک موجیں مارتا رہا، دوسرے علوم و فنون کے ساتھ تمام کتب حدیث کا درس بکمال تحقیق آپ کی درسگاہ میں ہوتا تھا، پورب اور بہار کے طلبہ زیادہ تر اس فیض سے سیراب ہوئے۔ حدیث اور متعلقات حدیث کی متعدد کتابیں اپنے مقدمہ و تحشیہ کے ساتھ شائع کیں۔ حدیث اور فقہ حنفی کی جامعیت کے ساتھ معمولی رسالے لکھے،

یہ وہ زمانہ تھا جب ہر طرف ملک میں ایک نئے مسلک عدم تقلید کا چرچا تھا، اور ملک

میں جگہ جگہ علم حدیث کے حلقہ ہائے درس قائم تھے، بھوپال اور دہلی میں علمائے اہلحدیث کا مجمع تھا، رسالوں پر رسالے نکل رہے تھے، ادھر لکھنؤ میں اُن کے مقابلہ میں مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کی ہستی تھی، نواب صدیق حسن خاں مرحوم اس زمانہ میں اہل حدیث کے امام اور مولانا عبدالحی احناف کے سرگروہ تھے، طرفین نے خوب خوب دادِ تحقیق دی،

متونِ کتب میں سے مولانا نے مسند امام ابوحنیفہ، موطا امام محمد، کتاب الآثار امام محمد پر مقدمہ اور حاشیہ لکھا، اور ان کو چھپوا کر شائع کیا، متعلقات حدیث میں سے موضوعات سیوطی المقاصد الحسنہ امام سخاوی اور فتح المغیث فی اصول الحدیث اور میزان الاعتدال وغیرہ کتابیں اُن کے اشارہ سے اُن کے متوسلین اور تلامذہ نے شائع کیں،

کتابوں کے تحشیہ اور اشاعت میں مولانا کو جو اہتمام تھا، اس میں دو باتیں خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں، سب سے پہلی بات مقدمہ نگاری کی ایجاد ہے، مولانا سے پہلے کسی شارح یا محشی نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی، یورپ میں قلمی کتابوں کو اڈٹ کرنے کی جو اہمیت حاصل ہے، اور جس طرح وہ مختلف نسخوں کی فراہمی، مقابلہ اور تصحیح، اور ساتھ ہی مصنف اور تصنیف کے متعلق ہر قسم کے معلومات مقدمہ میں فراہم کرتے ہیں، مولانا نے علمائے یورپ کے طریق کار کے علم سے پہلے ہی اس اہم کام کی طرف توجہ کی، اور بالکل اسی طریق پر بلکہ اس سے بہتر طریقہ پر اس کام کو انجام دیا، جس کتاب کو شائع کیا، اس کے مختلف نسخوں کو فراہم اور ان کا مقابلہ کرکے ایک صحیح نسخہ ترتیب دیا، پھر اس پر حواشی لکھے، شروع میں ایک مقدمہ لکھا جس میں [illegible] شارح اور اس کے دیگر شارحین کے حالات لکھے، اس کی کتاب اور اس فن کی [illegible] کے حالات ذکر کیے، نفسِ اُس فن کی جس میں یہ کتاب [illegible] تاریخ لکھی،

دوسری قابلِ ذکر بات کتابوں کی صحت ہے، حیرت ہوتی ہے کہ عربی کی ضخیم کتابیں اور اُن پر باریک حاشیے، اور اُن کی تصحیح اس طرح کی جاتی تھی، کہ اگر یہ دعویٰ کیا جائے، تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اُن کی خاص شائع کردہ کتابوں میں ایک نقطہ کی بھی غلطی نہیں ہے، آج جب کہ مطابع اور کتابوں کی چھپائی اور اشاعت کا یہ عالم، اور اس قدر اہتمام ہے، تاہم وہ صحت اردو کی کتابوں میں بھی نہیں ہوتی،

صحت کے معاملہ میں مولانا کے ساتھ غالباً اُن کے معتقد مولانا خادم حسین صاحب عظیم آبادی اور مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کے اہتمام کو بھی دخل تھا،

مولانا کے تلامذہ میں اس فن کے بڑے بڑے ماہرین پیدا ہوئے جن میں قابلِ ذکر مولانا ظہیر احسن شوق نیموی صاحب آثار السنن، مولوی حکیم عبدالباری صاحب عظیم آبادی مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی مولانا قادر بخش سہسرامی، حافظ احمد محدث مولانا عبدالغفور صاحب مظاہری بہاری، مولانا عبدالکریم پنجابی، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری وغیرہ وہ علماء کبار ہیں جنھوں نے ملک کے ہر گوشہ میں پہنچ کر علم و فن کی خدمت کی، میرے علم میں اس وقت مولانا کے وسیع حلقۂ تلامذہ سے صرف دو بزرگوار پچھلی بزم کی شمع یادگار ہیں، مولانا ابوالفضل محمد حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلیٰ دار العلوم ندوۃ العلماء اور مولانا شاہ محمد سلیمان صاحب قادری چشتی پھلواروی، اور کیونکر کہوں کہ اس سرگشتۂ وادیِ جہالت کو بھی، بیک واسطہ (استاذنا مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب کے واسطہ سے) اس بزمِ اقدس کی صفِ نعال میں جگہ حاصل ہے،

مولینا عبدالباری صاحب مرحوم

سب سے آخر میں فرنگی محل کے علم و فضل کا دائرہ جناب مولانا عبدالباری کے نقطۂ کمال میں سمٹ کر آگیا تھا، مرحوم نے فرنگی محل میں جناب مولانا ... صاحب شاگرد مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی سے کتابیں پڑھیں، ... اور اس کے بعد حرمین جا کر علم حدیث کی تکمیل کی

اور مدینہ منورہ میں قیام فرماکر شاہ عبدالغنی مجددی کے تلامذہ میں سید محمد علی اثری اور شیخ رحمت اللہ سے سندیں حاصل کیں، مرحوم کو دراصل فقہ حنفی کے ساتھ والہانہ شغف تھا، اور اس کی نادر خفی اماموں کی اصل کتابوں کا بڑا شوق تھا، اور ساتھ ہی ایسی حدیثوں کی بھی اُن کو بڑی تلاش رہتی تھی جن سے کسی حنفی مسلک کی تائید ہوتی ہو، مولانا کے یہاں جب جانا ہوتا، اور ملنا ہوتا، تو ان عنوانات پر گفتگو ضرور ہوتی، حدیث و فقہ کی نادر قلمی کتابوں کی بہم رسانی کا بھی انھیں شوق تھا، امام محمد کی سیر کبیر کا نسخہ جمع کرایا تھا، آثار امام محمد کے رجال کی تحقیق پر رسالہ لکھا، احادیث متواترہ کیجا کیے، ایک فن کی سینہ بسینہ روایات کا خاندانی مجموعہ بھی چھاپا، امام ابن ابی شیبہ نے مصنف میں ایک خاص باب امام ابو حنیفہ کے رد میں لکھا ہے، جو ایک رسالہ کی صورت میں چھپ بھی گیا ہے، مولانا نے ابن ابی شیبہ کے اس رد کا جواب لکھا، جو چھپ گیا ہے اور بھی چند چھوٹے چھوٹے مختصر رسالے اس فن میں انھوں نے لکھے ہیں، جن میں سے ایک مجموعہ گیارہ رسالوں پر مشتمل ہے،

۱۳۴۵ھ میں وفات پائی۔

(معارف اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۶ء)

ہندوستان میں علمِ حدیث کی تاریخ

کے

چند گم شدہ اوراق

معارف میں "ہندوستان میں علم حدیث" کے عنوان سے مضامین کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، الحمدللہ کہ اوس سے توقع سے زیادہ لوگوں نے دلچسپی لی، علماء اور تعلیم یافتہ دونوں جماعتوں نے اس کو پسند کیا، اور اُس کی تکمیل و تصحیح میں حصہ لیا، بیرونِ ہندوستان تک سے اس کی مزید تکمیل کی فرمایش جاری ہے،

چونکہ یہ ایک ایسا مضمون تھا جس کے معلومات اب تک کہیں یکجا نہ تھے، اور نہ کسی مصنف و مورخ نے اُس کی طرف توجہ کی تھی، مجھے خود اس کی وسعت کا اتنا علم نہ تھا، مگر جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا، راستہ اور کشادہ اور فراخ معلوم ہوتا گیا، تاہم چونکہ راستہ دیکھا نہ تھا اور نہ کسی اگلے رہرو کے نقشِ قدم کے وہاں نشان تھے، اس لئے ادھر ادھر بھٹکنا ناگزیر تھا، سلسلۂ مضمون میں قدم قدم پر تحقیق کی لغزشیں تھیں، مگر خوشی کی بات ہے کہ چند اہلِ ذوق بھی ہم سفر مل گئے، اور اُن کے ٹوکنے سے غلط روی کی اصلاح ہوتی گئی،

ہندوستان میں علم حدیث کی ابتدائی تاریخ کے سراغ لگانے میں جو کوشش آغاز مضمون

میں کی گئی تھیں، مزید تلاش سے اس کے چند نئے اوراق بھی ہاتھ آئے،

ناظرین کو یاد ہوگا کہ اس سلسلہ میں یہ خصوصیت کے ساتھ دکھایا گیا ہے، کہ اہل عرب کو علم حدیث اور اس کی اشاعت کے ساتھ خاص شغف رہا ہے، اس لئے جہاں ان کے فتوحات کا قدم پہنچا، وہیں قرآن پاک کے بعد علم حدیث کی درس گاہ بھی قائم ہوگئی، ہندوستان کا سب سے پہلا حصہ جو عرب فتوحات کے دائرہ میں داخل ہوا، وہ سندھ تھا، جس کا سنہ ۹۶ھ سے تقریباً سنہ ۲۵۰ھ تک براہ راست دمشق و بغداد کی خلافت سے تعلق قائم رہا، اور پھر وہاں کے دو شہروں منصورہ و دیبل میں دو مقامی اسلامی ریاستیں قائم ہوئیں، منصورہ کی اسلامی ریاست محمود غزنوی کے حملۂ سندھ تک (سنہ ۴۱۶ھ تک) قائم رہی؛ اور اس کے بعد دیبل کی اسلامی ریاست سنہ ۷۵۲ھ تک یعنی فیروز شاہ خلجی کے زمانہ تک باقی رہی، گو اس کے بعد بھی وہ ۹۲۷ھ تک قائم رہی، گو خود مختار نہ رہی، بہر حال اس سے اندازہ ہوگا کہ پہلی صدی ہجری کے آخر سے اس وقت تک جب تک درۂ خیبر سے آنے والی قوموں نے آکر ان کو بے دخل نہیں کر دیا، وہ اس سرزمین میں اسلام اور اسلامی علوم کے حافظ و نگہبان رہیں؛

قاضی ابو سعید عبد الکریم سمعانی سنہ ۵۰۶ھ میں مرو (ترکستان) میں پیدا ہوئے، اور وہیں سنہ ۵۶۲ھ میں وفات پائی، علم حدیث کی طلب میں تمام دنیائے اسلام کی خاک چھانی، اور ہر جگہ جاکر چار ہزار استادوں سے اس فن کو حاصل کیا، ماوراء النہر اور خراسان سے بار ہا گذرے، اور ان کے علاوہ عراق، شام اور عرب تک چکر لگایا، اور ہر گوشہ سے فیوض و برکات کا سرچشمہ جمع کیا، ان کی مشہور کتاب کتاب الانساب ہے جو سنہ ۱۹۱۲ء میں گب میموریل سیریز کے سلسلہ میں عکس سے چھاپی گئی ہے، اس کتاب میں شہروں، قبیلوں اور پیشوں کی نسبتوں سے جو لوگ مشہور ہوئے ان کے حالات ہیں، اس ضمن میں چھٹی صدی ہجری تک کے اکثر شہروں کے باکمالوں کے تذکرے ہیں، منجملہ ان کے

ہندوستان بھی ہے،

ہندوستان کے شہروں میں سے سندھ، منصورہ، دیبل، اور لاہور کے نام اس میں ملتے ہیں، دہلی کا نام اس لئے نظر نہیں آتا کہ اس زمانہ تک (۵۶۲ھ) دہلی اسلام کے دائرہ حکومت میں نہیں آئی تھی،

سندھی اس نسبت سے جن دو ابتدائی بزرگوں کے نام اس میں لکھے ہیں یعنی ابو معشر نجیح المتوفی ۱۷۰ھ اور رجا سندھی، المتوفی ۲۲۱ھ کے نام پہلے گذر چکے ہیں، البتہ رجا سندھی کی اولادوں کا ذکر رہ گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں مدت تک علم حدیث کا چرچا رہا، ابو عبداللہ محمد بن رجا، اور ابو بکر محمد بن محمد بن رجا مشہور گذرے ہیں، ابو عبداللہ نضر بن شمیل کی ابن ابراہیم بن علی دہلی، اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ کے اور ابو بکر ابراہیم بن محمد شافعی اسحاق بن ابراہیم کے شاگرد تھے، بغداد اور مکہ میں درس دیتے تھے،

(۲) ابونصر فتح بن عبداللہ سندھی فقیہ متکلم اور محدث تھے، حسن بن سفیان وغیرہ کے حلقوں میں بیٹھے تھے، ہمدان اور قزوین میں قاضی رہے،

(۳) احمد بن سندھی بن فروخ بغداد جاکر رہے، ابراہیم دورقی سے روایت کی،

(۴) احمد بن سندھی بن حسن بھی بغداد ہی میں سکونت پذیر تھے ثقہ، صدوق اور فاضل تھے[1]

۳۷۵ھ یعنی سلطان محمود کے فتوحات سے بیس پچیس برس پہلے یہاں بیت المقدس کا عرب سیاح عالم ابوالقاسم مقدسی آیا تھا، آپ تعجب سے سنیں گے کہ وہ سندھ کے اسلامی فرقوں کے ذکر میں کہتا ہو

---

[1] کتاب الانساب سمعانی صفحہ ۳۱۶

واکثرھم اصحاب حدیث[1] ، اور اُن میں زیادہ تر اہلِ حدیث ہیں،

پھر کہتا ہے کہ یہاں کے بڑے شہر (قصبات) حنفی فقہا سے خالی نہیں ہیں، لیکن کوئی مالکی یا حنبلی نہیں[2]،

منصوری | یہ منصورہ کی طرف نسبت ہے، عربوں کے زمانہ میں یہ دوسری صدی ہجری کے شروع میں آباد ہوا، اہلِ ہند اس کو بھکر کہتے ہیں، اور اسی نام سے ہندوستان کی تاریخوں میں اس کی شہرت ہے، ۴۱۶ھ تک یہ عرب ریاست تھی اس کے بعد سلطان محمود نے اس کو فتح کیا، عرب ریاست کے زمانہ میں یہاں علم حدیث کا خاصہ چرچا تھا،

اہلِ حدیث میں ایک فرقہ ظاہریہ کہلاتا ہے، اس کے بانی امام داؤد بن علی اصفہانی المتوفی ۲۷۰ھ ہیں، یہ ہر قسم کے قیاس کے قطعاً منکر تھے، اور آیات و احادیث کے صرف ظاہری معنی پر اکتفا کرتے تھے، اس لئے ظاہری کہلائے، داؤد ظاہری کے انتقال کے سو برس بعد ابو القاسم مقدسی سندھ آیا تھا، وہ کہتا ہے کہ یہاں داؤدی مذہب کے محدثین موجود ہیں، منجملہ اُن کے وہ منصورہ کے قاضی ابو محمد کا ذکر کرتا ہے، جن سے وہ ملا تھا، وہ داؤدی تھے، اور اپنے مذہب کے امام تھے، ان کا درس قائم تھا، اور اُن کی چند عمدہ تصنیفات تھیں[3]، اس لحاظ سے قاضی صاحب کا زمانہ چوتھی صدی کا آخر ہوگا،

منصورہ میں ایک دوسرے محدث قاضی ابو العباس احمد بن محمد منصوری کا ذکر سمعانی نے کیا ہے، یہ بھی داؤدی مذہب کے امام تھے، عراق و فارس میں رہتے تھے، مشہور محدث اثرم کے درس میں بیٹھے تھے، اور ابو عبد اللہ حاکم المتوفی ۴۰۵ھ اُن کے شاگرد تھے[4]، اس

---

[1] احسن التقاسیم صفحہ ۴۸۰ [2] ایضاً [3] ایضاً

[4] کتاب الانساب ورق ۵۴۳-۵۴۴-

حساب سے یہ بھی چوتھی صدی کے آخر کے ہوں گے ۔

ابو محمد عبد اللہ بن جعفر بن منصوری، حسن بن مکرم سے انھوں نے اور ان سے حاکم نے روایتیں کی ہیں[۱]۔ ان کا زمانہ بھی چوتھی صدی کا آخر سمجھنا چاہئے ۔

قاضی ابو العباس احمد بن محمد بن صالح تمیمی منصوری کا ذکر بھی سمعانی نے کیا ہے ۔ یہ عراق جاکر رہے تھے ۔ انھوں نے فارس میں ابو العباس بن اثرم سے اور بصرہ میں ابو روق ہزانی سے حدیثیں سنی تھیں ، حافظ سمعانی کہتے ہیں کہ میں نے فارس میں اُن سے زیادہ لطیف مزاج کسی کو نہیں دیکھا ۔ تو گویا یہ سمعانی کے ہم عصر تھے ، یعنی چھٹی صدی ہجری کے بیچ میں تھے[۲]۔

دیبل | یہ سندھ کا مشہور بندرگاہ تھا ، یہاں سے عراق کو جہازات آیا جایا کرتے تھے ، اسی شہر کا نام بعد کو ٹھٹھہ مشہور ہوا ، یہاں بھی جیسا کہ پہلے گذرا ، ایک اسلامی ریاست قائم تھی ۔ یہاں بڑے بڑے محدثین پیدا ہوئے ، جن میں سے سمعانی نے ان چند لوگوں کے نام لئے ہیں ۔

۱- ابو جعفر محمد بن ابراہیم بن عبد اللہ دیبلی یہ مکہ معظمہ جاکر رہے تھے ، یہ امام ابن عینیہ کی کتاب التفسیر کے ابو عبید اللہ سعید بن عبد الرحمان مخزومی کے واسطہ سے اور امام عبد اللہ بن مبارک کی کتاب البر والصلۃ کے ابو عبد اللہ حسین بن حسن مروزی کے واسطہ سے راوی ہیں ، اور عبد الحمید بن صبیح سے بھی یہ روایت کرتے ہیں ، اور ان سے ابو الحسن احمد بن ابراہیم بن فراس مکی اور ابو بکر محمد بن ابراہیم بن علی روایت کرتے ہیں[۳]۔

۲- ابراہیم بن محمد ابراہیم دیبلی ، یہ ابو جعفر محمد دیبلی کے جن کا نام اوپر گذرا بیٹے تھے ۔ یہ موسیٰ بن ہارون اور محمد بن علی الصائغ سے روایت کیا کرتے ہیں[۴]۔

---

[۱] کتاب الانساب ورق ۲۴۴ ۔ [۲] ایضاً [۳] ایضاً ، ورق ۲۳۶ ،
[۴] " " " ۲۳۶ ؛

۳ - ابو القاسم شعیب بن محمد بن احمد دیبلی، ابو قطعان دیبلی کے نام سے ان کو شہرت ہے، یہ مصر گئے تھے، اور وہیں حدیث کا حلقۂ درس قائم کیا تھا، ابو سعید بن یونس اُن کے شاگرد تھے[1]

۴ - علی بن موسیٰ دیبلی محدّث تھے،

۵ - خلف بن محمد دیبلی، یہ علی بن موسیٰ دیبلی کے شاگرد تھے، بغداد جا کر رہے[2]، اور بہت سے شاگرد پیدا کئے،

۶ - ابو العباس احمد بن عبد اللہ بن سعید دیبلی، اپنے زمانہ میں مشہور محدّث تھے، محمد بن ابراہیم دیبلی کے شاگرد تھے، اس کے علاوہ نیشاپور میں محمد بن اسحاق ابن خزیمہ سے، بصرہ میں قاضی ابو خلیفہ سے، بغداد میں جعفر بن محمد فریابی سے، اور مکہ میں فضل بن محمد جندی، اور محمد بن ابراہیم دیبلی سے، اور مصر میں علی بن عبد الرحمن سے، اور دمشق میں ابو الحسن احمد بن عمیر سے اور بیروت میں ابو عبد الرحمن مکحول سے، اور نجران میں ابو عروبہ حسین بن ابی معشر سے اور تستر میں احمد بن زہیر تستری سے، اور عسکر مکرم میں عبدان بن احمد سے اور نیشاپور میں ابو بکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ سے حدیثیں سنیں[3]، غور کرو کہ کبھی ہندوستانی محدّث کا یہ ذوق و شوق تھا کہ طلب علم کی راہ میں نیشاپور، تستر، عسکر مکرم، بصرہ، بغداد، دمشق، بیروت، اور مکۂ معظمہ کی خاک چھانتے پھرتے تھے،

یہ ابو العباس احمد دیبلی، اس شان کے بزرگ تھے، کہ امام حاکم نے ان کے آگے زانوے ادب تہ کیا، سمعانی نے حاکم سے اُن کی وفات کا سال ۳۴۳ھ نقل کیا ہے[4]، اور اسی سے دوسرے بزرگوں کے سنین بھی معلوم ہوتے ہیں، محمد بن ابراہیم دیبلی اُن کے استاد تھے، اس لئے ان کا زمانہ چوتھی صدی ہجری کا اوائل ہوگا، اور ابراہیم بن محمد دیبلی چونکہ اُن کے بیٹے تھے، اس لئے یہ

---

[1] کتاب الانساب ورق ۲۳۷۔ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً،

چوتھی صدی کے بیچ میں ہوں گے، بقیہ بزرگوار بھی چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے معلوم ہوتے ہیں :-

لاہور | لاہور کو سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۶ھ میں فتح کیا، سمعانی کہتے ہیں، کہ ہندوستان کے شہروں میں ایک بابرکت (کثیرۃ الخیر) شہر ہے، اس کو لوہور اور لاہور کہتے ہیں، یہاں بہت سے علما پیدا ہوئے[1] یہ شہادت ایک ایسے شخص کی ہے جو ۵۶۲ھ میں وفات پاچکا تھا، یعنی یہ وہ زمانہ ہے جب غزنوی سلطنت کا خاتمہ ہو رہا تھا، اور غوریوں کی حکومت کا آفتاب طلوع ہو رہا تھا،

سمعانی نے علمائے لاہور میں سے حسب ذیل بزرگوں کے نام لئے ہیں،

۱- ابوالحسن علی بن عمر بن حکم لاہوری، ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ محدث تھے، بہت سی حدیثیں زبانی یاد تھیں، حافظ ابو علی منظفر بن الیاس بن سعید سعیدی کے شاگرد تھے، اُن بغداد تک اُن کا فیض عام تھا، امام سمعانی نے لکھا ہے، کہ میں خود اُن سے نہیں ملا، مگر حافظ ابوالفضل محمد بن ناصر سلامی بغدادی کے واسطہ سے اُن کا شاگرد ہوں، ۵۲۹ھ میں لاہور میں وفات پائی،[2]

۲- ابوالفتوح عبدالصمد بن عبدالرحمٰن الاشنہی لاہوری، یہ شیخ ابوالحسن علی لاہوری کے شاگرد تھے، سمرقند میں یہ درس دیتے تھے، اور وہیں امام سمعانی نے ان سے شیخ ابوالحسن علی کی روایتیں سنیں،[3] اس لئے اُن کا زمانہ چھٹی صدی کا بیچ سمجھنا چاہئے،

۳- ابوالقاسم محمود بن خلف لاہوری فقیہ و مناظر و محدث تھے، امام ابوسعید عبدالکریم

---

[1] کتاب الانساب ورق ۲۳۰، [2] ایضاً،

[3] " " " ،

(صاحب کتاب الانساب) کے دادا امام ابوالمظفر سمعانی کے شاگرد تھے، اور امام ابوسعید سمعانی نے اُن سے اسفرائن میں کچھ روایتیں سُنی تھیں، وہیں انھوں نے سکونت اختیار کر لی تھی، سنہ ۵۴۰ھ کے قریب وفات پائی۔[1]

ہندی | یعنی کسی خاص شہر کی نسبت کے بغیر نفس ہندوستان کی نسبت سے چھٹی صدی ہجری کے وسط تک بہت سے اہلِ علم پیدا ہوئے، سمعانی کہتے ہیں، منسوب الی بلاد الھند وفیھم کثرۃ وشھرۃ ان میں سے صرف دو صاحبوں کا ذکر کیا ہے جن کے نام ایک ہی، صرف کنیتیں دو ہیں (اور یہ دونوں ہندی غلام بن کر، امام بنے تھے، دونوں عبدالکریم سمعانی کے اُستاد اور شیخ تھے۔

۱۔ ابوالحسن بختیار بن عبداللہ محدث اور صوفی تھے، قاضی محمد بن اسماعیل یعقوبی (باشندۂ بوشنگ) کے آزاد کردہ غلام تھے۔ اپنے آقا کے ساتھ عراق، حجاز، اھواز، بغداد، بصرہ، اصبہان، کوہستان اور خوزستان کا سفر کیا تھا، اور اُن میں سے ہر جگہ کے محدثین سے فیض پایا تھا، سمعانی نے قوشنج اور ہرات میں اُن سے حدیث پڑھی، سنہ ۵۴۳ھ میں وفات پائی۔[2]

۲۔ ابو محمد بختیار بن عبداللہ، یہ سمعانی کے والد ابوبکر محمد سمعانی کے آزاد کردہ ہندی غلام تھے، اپنے آقا کے ساتھ عراق و حجاز کا سفر کیا تھا، اور خود اپنے آقا سے بہت سی حدیثیں سُنی تھیں، اُن کے علاوہ بغداد میں بڑے بڑے محدثین سے علم کا فیض پایا تھا، مرو میں سکونت اختیار کر لی تھی، اور یہیں صفر سنہ ۵۴۱ھ میں وفات پائی۔[3]

اللہ اکبر! کیا زمانہ تھا کہ جہاز اور ریل کے بغیر ہندوستان سے ترکستان، ایران

۱؎ کتاب الانساب ورق ۴۵۷، ۲؎ ایضاً ورق ۵۹۳،
۳؎ ایضاً " " ۵۹۳

خراسان، عراق، حجاز، شام، اور مصر تک کی خاک علم کی تلاش و جستجو میں چھانتے پھرتے تھے، پھر نومسلم غلاموں کی قسمت پر آج کے خاندانی مسلمان آقا رشک کریں، کہ اسلام کے غلام بن کر وہ کیا رتبہ پاتے تھے،

معارف

(اکتوبر ۱۹۲۹ء)

ہندوستان میں کتب حدیث کی نایابی

کے

بعض واقعات

ہندوستان میں حدیث کی کتابوں کی جو نایابی تھی اس کا اندازہ گذشتہ واقعات سے کسی قدر ہوگا نویں صدی ہجری تک صرف مشارق الانوار کا نسخہ ہندوستان میں نظر آتا ہے، سب سے پہلی دفعہ محمد تغلق کے عہد میں ہم کو یہ آواز سنائی دیتی ہے، کہ شمس الدین ترک، مصر سے حدیث کی تین سو ۳۰۰ کتابیں لیکر ملتان تک اس غرض سے آئے تھے کہ ہندوستان میں مذہب حدیث رائج کریں، مگر بادشاہ کا حال سن کر وہ ملتان ہی سے واپس چلے گئے، معلوم نہیں حدیث کی یہ تین سو کتابیں کیا تھیں، اس واقعہ کا راوی ضیاء برنی ہے، جو اس عہد کا مشہور مورخ ہے، مگر ظاہر ہے کہ متن حدیث کی اتنی کتابیں تو نہیں ہو سکتیں، شروح حدیث اور رجال کی کتابیں ملا کر بھی یہ تعداد پوری ہونی مشکل ہے، بہرحال جو بھی ہو، اس واقعہ کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اتنا بیش قیمت سرمایہ آکر ہندوستان سے واپس چلا گیا،

محمد تغلق المتوفی ۷۵۲ھ جس کے براہ راست تعلقات مصر کی عباسی خلافت سے تھے،

اور اس کی طرف سے اس کو حکومت کا فرمان اور خلعت اور علم بھی ملتا تھا، اور خلیفہ عباسی سے اُس نے بیعت بھی کی تھی، اس کا قاعدہ تھا کہ جب لوگوں سے بیعت لیتا تھا تو مصر کے خلیفہ عباسی کے فرمان کے ساتھ ساتھ قرآن پاک اور مشارق الانوار کا نسخہ سامنے رکھ لیتا تھا[۵۱] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک ہندوستان میں قرآن پاک کے بعد احادیث میں صرف مشارق الانوار کا وجود تھا، جب شاہی کتب خانہ کا یہ حال تھا تو عام لوگوں کی دسترس کا کیا پوچھنا ہے،

الغرض شیخ عبدالحق محدث سے پہلے صرف مشارق الانوار للصاغانی اللاہوری المتوفی ۶۵۰ھ کے نسخے اور کہیں کہیں مصابیح (اصل مشکوٰۃ) للبغوی المتوفی ۵۱۶ھ کے نسخے دستیاب ہوتے تھے، اور یہی دو کتابیں یہاں کے علما کے درس میں تھیں، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ عرب سے کم سے کم مشکوٰۃ، موطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے نسخے لائے، اور اُن کو درس میں داخل کیا، اس کے بعد ان کا اور اُن کے سلسلہ کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ان کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا، اور فارسی میں اُن کی شرحیں لکھیں،

بہرحال شیخ عبدالحق کے ذریعہ مشکوٰۃ کے نسخے حجم کے کم ہونے کی وجہ سے عام ہو گئے اور بخاری کا نام اور حوالہ بھی کتابوں میں آنے لگا، تاہم مخصوص خاندانوں کے سوا صحیح بخاری کا نسخہ عام طور سے نہیں ملتا تھا،

سلاطینِ تیموریہ کے کتب خانے اپنی کتابوں کی تعداد، ندرت اور جامعیت کے لحاظ سے عجائب روزگار تھے، اُن کی تباہی کے بعد اُن کی کتابیں ہندوستان اور یورپ میں منتشر اور پراگندہ ہو گئیں، اور آج بھی کثرت کے ساتھ یہ کتابیں کتب خانوں میں اور کتب فروشوں کے پاس ملتی ہیں، ان میں تفسیر، فقہ، اصول، تصوف، کلام، فلسفہ، ریاضیات، ادب، دواوین

---

۵۱ تاریخ فرشتہ ذکر محمد تغلق

تاریخ ہر فن کی کتابیں ملتی ہیں، مگر حدیث کا کوئی نسخہ ان میں سے برآمد نہیں ہوا، میں نے اس نظر سے خاص طور سے یورپ اور ہندوستان کی مطبوعہ فہرستیں دیکھی ہیں،

لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ دہلی کے حدود سلطنت سے باہر جو مستقل اسلامی حکومتیں اطراف ہند میں قائم تھیں، ان میں جن کا تعلق عرب سے تھا، وہاں کچھ نہ کچھ سراغ کتب حدیث کا ملتا ہے، اس سلسلہ میں صحیح بخاری کا وہ نسخہ ہے جو بنگال کی سلطنت سادات کی تنہا یادگار ہے، دسویں صدی ہجری کے شروع میں بنگال میں عرب سادات کی حکومت قائم تھی، جس کا ایک سربرآرا علاء الدین شاہ حسین بن سید اشرف الحسینی تھا، اس کا زمانہ ۹۰۵ھ سے ۹۲۷ھ تک ہے، محمد بن یزدان بخش معروف بہ خواجگی شروانی ایک عالم تھے، انھوں نے اپنے ہاتھ سے صحیح بخاری کا ایک نہایت عمدہ نسخہ تین جلدوں میں تیار کیا تھا، اور اس کو سلطان مذکور کی خدمت میں پیش کیا تھا، یہ کمل نسخہ بانکی پور پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں موجود ہے، اس نسخہ کی تیسری جلد کے اخیر میں خواجگی شروانی کے ہاتھ کی ایک تحریر ہے جس میں اس نسخہ کا پورا حال لکھا ہے اور اور سلطان مذکور کے سامنے اس نسخہ کے پیش کرنے کا ذکر کیا ہے، یہ واقعات عربی میں ایسی عمدہ اور فصیح و بلیغ عبارت میں لکھے ہیں کہ یقین ہوتا ہے کہ وہ عربی کے بہت بڑے ادیب تھے، یہ عبارت کتب خانۂ مذکور کی فہرست کی پانچویں جلد کے ص ۱۰ میں نقل کر دی گئی ہے:

یہ نسخہ پنڈالہ میں لکھا گیا تھا، جو اس زمانہ میں بنگال کا دار السلطنت تھا،

اسی طرح فتح الباری شرح صحیح بخاری کا نسخہ کم از کم احمد آباد گجرات میں بہت پہلے پہنچ گیا تھا، حافظ ابن حجر نے اپنی یہ تالیف ۸۴۲ھ میں ختم کی، اور ۸۵۲ھ میں وفات پائی، پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں فتح الباری کی تیسری جلد کا ایک ایسا نسخہ ہے جس پر سلطان ابراہیم والی بیجا نگر کی مہر ہے، سلطان ابراہیم کا زمانہ ۹۸۸ھ سے ۱۰۳۵ھ تک ہے، یعنی حافظ ابن حجر کی وفات

کے سو ڈیڑھ سو برس بعد یہ نسخہ ہندوستان پہونچ گیا تھا، اس پر بعد کے زمانہ میں عالمگیر کے ایک امیر قابل خاں کی مہر ہے،

کتب حدیث میں سے شمائل ترمذی کا نسخہ اکبری دور میں غالباً ہندوستان پہونچ چکا تھا، ملا عبد النبی صدر الصدور اور ملا یعقوب صرفی کشمیری عرب سے حدیث پڑھ کر آئے تھے، شاید یہی دونوں اس کو لائے ہوں گے، کیونکہ ملا عبد النبی نے اس شمائل کا گویا ایک خلاصہ کیا ہے جس کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین میں ہے، نیز ملا یعقوب صرفی کے بیٹے ملا کبیر حسن کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہمارے فاضل دوست مولوی حکیم حبیب الرحمٰن صاحب (ڈھاکہ) کے پاس ہے، یہ ۵۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اور جا بجا اس پر کاتب کے حواشی ہیں، حکیم صاحب ممدوح کے پاس ایک اور عجیب نادر چیز ہے، آج تک شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے علمی خانوادہ کا آغاز انہی کی ذات سے کیا جاتا تھا، مگر حکیم صاحب کے پاس ایک دستاویز ایسی ہے جو اس آغاز کو ایک پشت اوپر تک لیجاتی ہے، یعنی علامہ ذہبی کی الکاشف جو اسماء الرجال کی ایک کتاب ہے، اس کا ایک نسخہ حکیم صاحب کی ملکیت میں ہے، جس کے پہلے صفحہ پر مولانا عبد الحق محدث دہلوی کے والد ماجد مولانا سیف الدین ترک کے قلم کی عبارت تحریر ہے۔

غازیپور کے شرفاء کے ایک پرانے قصبہ سے چند سال ہوئے کہ میرے پاس وہاں کے ایک علمی خاندان کے چند متروکہ تبرکات کی فہرست آئی تھی، اس میں دوسری قلمی کتابوں کے ساتھ احادیث کی بھی چند قلمی کتابوں کی فہرست تھی، جس میں ہر کتاب کے سامنے اس کی خصوصیات بھی درج تھیں، اس میں صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، ابن ماجہ، شمائل ترمذی، مشکوٰۃ المصابیح، کرمانی شرح بخاری، جمع بین الصحیحین حمیدی، حاشیہ مشکوٰۃ شریف علامہ سید شریف جرجانی، شرح حصن حصین ملا علی قاری، تیسیر الوصول فی احادیث الرسول، موطا

امام مالک کے نام لکھے تھے،

صحیح بخاری کی پہلی جلد کے متعلق لکھا تھا، نہایت خوشخط با اعراب، مدینہ منورہ کے چند علما کی سندین اس میں چسپاں ہیں، اور مولانا عبد الباسط صاحب قنوجی؟ کے قلم کا حاشیہ ہے، تاریخ درج نہین لیکن دوسری جلد کی تاریخ کتابت سنہ [illegible]ھ لکھی ہوئی ہے، اور اس کی خصوصیت تھی کہ اس پر مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، شام، خوارزم، اصفہان، اور ماوراء النہر کے علما اور محدثین کے درس وسماعت میں رہ چکنے کی سندین تحریر ہیں،

صحیح مسلم کی نسبت لکھا تھا کہ وہ سنہ [illegible]ھ کی تحریر ہے، نسخہ نہایت پرانا اور خوشخط، شاہی کتبخانہ (کس بادشاہ کے؟) کا ہے،

ترمذی پر تاریخ نہیں دی ہے، مگر لکھا ہے کہ یہ نسخہ نہایت پرانا لکھا ہوا ہے؛

ابن ماجہ کے نسخہ کی نسبت بھی یہی تحریر ہے،

شمائل ترمذی کا نسخہ سنہ [illegible]ھ کا ہے،

مشکوٰۃ المصابیح کا نسخہ سنہ [illegible]ھ کا ہے،

کرمانی شرح بخاری کی تاریخ سنہ [illegible]ھ بتائی گئی ہے، اور لکھا ہے کہ یہ نسخہ مدینہ منورہ میں سنہ تالیف سے صرف پچیس (۲۵) برس بعد کا لکھا ہوا ہے، خوشخط ہے،

جمع بین الصحیحین حمیدی کی کتابت کا سال سنہ ۱۰۹۲ھ ہے؛

حاشیہ مشکوٰۃ، میر سید شریف جرجانی کا زمانہ سنہ [illegible]ھ لکھا تھا،

حصن حصین خوشخط و مطلا سنہ [illegible]ھ کا لکھا ہوا اور اس کی شرح در الثمین ملا علی قاری کا زمانہ سنہ [illegible]ھ مکہ معظمہ کا نسخہ،

تیسیر الوصول کا نسخہ سنہ [illegible]ھ کا بتایا گیا ہے، موطا کا کوئی نسخہ نہ تھا،

بہرحال رفتہ رفتہ عرب سے کتابیں ہندوستان آنے لگیں، اور اس بارۂ خاص میں سب سے پہلے شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور اُن کے بعد مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی فیوض حرمین کا ممنون ہونا چاہئے، مگر اس عہد میں بھی کتبِ حدیث کی جو ندرت تھی، اس کا اندازہ ذیل کے واقعات سے ہو سکتا ہے،

میر عبدالجلیل بلگرامی جو عالمگیر سے محمد شاہ کے عہد تک زندہ تھے، اور ایک زمانہ میں بھکر واقع سندھ میں سرکاری عہدہ دار تھے، وہ اپنے عہدہ سے برطرفی کے بعد بھی چھ مہینے تک وہاں اس لئے پڑے رہے کہ صحیح بخاری کا ایک اچھا سا نسخہ وہاں اُن کو ہاتھ آگیا تھا، اور وہ اس کی نقل لے رہے تھے؛[۵۱]

میر ممدوح کے ایک ہم وطن اور ہمعصر روح الامین خاں بلگرامی پنجاب میں شاہی عہدہ دار تھے، انھوں نے اپنے ہاتھ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم نقل کی؛[۵۲]

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے ایک بلگرامی شاگرد شیخ پیر محمد نے اپنے لئے مولانا ممدوح سے درس لینے کے لئے سنہ ۱۱۵۹ھ میں جامع فیروزی میں بیٹھ کر جو نسخہ نقل کیا تھا وہی نسخہ سنہ ۱۱۸۴ھ میں شاہ عالم بادشاہ کے حکم سے اعراب اور مقابلہ اور تصحیح کے بعد خزانۂ شاہی میں داخل کیا گیا، یہ معتبر نسخہ بھی پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ کی عزت ہے۔ اس نسخہ کے خاتمہ پر یہ تمام اتفاقات مولانا پیر محمد بلگرامی کے قلم سے لکھے ہیں، پھر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دستِ خاص سے اجازہ اور سند مکتوب ہے، اس کے بعد کوئی محمد ناصح نام عالم ہیں اُن کے ہاتھ کی تحریر یہ ہے،

بحمد اللہ و سبحانہ تصحیح و اعراب صحیح بخاری بحکم اقدس حضرت شاہ عالم بادشاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہ در سنہ یکہزار و یک صد و ہشتاد و چہار

---

۵۱ مآثر الکرام آزاد بلگرامی ج اول ص ۲۶۵، ۵۲ ایضاً،

ہجری نیقر محمد ناصح عفی (؟) اللہ از اول کتاب تاآخر از نسخہ مصححہ باتمام رسانید"

سنہ ۱۹۲۴ھ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا جو اجلاس[1] علی گڑھ میں ہوا تھا، اُس میں قلمی کتابوں کی نمایش کا بھی انتظام کیا گیا تھا، اس نمایش میں حدیث کے بعض نادر نسخے فراہم ہوئے تھے، اسلامیہ اسکول اٹاوہ کے کتب خانہ سے مشکوٰۃ کا ایک نسخہ آیا تھا، جو بادشاہ عالمگیر کے مطالعہ میں رہتا تھا، اور ایک نسخہ شمائل ترمذی کا آیا تھا جس کو افراسیاب خاں نے عالمگیر کی خدمت میں بھیجا تھا، بخاری کا ایک پرانا نسخہ ایڈیٹر صاحب پیسہ اخبار لاہور نے بھیجا تھا جس پر اُس کے ایک مالک نے خریداری کا سال سنہ ۱۰۴۲ھ لکھا تھا،

---

[1] رپٹ اجلاس مذکور حصہ دوم ص ۱۰ سنہ ۱۹۲۴ء   (معارف فروری سنہ ۱۹۲۹ء)

رُباعی

فارسی کے اصنافِ سخن میں رُباعی گو چار مصرعوں کی مختصر نظم ہوتی ہے، مگر اس کوزہ میں سمندر بند ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑا فلسفیانہ خیال، دقیق سے دقیق اخلاقی نکتہ اور پیچیدہ سے پیچیدہ صوفیانہ مسئلہ جو صفحوں اور دفتروں میں نہیں سماتا، ان دو سطروں میں پورا کا پورا ادا ہو جاتا ہے۔

وجہ تسمیہ | رُباعی عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی "چار والے" کے ہیں، عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ چونکہ یہ چار مصرعوں سے مرکب ہوتا ہے، اس لئے اس کو رُباعی کہتے ہیں لیکن محمد بن قیس رازی نے جو سعدی کے معاصر ہیں، المعجم فی معاییر اشعار العجم (ص ۹۰) میں یہ لکھا ہے کہ اہل عرب اس کو رُباعی اس لئے کہتے ہیں کہ بحر ہزج جس میں رُباعی کہی جاتی ہے چار اجزا سے مرکب ہوتا ہے، اور اس لئے اس کا ایک مصرع عربی میں دو دو جزو کا ایک شعر ہو جاتا ہے، اور اس طرح چار مصرعوں میں چار شعر ہو جاتے ہیں۔ لیکن دولت شاہ کا بیان اس کی وجہ تسمیہ کے نسبت وہی ہے جو عام خیال ہے، یعنی یہ کہ "[illegible] لفظ دو بیتی را گویند [illegible] گفتند کہ این چہار مصراع است رباعی نام گفتند"

رُباعی کے دوسرے نام | رُباعی کا ابتدائی نام دو بیتی ہے کہ یہ دو ہم قافیہ بیتوں سے مرکب

ہوتی ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ عربی میں اس کو آج تک دوبیتی ہی کہتے ہیں، اور رُباعی
جو عربی نام تھا، اُس نے زبانِ عجم میں فروغ پایا، صاحبِ معجم نے ذرہ ذرہ سے فرق سے
اُس کے حسب ذیل نام بتائے ہیں،

قول: "ہرچہ ازاں جنس، بر ابیاتِ تازی (عربی) سازند، آن را قول خوانند"

غزل: "و ہرچہ بر مقطعاتِ فارسی باشد آن را غزل خوانند"

ترانہ: "اہلِ دانش ملحونات ایں وزن را ترانہ نام کردند"

دوبیتی: "مجرد آن را دوبیتی خوانند، از برائے آنکہ بنائے آن ہر دو بیت بیش نیست

رُباعی: "و مستزاد آن را رباعی خوانند از بہر آنکہ بحرِ ہزج در اشعارِ عرب مربع الاجزا
آمدہ است، پس ہر بیتے ازیں وزن دو بیتِ عربی باشد"

محمد بن قیس رازی کی تصریح کے مطابق اس کا پہلا نام ترانہ[۱] رکھا گیا، اور دوسرے نام
بعد کو رکھے گئے، تذکرۃ دولت شاہ کا بیان ہے کہ پہلے اس کا نام دوبیتی رکھا گیا[۲]، پھر رباعی
دوبیت یا دوبیتی کا لفظ تو عربی میں ہمیشہ کے لئے رہ گیا[۳] مگر فارسی میں چھٹی صدی تک اس
لفظ کا استعمال رباعی کی جگہ نمایاں نظر آتا ہے، محمد بن علی راوندی نے راحۃ الصدور (۵۹۹ھ)
میں ہر جگہ دوبیتی لکھا ہے۔ انوری نے سلطان سنجر کی مدح میں جو رباعیاں لکھی ہیں، اُن کو بھی
دوبیتی کہا ہے[۴]، یہ صحیح نہیں ہے، کہ قدما عربی میں رباعی کو صرف دوبیتی کہتے تھے، رباعی
نہیں کہتے تھے، بلکہ صحیح یہ ہے کہ رباعی بھی کہتے تھے، چنانچہ نشوار المحاضرہ میں جو چوتھی صدی کے وسط کی
مستند عربی تصنیف ہے، رُباعیات کا لفظ موجود ہے، جیسا کہ آگے آئے گا، باخرزی متوفی

---

[۱] معجم فی معائر اشعار العجم ص ۹۰ گب [۲] تذکرۂ دولت شاہ ص ۳۰ گب، [۳] ابن خلکان [۴]
راحۃ الصدور ص ۳۰ و غیرہ

۵۶۸ھ نے بھی خریدۃ القصر میں رباعیات کا لفظ استعمال کیا ہے[1]

رُباعی کی ایجاد رباعی کی ایجاد کی تاریخ نہایت مبہم ہے مگر یہ مسلّم ہے کہ بحر ہزج کا یہ وزن پہلے مستعمل نہ تھا، بعد کو رواج پایا ہے، اس کی ایجاد کی صورت اہلِ ادب یہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ چند لڑکے گولی کھیل رہے تھے، ایک گولی لڑھکتی ہوئی سوراخ کے پاس آئی، اس پر خوشی کے عالم میں ایک لڑکے کے منہ سے بے ساختہ یہ نکلا کہ ع

غلتان غلتاں ہمی رود تا بن گو[2]

شعرا نے اس وزن کو، بحر ہزج کی ایک قسم پاکر اس کو قبول کر لیا، اور تین مصرع اور لگاکر اس کو چو مصرع کر دیا، یہ تو رباعی کی ایجاد کے متعلق قدر مشترک تھا، مگر ایجاد رباعی کے متعلق ہمارے سامنے دو مختلف روایتیں ہیں، ایک تو دولت شاہ سمرقندی (تالیف ۸۹۲ھ) کی جس کا بیان ہے کہ یہ بچہ صفاریہ خاندان کے بانی یعقوب صفار المتوفی ۲۶۹ھ کا لڑکا تھا، اور خود یعقوب صفار کھڑا اپنے بچہ کے کھیل کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ دفعۃً بچہ کی زبان سے یہ برجستہ مصرعہ نکلا، یعقوب کو یہ وزن پسند آیا، لیکن چونکہ اس وقت تک یہ وزن مستعمل نہ تھا، اس لئے ابودلف عجلی اور ابن الکعب جو دربار کے شعرا تھے اُن کو بلوا کر پوچھا کہ یہ کونسا بحر ہے، انھوں نے تحقیق کرکے بتایا کہ یہ بحر ہزج کی ایک قسم ہے، اور اس پر اسی وزن کے تین اور مصرع لگاکر دو شعر پورے کر دیئے، اور دو بیتی اس کا نام رکھا،[3]

لیکن اس سے متقدم تصنیف معجم فی معاییر اشعار العجم کے مصنف نے بڑی عبارت آرائی کے ساتھ اس واقعہ کو اس طرح لکھا ہے، کہ چند حسین و خوشرو بچے سڑک پر گولی کھیل رہے تھے،

---

[1] خریدۃ القصر، ص ۱۴۴، [2] یہ متن معجم کی روایت کے مطابق ہے، دولت شاہ میں لب گو بہ متاخرین نے اس کو تا سرِ گو کر دیا ہی، [3] تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی ص ۳۰ گب

تماشائیوں کا ہجوم تھا، انہی میں ایک طرف ایک شاعر بھی کھڑا تھا، جو غالباً رودکی تھا، کہ دفعتہً ایک بچہ کی زبان سے یہ موزوں مصرعہ نکلا، شاعر کو یہ وزن بہت پسند آیا، اور اُس نے تین مصرع اور لگا کر دو بیتی کر دیا،

رباعی کی تاریخ صورتِ واقعہ کچھ بھی ہو، اور وہ شاعر کوئی بھی رہا ہو، مگر دونوں روایتوں کا تاریخی نتیجہ یکساں ہے یعنی یہ کہ یہ تیسری صدی ہجری کے آخر کا واقعہ ہے کیونکہ یعقوب نے سنہ ۲۶۵ھ میں اور رودکی نے بروایتِ عام سنہ ۳۰۴ھ میں وفات پائی ہے، اس بنا پر تیسری صدی ہجری کے اواخر میں رباعی کی صنف پیدا ہوئی،

رباعی گو صوفیہ بلکہ شعراء کے ضمن میں تذکروں میں سب سے پہلا نام حضرت بایزید بسطامی المتوفی سنہ ۲۶۱ھ کا ملتا ہے، چنانچہ مجمع الفصحاء میں یہ تین رباعیاں اُن کے نام سے ہیں،

(جلد اول صفحہ ۶۵، ایران)

ای عشق تو کشتہ عارف و عامی را — سودای تو گم کردہ نکونامی را
ذوق لب میگون تو آورد برون — از صومعہ بایزید بسطامی را

از ما ہمہ رہ بکوی بدنامی باد — وز سوختگان نصیب ما خامی باد
ناکامی ما چو ہست کام دل دوست — کام دل ما ہمیشہ ناکامی باد

گر قرب خدا می طلبی دلجو باش — واندر پس و پیش خلق نیکوگو باش
خواہی کہ چو صبح صادق الوعد شوی — خورشید صفت با ہمہ کس یکرو باش

سمعانی نے کتاب الانساب میں رودکی کا ذکر کیا ہے، اور اس کی تاریخ وفات سنہ ۳۲۹ھ بتائی ہے،

لیکن زبان کی صفائی اور رُباعی کا وزن جو تیسری صدی کے خاتمہ تک غیر معروف تھا، اس نسبت کی صحت میں شک پیدا کرتا ہے، اور اس شک کی تائید والہ[1] داغستانی کے بیان سے ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مجمع الفصحا نے یہ رباعیات تقی اوحدی سے نقل کی ہیں، اور اس کی نسبت والہ داغستانی نے ریاض الشعراء میں حسب ذیل خیالات ظاہر کئے ہیں،

"راقم حروف را اعتماد بقول و ضبط تقی اوحدی نیست، چہ میر مذکور بسیار کم مایہ و کم تتبع بودہ، چنانچہ بعض رباعیات شیخ ابوسعید و باباافضل کاشی را بنام شیخ بایزید قدس سرہٗ نقل کردہ در حال آنکہ ہیچ کس از متقدمین و مورخین و ارباب خبرت و اہل تحقیق ذکر نہ کردہ اند، کہ شیخ بایزید شعری فرمودہ تقی اوحدی را نسیان بسیاری نیز بودہ، چنانچہ گاہ ہست کہ یک شعر را بنام سہ کس چہار کس نقل کردہ است"

(نسخۂ قلمی کتب خانہ ندوۃ العلماء در ترجمۂ حکیم سنائی)

رُباعی گو شعراء میں اگر دولت شاہ کا اعتبار کیا جائے، تو ابو دلف عجلی اور ابن الکعب جو یعقوب صفار المتوفی سنہ ۲۶۵ھ کے درباری شعراء تھے، سب سے پہلے رُباعی موزوں کی، اگر قیس رازی کی معجم فی معاییر اشعار العجم کی روایت کا لحاظ کیا جائے، تو اُس کے گمان میں سب سے پہلے جس نے رُباعی کہی، وہ رودکی المتوفی سنہ ۳۰۴ھ ہے، (سمعانی[2] نے اُس کی تاریخ وفات سنہ ۳۲۹ھ ثبت کی ہے،)

دیوان رودکی کے نام سے جو مجموعۂ کلام ایران میں سنہ ۱۳۱۵ھ میں چھپا ہے، اور جس کے قلمی نسخہ کی طرف صاحب مجمع الفصحا نے اشارہ کیا ہے، اس کے آخر میں ص ۱۰۸ سے ص ۱۱۳ تک

---

[1] والہ داغستانی گو متاخر ہے، محمد شاہ کا معاصر تھا، مگر کاوش و تحقیق میں اس کا پایہ بلند ہے جیسا کہ اس کے تذکرہ سے ظاہر ہے، [2] کتاب الانساب ص ۲۶۲ گ ب

رباعیات کا عنوان ہے۔ اس کے تحت میں دو دو شعر کے بیس منظومات ہیں، جن میں عشقیہ، حکیمانہ، اخلاقی، اور خمریہ مضامین ہیں، مگر وزن و قافیہ کے اعتبار سے ان میں - - - - - - - -

- -

صرف چھ منظومات ایسے ہیں، جو رباعی ہیں؛ اور بقیہ قطعے ہیں، وہ چھ رباعیاں ہیں:

(۱)

با آنکہ دلم از غم ہجرت خوں شد ۔۔۔ شادی بغم توام از غم افزوں شد

اندیشہ کنم ہر شب و گویم یارب ۔۔۔ ہجرانش چنین است وصالش چوں شد

۔۔۔۔۔۔

(۲)

چشمم ز غمت بہ ہر نفسی گہر بسفت ۔۔۔ بر چہر ہزار گل ز یارم بشگفت

رازے کہ دلم ز جان ہمی داشت نہفت ۔۔۔ اشکم بزبان حال با خلق بگفت

۔۔۔۔۔۔

(۳)

ہاں تشنہ جگر مجوی زیں باغ ثمر ۔۔۔ بے دستانیست این ریاض بردو

بیہودہ ہماں کہ باغبانت بقضاست ۔۔۔ چوں خاک نشستہ گیر و چوں باد گذر

۔۔۔۔۔۔

(۴)

چوں کشتہ بہ بینت دو لب کردہ فراز ۔۔۔ وز جان تہی قالب تنہا سودہ باز

بر بالینم نشستہ می گوئی بناز ۔۔۔ کے کشتۂ ترا من و پشیمان شدہ باز

۔۔۔۔۔۔

(۵)

اے از گل سرخ رنگ بر بودہ و بو ۔۔۔ رنگ از پئے رخ ربودہ بو از پئے مو

گل رنگ شود چو روی شوئی ہمہ جوئی ۔۔۔ مشکیں گردد چو مو فشانی ہمہ کو

۔۔۔۔۔۔

چوں کار دلم ز زلف او ماندہ گرہ | بر ہر رگِ جان صد آرزو ماندہ گرہ
امید زگریہ بود افسوس افسوس (۶) | کانہم شبِ وصل در گلو ماندہ گرہ

ایک اور رُباعی مجمع الفصحا کے نسخہ میں ہے۔

در منزلِ غم فگندہ مفرش مائیم | در آب دو چشم و دل بر آتش مائیم
عالم چو ستم کند ستم کش مائیم (۷) | دست خوش روزگارِ ناخوش مائیم

حضرت الاُستاذ نے مجمع الفصحا کے حوالہ سے چھٹی رُباعی شعرالعجم میں نقل کی ہے،
اور ذوقِ شعری کی بنا پر فیصلہ فرمایا ہے، کہ "یہ صناعانہ کلام رودکی کا نہیں ہو سکتا"
(شعرالعجم جلد اول احوال رودکی)

اگر یہ سات رُباعیاں رودکی کی ہوں بھی تو تعجب معلوم ہوتا ہے کہ بانی فن کے ہاں
اس قدر کم اس کی مثالیں ہوں۔

اصل یہ ہے کہ رودکی کا کلام جو متقدمین کی تصریح کے مطابق ہزار ہا شعروں پر مشتمل تھا،
ضائع گیا، اور جو دیوان تھی یا سبو عہ ملتا ہے، رضا قلی خاں ہدایت صاحب مجمع الفصحا
کی تحقیق کی بنا پر وہ حکیم قطران کے کلام سے مخلوط ہے جس کا زمانہ رودکی کے سو برس بعد
کا ہے، مصنف موصوف دیباچہ کے تیسرے صفحہ میں کہتا ہے،

"گویند حکیم رودکی چندیں ہزار بیت شعر فارسی مدون کردہ بود کہ اکنوں ہزار
یک آن نماندہ چنانچہ رشیدی گفتہ"

شعرا ورا بہ شمردم سیزدہ رہ صد ہزار | ہم فزوں تر آید از وی شمر گر بشمری

و طرفہ تر ایں کہ در زمال باشعار ے کہ بنام ابو عبداللہ جعفر بن محمد الرودکی معروف
و مشہور است در دیوان ابو منصور قطران مسطور است و از دست"

پھر رودکی کے احوال میں کہا ہے،

"رودکی اشعار بسیار داشتہ اما اشعار وے چیزے در میان نماندہ و ہمہ بتحلیل رفتہ تا آنکہ رشیدی سمرقندی در باب نظم او گوید (شعر او را گذرا) واکنوں قلیلے اشعار بنام وے مذکور است و در بعضے تواریخ و کتب تذکرہ مسطور است، چوں دیوان حکیم قطران پدید آمد، بیشتر آنہاں نیز دراں دیوان دریافتہ شد، و دیوانش معروف نبودہ و در مدائح وے ابونصر اندر است، گمان کردہ اند کہ نصر بن احمد است و شاعر رودکی است، پس از آنکہ در تواریخ و آثار وقتے رفت پدید آمد کہ حکیم رودکی صد.... سال قبل از قطران بودہ، این اشعار معروف بنام وے از قطران است الا قلیلے کہ دراں نیز شبہہ است۔" (ص، ۲۲۲)

اصل یہ ہے کہ نصر سامانی ممدوح رودکی اور ابونصر مملان ممدوح قطران کے درمیان اختلاط ہوگیا،

بہرحال اس بیان سے ہویدا ہے کہ اگر رودکی رُباعی کا موجد ہے تو اس کے موجودہ دیوان میں رُباعیاں اتنی کم کیوں ہیں، اور بعض میں زبان کی صناعی کی جو بعد کی چیز ہے، وجہ کیا ہے، اور نیز یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کے کلام کا بڑا حصہ ضائع ہوگیا، اس لئے اُس کی رُباعیوں کا نشان لگانا اب محال ہے، ورنہ سمعانی کے زمانہ میں (سنہ ۵۰۶ھ سنہ ۵۶۲ھ) اس کا دیوان بلاد عجم میں بکثرت ملتا تھا، انساب سمعانی میں ہے،

الشاعر دیوانہ بلاد العجم — جس کا دیوان عجم کے شہروں میں

المعروف — دائر و سائر ہے،

رُباعی گو حکیموں میں پہلا نام اور مطلق رُباعی گویوں میں دوسرا نام معلم ثانی ابونصر فارابی

المتوفی ۳۳۹ھ کا لکھا ہے، ابن خلکان نے ایک عربی قطعہ مشتبہ طور سے اس کی طرف منسوب کیا ہے، فارابی گو نسلاً ترک تھا، مگر اس زمانہ میں عجم و ترکستان کی عام زبان فارسی ہی تھی، اور اس کے علاوہ وہ متعدد زبانوں سے واقف تھا[۵۱]، اس لئے اس کی طرف فارسی رباعیات کا انتساب غیر متوقع نہیں ہے، شہرزوری کی تاریخ الحکماء میں ہے، ولہ فارسی۔

بہرحال تذکروں اور بیاضوں میں اس کی طرف چند رباعیات منسوب ملتی ہیں، مجموعہ منتخبات دار المصنفین میں حسب ذیل رباعیاں اس کے نام سے درج ہیں:

اے آنکہ شما پیر و جوان دیدارید	ازرق پوشاں گنبد دوّارید
طفلے ز شما در بدما محبوس است	او را بہ خلاص ہستی (؟) گمارید

......٭......

اسرار وجود خام و ناپختہ[۵۲] بماند	وآں گوہر بس شریف ناسفتہ بماند
ہر کس ز قیاس حرفے گفتند	وآں نکتہ کہ اصل بود ناگفتہ بماند

یہی دونوں رباعیاں مجمع الفصحا میں حکیم مذکور کے حال میں (جلد اول، ص۳۰) مندرج ہیں، صرف اس قدر تغیر ہے کہ پہلی رباعی کے دوسرے مصرع میں گنبد دوّارید کے بجائے ایں کہن دیوارید اور چوتھے مصرع میں ہستی کے بجائے مستی ہے، اور دوسری رباعی کے تیسرے مصرع میں بجائے ہر کس ز قیاس، ہر کس بہ دلیل عقل چیزے گفتند۔

ایک اور مجموعۂ (خیابان عرفان مرتبہ محمد حسن بلگرامی) میں ایک اور رباعی فارابی کے نام سے لکھی ہے:-

زاں پیش کہ از جہاں فرومانی فرد	کر کن کہ نبایدت پشیمانی خورد

---

[۵۱] تاریخ مختصر الدول، ابوالفرج ملطی ص ۲۹۵، بیروت۔ [۵۲] اوپر گذر چکا ہے کہ یہ رباعی کسی قدر لفظی تغیر کے ساتھ خیام کے رباعیات میں بھی شامل ہے، لفظ ناپختہ قافیہ کے لحاظ سے غلط ہے۔

امروز بکن چوں می توانی کارے   فردا چہ کنی چو ہیچ نتوانی کرد

فارابی صوفی حکیم تھا، اور صوفیوں کے لباس میں رہتا تھا[1] مگر ان قرائن کے باوجود کوئی صحیح اور غیر مشکوک دلیل اُس کے رُباعی گو شاعر ہونے پر ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے بجز اس کے کہ شہرزوری نے "تاریخ الحکماء" میں اس کے حال میں لکھا ہے، ولہ اشعار حسنۃ حکمیۃ (اس کے اچھے حکیمانہ اشعار ہیں) اور اُس کے عربی حکیمانہ اشعار دو صفحوں میں نقل کیے ہیں۔

اس کے بعد شاعرانہ رنگ میں ابو شکور بلخی کا نام ملتا ہے جس کا شمار سامانی عہد کے شاعروں میں ہے، ۳۳۶ھ میں اُس نے ایک کتاب لکھی تھی، عوفی نے لباب الالباب جلد دوم ص ۱۳ (گب) میں اس کا ذکر کیا ہے، اور شراب کے متعلق اُس کے متعدد قطعے نقل کیے ہیں، اور ایک یہ رُباعی لکھی ہے،

اے گشتہ من از غم فراوان تو پست   شد قامت من ز درد ہجران تو شست[2]
اے شستہ من از فریب دستان تو دست   خود ہیچ کسے بسیرت و شان تو ہست

اسی عہد کا ایک اور ضخیم شاعر عمارہ مروزی ہے جس نے سامانیہ کا آخری اور غزنویہ کا ابتدائی زمانہ پایا ہے، صاحب مجمع الفصحاء نے اس کا سال وفات ۳۶۰ھ لکھا ہے، وصف شراب اس کا خاص موضوع ہے، عوفی نے اس کی یہ رُباعی نقل کی ہے،

ان مے بہ سپید آں بت سیمین تن[3] نگر   گوئی کہ آفتاب بہ پیوست با قمر

---

[1] قفطی اور ابو الفرج ملطی میں ہے: وقام فی کنفہ مدۃ بزی اہل التصوف، یعنی وہ ایک زمانہ تک سیف الدولہ کے سایۂ دولت میں اہل تصوف کے لباس میں رہا، درۃ الاخبار میں فارابی کے صوفیانہ کلمات بھی مذکور ہیں۔ [2] مجمع الفصحاء میں یہ مصرع اس طرح ہے ع شد قامت من ز بار ہجران تو شست [3] مجمع الفصحاء میں یہ لفظ "سمین تن" ہے،

زاں ساغرے کہ سایہ بیفگندش می برد   برگ گل سپید است بگوئی بالا[1]

رباعی کی بحر کے بعض قطعات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنوز رباعی فن کی زنجیروں میں کسی نہیں گئی تھی۔ جامی نے نفحات میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ سلطان سعید ابوالخیر کو مزارہ کا کوئی شعر سنایا گیا، تو وجد کا عالم طاری ہو گیا؛ اور اپنے مریدوں کے ساتھ وہ اس کی قبر پر گئے،[2]

اس زمانہ میں دیالمہ کی ایک شاخ آل زیار کا بادشاہ شمس المعالی قابوس بن وشمگیر دیلمی تھا، جو سنہ ۳۶۶ھ میں تخت نشین ہوا۔ کمال البلاغہ اور سیر الملوک اوس کی تصنیفیں ہیں، کمال البلاغہ مصر میں چھپ گئی ہے۔ شمس المعالی نے بعض رباعیاں بھی کہی ہیں۔ مجمع الفصحاء سے یہ رباعیاں نقل ہیں، (جلد اول ص ۵۳)

گل شاہ نشاط آمد و مے میر طرب   زاں روے بدیں دو می کنم عیش طلب
خواہی کہ بدیں بدانی اے ماہ سبب   گل رنگ رخت دارد و مے رنگ دو لب

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

شش چیز دراں زلف تو دارد مسکن   پیچ و گرہ و بند و خم و تاب و شکن
شش چیز دگر ازان نصیب دل من   عشق و غم و درد و رنج و تیمار و حزن

غرضکہ تصوف کا آغاز دیلمیوں کے زیر سایہ ہوا ہے، جو چوتھی پانچویں صدی میں سنہ ۳۲۰ سے لے کر سنہ ۴۴۷ھ یعنی سلجوقیوں کی پیدائش تک برسر عروج رہے۔ اس بنا پر تصوف کی حکیمانہ رباعی چوتھی صدی کے وسط میں پیدا ہو چکی تھی۔ نشو و ارتقا کا نظرہ، جو چوتھی صدی کے اواخر کی تصنیف ہے،

---

[1] مجمع الفصحاء میں یوں ہے، جو صحیح ہے۔ ع واں ساغرے کہ سایہ فگند است می برد،

[2] مجمع الفصحاء جلد اول ص ۳۵۰ (ایران)

ان کی شہادت سے ثابت ہے کہ اس عہد یعنی دیالمہ کے عہد میں صوفیانہ رباعیاں مجلس سماع کو گرم کرتی تھیں، اب غزنوی دور آیا، اس کے سلاطین اور شعرا میں مختصر ہنگامی واقعات مثلاً شکریہ، معذرت، شکایت، فخر، تہنیت، عید اور دوسرے ہنگامی واقعات کی فی البدیہہ نظم میں یہ صنف سخن ترقی کرتی نظر آتی ہے، غزنویہ کا آغاز ۳۶۵ھ میں ہوا، اور اس کے عروج کا ستارہ سلجوقیہ کے آفتاب اقبال کی روشنی میں ۴۲۹ھ میں چھپ کر رہ گیا، غزنوی دور کے شعرا میں سے عنصری المتوفی ۴۳۱ھ کے یہاں رباعیاں کثرت سے ہیں، مجمع الفصحا[1] میں اس کی بیس رباعیاں درج ہیں، مشہور کہانی کی بنا پر ایاز کی زلف کٹنے کے حسن تعلیل میں اس کی رباعی ہے،

کی عیب سر زلف بت از کاستن است　　چہ جائے بغم نشستن و خاستن است

روز طرب و نشاط و مے خواستن است　　کآراستن سرو بہ پیراستن است

ایک دفعہ سلطان محمود چوگان کھیلنے میں گھوڑے سے گر گیا، اس پر عنصری نے برجستہ رباعی کہی،

شاہا ادبے کن فلک بد خو را　　کآسیب رسانید رخ نیکو را

گر گوے خطا رفت بچوگانش زن　　ور اسپ خطا کرد بمن بخش او را

سلطان نے وہ گھوڑا اس کو بخش دیا، اس پر شاعر نے شکریہ کی دوسری رباعی برجستہ عرض کی،

عنصری کی رباعیات زیادہ تر انہی ہنگامی واقعات اور حسن و عشق کے مضامین کی ہیں،

---

[1] مجمع الفصحا، جلد اول ص ۳۶۲، ایران،

اس عہد کے مشہور ترین شاعر فردوسی کے کلام میں بھی رُباعی کی صنف پائی جاتی ہے؛ مشہور روایت کے مطابق عنصری، فرخی، اور عسجدی کی بزمِ انس میں فردوسی نے جب پہلے پہل قدم رکھا تھا، تو ان تینوں نے رُباعی ہی کا ایک ایک مصرعہ کہکر فردوسی کے زورِ سخن کی آزمائش کی تھی[۱]۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ فردوسی نے سلطان کے حکم سے کسی خوش رو غلام کے آغازِ خط کی تعریف میں یہ رُباعی کہی تھی،

مست است بتا چشم تو تیر بدست ‏ ‏ بس کن کہ ز تیر چشم مستِ تو بخست
گر پوشید عارضت زرہ عذر ش ہست ‏ ‏ کز تیر سد ہمہ کس خاصہ بدست

غزنوی شعراء میں عسجدی المتوفی ۴۳۲ھ کی رُباعیات خاص نوعیت رکھتی ہیں؛ ان میں عشق حقیقی و مجازی کی معتدل ترکیب پائی جاتی ہے، مجمع الفصحاء میں اس کی دس رُباعیاں ہیں جن میں سے پہلی حسبِ دستورِ زمانہ آغازِ خط کے وصف میں ہے،

بر گل رقمی ز مشک ناگاہ زدند ‏ ‏ بر تنگ شکر مورچگان راہ زدند
آئینۂ روے دوست زنگار گرفت ‏ ‏ از بسکہ بر او سوختگان آہ زدند

در دورِ تو عقلِ کل کنشتی گردد ‏ ‏ حسنِ ابدی شہرہ بزشتی گردد
خاکسترِ کشتگانت در دوزخِ عشق ‏ ‏ پیرایۂ حورانِ بہشتی گردد

دل دوش ہزار چارہ سازی می کرد ‏ ‏ با وعدۂ دوست عشق بازی می کرد
تا بر کفِ پاے تو تواند مالید ‏ ‏ دل را ہمہ شب دیدہ نمازی می کرد

---

[۱] تاریخ گزیدہ مستوفی ص ۸۲۲ - (گب)

صبح است و صبا مشک فشاں می گذرد — دریاب که از کوے فلاں می گذرد
برخیز چہ نشینی که جہاں می گذرد — بوے بستاں که کارواں می گذرد

درجسم پیالہ جاں روانست رواں — در روح مجسم آں روانست رواں
درآب فسردہ آتش سیال است — در درج بلور لعل کانست رواں

آں جسم پیالہ میں بجاں آبستن — ہمچوں مستی بارغواں آبستن
نے نے غلطم پیالہ از غایت لطف — آبیست بآتش رواں آبستن

گرزاں که مرا فلک دہد مال فرہ — بکشایم ازیں کار فرو بستہ گرہ
ترکی بخرم که ہرکہ بیند گوید — اے خاک تو از خون خریدار تو بہ

از شرب مدام و لاف مشرب توبہ — وز عشق بتان سیم غبغب توبہ
در دل ہوس شراب و برلب توبہ — زیں توبۂ نادرست یارب توبہ

عوفی نے لب لالباب کی پہلی جلد میں سلاطین غزنویہ و امراے چغانیہ (جو غزنویہ کے زیر اثر تھے) اور امراے جرجان کی بہت سی رباعیاں (باب اول در لطائف اشعار ملوک کبار) نقل کی ہیں، اگرچہ زیادہ تر ہنگامی واقعات کے ذکر و بیان میں تفریحی حیثیت رکھتی ہیں البتہ ان میں سے ایک شخص خاص ذکر کے قابل ہے اور وہ شمس المعالی قابوس بن وشمگیر کا پوتا

عنصر المعالی کیکاؤس بن اسکندر بن شمس المعالی قابوس امیر جرجان ہے، جو سلطان مودود بن مسعود غزنوی کا معاصر تھا، یہ ایک سخن سنج و سخن فہم امیر تھا، اوس کے اشعار تذکروں میں مذکور ہیں، مجمع الفصحاء میں اس کی دس اخلاقی اور عشقیہ رُباعیاں لکھی ہیں، پہلی رباعی یہ ہے،

گر شیر شود عدو چو پیدا چہ نہفت　　　با شیر بہ شمشیر سخن باید گفت
کاں را کہ بگور خفت باید بے جفت　　　با جفت بجان خویش نتواند خفت

اس عہد کا رُباعی گو حکیم ابو علی سینا المتوفی سنہ ۴۲۸ھ ہے، اس نے متعدد حکیمانہ رباعیاں کہیں، جو تذکروں اور سفینوں میں مذکور ہیں، اُن میں سے بعض خیام کے نام سے بھی ملتی ہیں، ڈاکٹر ایتھے نے سنہ ۱۸۷۵ء میں ابن سینا کی بارہ رُباعیوں کو جمع کر کے چھپوایا ہے، مجمع الفصحاء میں اُس کی یہ پانچ رُباعیاں ہیں،

دل گرچہ دریں بادیہ بسیار شتافت　　　یک موئے ندانست ولے موئے شگافت
اندر دلِ من ہزار خورشید بتافت　　　(۱)　　　آخر بکمال ذرہ راہ نیافت

....

باایں دو سہ ناداں کہ چنیں می دانند　　　از حمق کہ دانائے جہاں آنانند
خر باش کہ ایں جماعت از فرط خری　　　(۲)　　　ہر گو نہ خر است کافرش می خوانند

....

کفر چو منی گزاف و آساں نبود　　　محکم تر ازیں ایمانِ من ایمان نبود
در دہر چو من یکے و آں ہم کافر　　　(۳)　　　پس در ہمہ دہر یک مسلماں نبود

....

از قعر گل سیاہ تا اوج زحل　　　کردم ہمہ مشکلاتِ گیتی را حل
بیروں جستم ز قید ہر مکر و حیل　　　(۴)　　　ہر بند کشادہ شد مگر بند اجل

اے کاش بدانمی کہ من کیستمی — سرگشتہ بعالم از پے چیستمی
گر مقبلیم آسودہ و خوش زیستمی (۵) ورنہ بہزار دیدہ بگریستمی

مجموعۂ منتخبات دارالمصنفین میں ایک دو رباعیاں اور بھی ہیں، مگر وہ بھی خیام اور محقق طوسی کے منسوبات میں ہیں، اوپر کی پانچ رباعیوں میں دوسری، تیسری، چوتھی، خیام کے مجموعہ میں بھی ملتی ہیں،

غزنوی دور میں سلطان محمود کے زمانہ میں مشہور صوفی شاعر شیخ ابو الحسن خرقانی المتوفی ۴۲۵ھ کا ظہور ہوا، یہ پہلی مقدس ہستی ہے، جس نے رباعیات کے پردے میں عشق حقیقی کے مضامین ظاہر کئے، ہمارے مجموعۂ منتخبات، مجمع الفصحاء، اور آتشکدہ میں اُن کی متعدد رباعیاں ہیں، ہمارے مجموعہ میں یہ رباعیاں شیخ کے نام سے ہیں،

تا گبر نشی با تو بتے یار نبو — در گبر شی از بہر بتے عار نبو
آن را کہ میان بستہ زنار نبو (۱) آن را بمیان عاشقان کار نبو

....

روزے بہ بہار بے تو بگذشت و گذشت — شب ہم بخیال بے تو بگذشت و گذشت
یک چشم زدن بے تو نہ بودم ہرگز (۲) اکنون مہ و سال بے تو بگذشت گذشت

....

سودائے سر بے سر و ساماں یک سو — اندیشۂ خاطر پریشاں یک سو
بے مہری چرخ و جور ناداں یک سو (۳) اینہا ہمہ یک سو غم جاناں یک سو

....

اے سینہ بیا طرح فغاں اندازیم — افسانۂ عشق در میاں اندازیم
تا از دل ما خبر رسانند بیار (۴) دل بر سر راہ کارواں اندازیم

مجمع الفصحا میں دو رُباعیاں اور ہیں۔

آں دوست کہ دیدنش بیاراید چشم — بے دیدنش از گریہ نیاساید چشم
ما را ز برائے دیدنش باید چشم (۵) — گر دوست نہ بیند بچہ کار آید چشم

والہ داغستانی نے صرف پہلی رُباعی نقل کی ہے، اور اُس کی زبان کی بنا پر یہ لکھا ہے،

"در رُباعیات دیگر ایشاں نیز ہمیں سیاقت آمیختہ بزبان پہلوی است"

(در ترجمۂ ابو الحسن خرقانی)

اسرار ازل را نہ تو دانی و نہ من — وین حرفِ معما نہ تو خوانی و نہ من
ہست از پسِ پردہ گفتگوی من و تو (۶) — گر پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من

ایک اور رُباعی اُن کی طرف منسوب ملتی ہے،

گویند مرا کہ می پرستم ہستم — گویند مرا فاسق و مستم ہستم
در ظاہرِ من نگاہ بسیار مکن (۷) — کاندر باطن چنانکہ ہستم ہستم

چھٹی رُباعی خیام کے اکثر نسخوں میں موجود ہے، اور ساتویں بھی وینہ اور کلادیانی کے نسخوں کے رو سے خیام کی ملکیت میں داخل ہے، اور پہلی رُباعی کی زبان بقیہ رُباعیوں سے الگ ہے، جو قابلِ لحاظ ہے،

نفحات الانس جامی کے تفحص سے معلوم ہوتا ہے، کہ شیخ ابو الحسن خرقانی سے پہلے شعر پسند صوفیہ اس ساز کو عربی میں چھیڑتے تھے، گو اُن سے پہلے فارسی کا کوئی ترانہ خوانِ صوفی نظر نہیں آتا، اِلّا یہ کہ بایزید بسطامی کی طرف، چند مشکوک رُباعیاں منسوب ہیں،

اسی زمانہ میں شیخ کا معاصر بابا طاہر ہمدانی المتوفی سنہ ۴۱۰ھ (یا بقول براؤن بقیاس روایت راحۃ الصدور قریب سنہ ۴۵۰ھ) ہے، یہ نصیری فرقہ کا درویش تھا، رے کی دہقانی بولی

میں یہ رُباعیاں کہا کرتا تھا، اُس کی رُباعیوں کا مجموعہ موجود ہے، اور چھپ بھی گیا ہے یہ پہلا
مستقل مجموعہ رُباعیات کا ہے، جو اس وقت ہمارے سامنے موجود ہے،

اُس کی دو رُباعیاں یہ ہیں، :-

نصیحت می کنم سودش نمی بو ولے دارم کہ بہبودش نمی بو
بر آذر می نہم دودش نمی بو بباد ش می دہم بیہودہ باد

......

نسیمے کز بنِ آں کاکل آید مرا خوشتر ز بوے سنبل آید
چو شور گرم خیالت را در آغوش سحر از بسترم بوے گل آید

اس کے بعد سُلطان ابو سعید ابو الخیر صوفی المتوفی سنہ ۴۴۰ھ آتے ہیں، جن کی رُباعیاں
عشقِ حقیقی کی تیز و تند شراب سے لبریز ہیں، اُن کی رُباعیوں کے بھی کئی اڈیشن مشرق و
مغرب میں شائع ہو چکے ہیں،

اس سلسلہ میں ایک اور قابلِ ذکر ہستی بابا افضل الدین افضل کاشانی (یا کاشی)
کی ہے یہ ایک فاضل و حکیم صوفی تھے، آذر آزاد بلگرامی، اور ہدایت طہرانی کی تصریح کے مطابق
اُن کی متعدد تالیفات یادگار ہیں، کہتے ہیں کہ خواجہ نصیر الدین نے اُن کی مدح میں وہ شعر
کہا ہے جس کی بنا "افضل افضل" کی تلمیح پر ہے۔ بابا کی اس شہرت کے باوجود کس قدر افسوس
کی بات ہے، کہ ان کا زمانہ صحیح طور سے متعین نہیں، آزاد بلگرامی نے ید بیضا میں لکھا ہے،
کہ یہ سلطان محمود غزنوی کے معاصر تھے، اور سُلطان اُن کو ایران سے اپنے ساتھ لایا تھا،
اور وہ مدت تک غزنین میں مقیم رہ کر، پھر اپنے وطن مالوف کو واپس گئے، آذر نے
آتشکدہ میں لکھا ہے، کہ یہ خواجہ نصیر طوسی اور ہلاکو کے معاصر تھے، اور خواجہ نے "تاتاریوں کے

برپا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی کیا مصلحت ہو،" اس سوال کو ایک عربی میں نظم کرکے بابا کے پاس بھیجا تھا، اور بابا نے اوس کا جواب دیا تھا۔ مگر خواجہ کی جس رُباعی کا حوالہ دیا گیا ہے وہ خیام کے ملوکات میں ہے، ہدایت نے مجمع الفصحاء میں نہ صرف یہی لکھا ہے کہ یہ خواجہ نصیر کے معاصر تھے، بلکہ یہ بھی افواہ نقل کی ہے، کہ وہ خواجہ نصیر کے خالو تھے، اور دالہ داغستانی نے نقل کیا ہے، کہ خواجہ نصیر، بابا کے ہمشیرزادہ تھے،

بہرحال ان دو مختلف تصریحوں کے مطابق ان دونوں زمانوں میں دوسو برس سے زیادہ کا فصل ہوجاتا ہے، اگر وہ بقول آزاد سلطان محمود کے معاصر تھے، تو چوتھی صدی کے اواخر اور پانچویں صدی کے اوائل میں تھے، اور اگر بقول آذر و ہدایت خواجہ نصیر طوسی کے معاصر تھے، تو ساتویں صدی ہجری کے اواسط میں ان کو ماننا پڑے گا،

آزاد کی تائید میں امین رازی کی ہفت اقلیم سے ہوتی ہے، امین رازی نے عوفی[1] کے حوالہ سے نہ صرف سلطان محمود کی معاصرت لکھی ہے، بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ ایاز بابا کا شاگرد تھا، اور اسی لئے سلطان محمود جس نے بابا کو نظر بند کردیا تھا، بابا نے اُس کی شان میں مدحیہ قصیدہ لکھ کر ایاز کی وساطت سے سلطان کی خدمت میں گذرانا، اور قید سے رہائی پائی، معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ نصیر نے بابا کی نسبت جو کلمات کہے، اُن کی بنا پر بابا کو خواجہ کا معاصر بنا یا گیا ہے،

بابا کی رُباعیات کا انتخاب سب سے زیادہ دالہ داغستانی نے کیا ہے، چنانچہ پانچ صفحوں میں اُن کی رُباعیاں نقل کی ہیں،

---

[1] عوفی کی لُب الالباب میں جو شعراء کا تذکرہ ہے، مجھے یہ بیان نہیں ملا، شاید اس کی کسی اور تصنیف میں یہ ذکر ہو،

ان کے کلام میں بھی خیام کے رُباعیات کا اقتباس موجود ہے،

سنہ ۴۲۹ھ میں نیشاپور کے مطلع سے سلجوقی دور کا آفتاب طلوع ہوتا ہے، سلجوقیوں کا زمانہ اس صنفِ سخن کے اوجِ شباب کا زمانہ ہے، اس عہد میں رُباعی گوئی سلاطین، وزرا، امرا، علما، حکما، اور عام شعرا، کا دلچسپ مشغلہ ہو جاتا ہے، اسی میں سوال و جواب ہوتے ہیں، حسن و عشق کی روداد بیان کی جاتی ہے، مناظرِ قدرت کی تصویریں کھینچی جاتی ہیں، اور بادۂ ساغر کی نئی نئی تشبیہوں کے مرقعے تیار کئے جاتے ہیں، اس عہد میں ہر قسم کی عشقیہ، خمریہ، حکیمانہ اور صوفیانہ رُباعیات کے دفتر کے دفتر ملتے ہیں، اس زمانہ کے مشہور رُباعی گویوں میں سلجوقی دربار کے کاتب و ادیب شاعر، ندیم علی بن حسن باخرزی کا نام ہے، جو تتمۃ الدہر اور خریدۃ القصر کے ذیل دمیۃ القصر کا مصنف ہے، جو اس عہد کے عربی شعرا، کا تذکرہ ہے سنہ ۴۶۷ھ میں اپنے ایک محبوب غلام یا حریف دوست کے ہاتھ سے مارا گیا، یہ عربی و فارسی دونوں زبانوں کا ادیب و شاعر تھا، عربی زبان کے ساتھ فارسی دیوان بھی یادگار چھوڑا، عوفی نے لباب الالباب میں اس کے تذکرہ میں (جلد اول ص ۰۰) لکھا ہے، کہ اس نے اپنے فارسی رُباعیات کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا تھا، جس کا نام طرب نامہ رکھا تھا، اور جو حروفِ ہجم کی ترتیب پر مرتب ہے، اس کا ایک نسخہ کتب خانہ سمرقند میں بخارا میں دیکھا تھا"

لہ عوفی میں اس کا سالِ وفات سنہ ۴۶۲ھ لکھا ہے، مگر ابن خلکان میں سنہ ۴۶۷ھ ہے، عوفی نے اس کی کنیت ابوالقاسم بتائی ہے، اور ابن خلکان میں ابوالحسن ہے، میرے خیال میں عوفی کا یہ بیان صحیح ہے، کہ خود باخرزی نے اپنی کتاب کے آخر میں اپنے معاصرین کی جو تقریظیں شامل کی ہیں، اُن میں سے ایک میں اُس کو ابوالقاسم کہہ کر خطاب کیا گیا ہے،

(دمیۃ القصر ص ۳۱۲ حلب)

(باقی صفحہ آیندہ پر)

باخرزی ایک بادہ پرست، سرخوش، امیروں اور بادشاہوں کی مجلس انس کا ندیم و مصاحب تھا، اور خود اپنی کتاب میں اوس نے اپنے جرم کا ہلکا سا اعتراف کیا ہے، بہر حال اسی کا اثر تھا، کہ اُس کی رباعیاں بھی تمامتر مست و سرخوش اور عیش و طرب کی محفلوں کے موزوں ترانے ہیں، عوفی نے اس کی وہ چند رباعیاں نقل کی ہیں، جو طرب نامہ کے مطالعہ کے بعد اس کی زبانی یاد[1] رہ گئی تھیں،

(۱)

پیرامنِ روز قیرگوں شب دارد — ز ہر دو شکرستاں دو کوکب دارد
بر سُرخ گُل از غالیہ عقرب دارد — واز نوش دو تریاک مجرب دارد

(۲)

برگردنِ خویش بستہ عقد گہر — واز گوش بیا دریختہ حلقۂ زر
گوئی غم عشق جلوہ کرد اے دلبر — زاشک ورُخِ من بگردن و گوش تو در

(۳)

زاں می خواہم کہ خرمی را سبب است — نامش می زکیمیائے شادی لقب است
سُرخ است چو عناب وز آب عنب است — آبے کہ بُرخ بر آتش آرد عجب است

(۴)

خصم تو اگر باز ندارد نہ تو چنگ — صد گونہ برائے تو بر آمیزم رنگ
بنشینم اگر کار بماست و بہ تنگ — بر آتش چو کباب بر تیغ چو زنگ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۰) سیف الدین باخرزی دوسرے ہیں جو صوفی شاعر تھے، اور نجم الدین کبریٰ کے مرید تھے ۶۵۸ھ میں وفات پائی،

[1] لباب الالباب عوفی جلد ۱ صفحہ ۵۲

اے غالیہ شوریدہ بما شورۂ سیم[1]	وز غالیۂ تو سیم را رنگِ وسیم
بر رغم را نہادی اے در یتیم	دہ تاج سیہ بر سرِ دہ ماہی شیم

تیسری رُباعی خیام کے بعض مجموعوں میں بھی داخل ہے، باخرزی کا ایک دوست اور عزیز و ہمدم و ہم پیالہ محمد بن ابی نصر ہے، باخرزی نے اس کی نسبت اپنے تذکرہ میں لکھا ہے "ولہ رباعیات بالفارسیۃ واختراعات فیہا دقیقہ" فارسی کی رباعیاں نقل نہیں کی ہیں مگر عربی اشعار نقل کئے ہیں، جو تمامتر سوز و ساز اور رنگ و مستی ہیں۔[2]

عہدِ سلجوقی کے حکما، اور صوفیہ میں دو نام خاص کر قابل ذکر ہیں، ایک امام محمد غزالی المتوفی ۵۰۵ھ اور دوسرے اُن کے بھائی امام احمد غزالی المتوفی ۵۱۷ھ امام محمد غزالی کا ایک قطعہ اور تین رُباعیاں مجمع الفصحا میں ہیں، رباعیاں حسب ذیل ہیں،

کس را پس پردۂ قضا راہ نہ شد	(۱)	وز سرِ قدر ہیچ کس آگاہ نہ شد
ہر کس ز سرِ قیاس چیزے گفتند		معلوم نہ گشت و قصہ کوتاہ نہ شد

ما جامہ نمازی بسر خم کر دیم	(۲)	وز آبِ خرابات تیمم کردیم
شاید کہ دریں میکدہ ہا دریابیم		آن یار کہ در صومعہ ہا گم کردیم

خاکِ درِ کس مشو کہ گردت خوانم	(۳)	گر خود ہمہ آتشی کہ سردت خوانم
تا تشنہ تری بخلق محتاج تری		سیر از ہمہ شو تا سرہ مردت خوانم

---

[1] مجمع الفصحا میں شوریدہ کی جگہ سائیدہ اور شورہ کی سورہ ص ۳۴۴، [2] دمیۃ القصر ص ۲۶۵ طبع

پہلی اور دوسری رُباعیاں خیام کے بعض نسخوں میں بھی ہیں،

(دیکھو مطبوعات بمبئی)

امام احمد غزالی صوفی صافی تھے، مجمع الفصحا میں اُن کی تین صوفیانہ رُباعیاں ہیں۔
یہ تمام اشخاص خیام کے معاصرین تھے، اِس قرن کے دوسرے رُباعی گو صوفیوں میں
سب سے مشہور و معروف ہستی شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبداللہ انصاری ہروی المتوفی ۴۸۱ھ[1]
کی ہے، یہ مذہبًا حنبلی اور مشربًا صوفی تھے، عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے
جو زیادہ تر عجز و تقصیر، طلب مغفرت، نصیحت و موعظت اور مناجاتوں پر مشتمل ہیں، ابن رجب
حنبلی نے طبقات الحنابلہ میں اُن کا مفصل ذکر کیا ہے، اور اُن کے بعض عربی اشعار بھی
نقل کئے ہیں، منازل السائرین تصوف میں اُن کی مشہور کتاب ہے، فارسی میں اُن کی مناجاتیں
بہت دلکش ہیں، اسی سلسلہ میں اُن کی رُباعیاں بھی ہیں، جن کا نمونہ یہ ہے؛ دوسری رُباعی
مجموعۂ منتخبات دار المصنفین میں اور بقیہ تین مجمع الفصحا میں ہیں،

عیب است بزرگ برکشیدن خود را | وز جملہ خلق برگزیدن خود را
(۲)
از مردمک دیدہ بباید آموخت | دیدن ہمہ کس را نہ دیدن خود را

.....×.....

عودم چو نبود، چوب بید آوردم | روی سیہ و موے سپید آوردم
تو خود گفتی کہ نااُمیدی کفر است | فرمان تو بردم و اُمید آوردم

[1] ریاض الشعراء اور مجمع الفصحا وغیرہ تذکروں میں ۲۹۶ھ کی ولادت اور ۳۸۱ھ کی وفات غلط
لکھی ہے، ایک صدی کی کمی ہے، میں نے یہ تاریخ ابن رجب حنبلی کی طبقات الحنابلہ سے نقل کی ہے، جس نے
اُن کے معاصرین اور تلامذہ سے اُن کے احوال نقل کئے ہیں،

شرط است کہ چون مرد رہ درد شوی | خاکی تر و ناچیز تر از گرد شوی
(۳)
پر گو ز مراد گم شود مرد شود | بفگن الف مراد تا مرد شوی

........٭........

دی آدم و دنیا ہر از من کارے | وامروز ز من گرم نہ شد بازارے
(۴)
فردام بود بے خبر از اسرارے | تا آمدہ بہ بود ازین بسیارے

........٭........

خیام اور عبد اللہ انصاری کی بعض رباعیاں بھی باہم مختلط ہیں،

اسی عہد کے ایک اور صوفی شاعر ہیں جن کا نام اس سلسلہ میں اب تک نہیں لیا گیا ہے اور وہ شیخ احمد بدلی[1] سبزواری ہیں، جو ۵۸۲ھ میں سلطان تکش خوارزم شاہ کے عہد میں موجود تھے، مصنف جہاں کشا نے ان کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے،

"چون کار اہل سبزوار باضطرار رسید و ملجاء و مہربے نہ بود بشیخ احمد بدلی کہ از ابدال زمانہ بود، و در علوم دینی و حقیقی یگانہ ....، و ورا در حقائق اشعار است از غزل و رباعیات و رسائل"

آخری فقرہ جہاں کشا کے دوسرے نسخہ میں جو مطبوعہ نسخہ کے حاشیہ پر ہے، حسب ذیل ہے:

"و او را در حقائق اشعار و رباعیات و رسائل بسیار است"

اس کے بعد یہ ہے :۔

"و این رباعی او راست"

اے جان اگر از غبار تن پاک شوی | تو روح مقدسی بر افلاک شوی

---

[1] مستوفی نے تاریخ گزیدہ نے مشائخ کے سلسلہ میں اُن کا ذکر کیا ہے، (ص ۷۸۰) اور اُن کا

عرش است نشیمن تو شرمت بادا   کای و مقیم خطۂ خاک شوی

مگر یہ رُباعی تبنیر خیام کے نسخوں میں بھی موجود ہے،

حکما اور صوفیہ رُباعی کو کیوں اختیار کیا

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حکما اور صوفیہ نے تمام اصنافِ سخن میں رُباعی کو کیوں اپنے لئے مخصوص کیا، اس کا جواب جہاں تک مجھے معلوم ہے، اب تک نہیں دیا گیا ہے، میں نے جہانتک چھان بین کی، اس کے حسب ذیل نتائج سامنے آئے،

۱۔ اس وقت تک شاعری کے جو اصناف رواج پذیر تھے، وہ قصیدہ، مثنوی اور قطعہ تھے، قصیدہ میں تیس چالیس بلکہ اس سے بھی زیادہ شعر ہوتے تھے، اور وہ عموماً مدح و ہجو میں کام آتا تھا، شروع میں تشبیب ہوتی تھی جس میں حسن و عشق کی روداد یا مناظرِ قدرت بیان کئے جاتے تھے، مثنوی رزم و بزم کے مسلسل واقعات و حکایات کیلئے مخصوص تھی، قطعہ میں مختصر واقعات نظم ہوتے تھے، چنانچہ ابتدا میں فلسفہ کے خیالات قصیدوں اور مثنویوں میں بھی ادا کئے گئے، سب سے پہلے فلسفی شاعر حکیم ناصر خسرو المتوفی ۴۳۱ھ نے ہر قسم کے فلسفیانہ خیالات قصیدوں ہی میں ادا کئے ہیں، تاہم حکمت و تصوف کے اچھوتے خیالات ایک نئی صنف سخن کے طالب تھے، تاکہ حسن و عشق کی روداد اور مدح و ذم کی حکایات سے تصوف و حکمت کے حقائق ظاہری و باطنی ہر طرف سے علٰحدہ ہو جائیں،

۲۔ حکما اور صوفیہ پیشہ ور شاعر نہ تھے، اُن کے شب و روز کے مشاغل کچھ اور تھے، شاعری ان کا پیشہ نہ تھا، اس لئے اُن کے ذہنی خیالات کی تحریر و ترتیب کے لئے قصائد

(بقیہ حاشیہ ص ۱۰۶) نام احمد بن نہرلی سبزواری لکھا ہے، اور کوئی بات نہیں لکھی ہے،

و ثنوی کے طویل الاشعار اصناف سخن کار آمد نہیں ہو سکتے تھے، نہ اُن کے پاس تعلیم و تصنیف و مطالعہ یا ذکر و فکر عبادت سے اتنا وقت نکل سکتا تھا کہ وہ قصیدہ یا ثنوی تصنیف کرنے بیٹھتے، کبھی سانس لینے کے لئے وہ کچھ کہہ لیتے تھے، اور اتنی تھوڑی دیر میں چار مصرعے کہہ کر الگ ہو جاتے تھے، اور پھر اپنے مشاغل میں لگ جاتے تھے،

۳- قصیدہ اور ثنوی میں مسلسل واقعات نظم ہوتے ہیں، اور غزل بحیثیت ایک مستقل صنف سخن کے اب تک پیدا نہیں ہوئی تھی، جس میں معنی کے لحاظ سے ہر شعر بجائے خود مستقل ہوتا ہے، کمال اسماعیل المتوفی ۶۳۶ھ نے اس طرز کا آغاز کیا، اور شیخ سعدی المتوفی ۶۹۱ھ نے اس کو کمال کو پہنچایا، اس لئے فلسفہ و حکمت کے مختصر متفرق خیالات کے لئے رُباعی کے سوا کوئی چیز اس وقت موجود نہ تھی،

۴- فارسی میں اسلام کے بعد موسیقی کا رواج سامانی درباروں میں شروع ہو چکا تھا، مگر یہ معلوم نہیں کہ فارسی میں گایا کیا جاتا تھا، قصیدہ اور ثنوی گانے کی چیز نہ تھی، غزل پیدا نہیں ہوئی تھی، البتہ چھوٹی بحروں کے مختصر قصیدے جن کو متاخرین کی اصطلاح میں غزل کہہ لیجئے، گائے جا سکتے تھے، جس طرح کہ رودکی نے اپنی یہ نظم "بوے موے جولیاں آید ہمی" جس میں سات شعر ہیں، امیر نصر سامانی کے سامنے گائی تھی، مگر ایسی نظمیں کم ہوتی تھیں، میرا خیال ہے کہ غنا و موسیقی کے کام میں اس وقت اکثر یہی رُباعی آتی تھی، صوفیہ جو سماع کے شائق تھے، اُن کے لئے اسی سبب سے رُباعی موزوں تھی، غالباً یہی وجہ ہے کہ شروع شروع میں رُباعی کو ترانہ (راگ) کہتے تھے، محمد بن قیس رازی (موجود ۶۲۳ھ) کی مجم فی معاییر اشعار العجم کی حسب ذیل عبارت سے یہ بات مترشح ہوتی ہے،

"و بحکم آں کہ نشد و نشتی، و بادی و بانی آں وزن کود کے بود نیک موزوں و

دلبر و جوانی سخت تازہ و تر آں را ترانہ نام نہاد و مایۂ فتنۂ بزرگ را سر بجہاں در داد،
وہمانا طالع ابداع این وزن برج میزان بودہ است..... کہ خاص و عام مفتون این
نوع شدہ اند و عالمی و عامی مشغوف این شعر گشتہ: زاہد و فاسق را دراں نصیب و
صالح و طالح را بداں رغبت کز طبعہائی کہ نظم از نثر نشناسند و از وزن و ضرب خبر ندارند
بہانہ ترانہ در رقص آیند، مردہ دلانی کہ میان لحن موسیقار و نہیق حمار فرق نہ کنند و از
لذت بانگ چنگ بہزار فرسنگ دور باشند بر دو بیتی جان بدہند، بسا دختر خانہ
کہ بر ہوس ترانہ در و دیوار خانۂ عصمت خود درہم شکست، بسا ستی (خاتون) کہ بر عشق
دو بیتی تار و پود پیراہن عفتِ خویش برہم گسست و بتحقیق، ہیچ وزن از اوزان
مُبتدع و اشعار مخترع کہ بعد از خلیل احداث کردہ اند، بدل نزدیک تر، و در طبع
آویزندہ تر ازین نیست و بحکم آن کہ اربابِ صناعتِ موسیقی بریں وزن الحان شریف
ساختہ اند، و طرق لطیف تالیف کردہ و عادت چناں رفتہ است کہ ہر چیز ازاں
جنس بر ابیاتِ تازی باشد آن را قول خوانند و ہر چہ بر مقطعات پارسی باشد آن را غزل
خوانند، اہلِ دانش ملحونات این وزن را ترانہ نام کردند"

(ص ۸۹ و ۹۰)

۵۶۰ھ میں سلطان تکش خوارزم شاہ کے دربار میں مصنف جہاں کشا کے پردادا
نے سلطان کی مدح میں ایک رُباعی پڑھی، کہتا ہے :-

"جد پدرم این رُباعی بداہتہً گفت"

لطفت شرفِ گوہر مکنون ببرد — جود کفِ تو رونق جیحون ببرد
حکم تو بیک لحظہ اگر رائے کنی — سودائے محال از سر گردوں ببرد

سلطان بریں ترانہ تا شبانہ شراب[۱] نوشید"

یہ دربار سلطانی کی مثالیں ہیں، صوفیوں کی خانقاہوں میں رباعی کا نغمہ اس سے بھی زیادہ پہلے سنائی دیتا ہے۔ نشوار المحاضرہ و اخبار المذاکرہ جو قاضی ابو علی محسن تنوخی المتوفی ۳۸۴ھ کی تصنیف ہے۔ اس میں ایک واقعہ کے ضمن میں ہے،

حضرنی ابو احمد عبد اللہ بن عمر الحارثی و عندہ صوفی یترنم بشیئ من الرباعیات[۲]،	ابو احمد عبداللہ بن عمر حارثی میرے پاس آئے، اور اس وقت ایک صوفی میرے پاس بیٹھا تھا جو کچھ رباعیاں گا رہا تھا،

یہ واقعہ ظاہر ہے کہ مصنف کے سال وفات ۳۸۴ھ سے پہلے کا ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ خیام بلکہ سلطان ابو سعید ابوالخیر سے بھی پہلے صوفی اور رباعی میں مناسبت پیدا ہوگئی تھی، اور صوفیوں کی مجلس میں یہ سماع و ترنم کے کام میں آتی تھی، محمد بن علی راوندی جس نے اپنی تاریخ سلجوقیہ راحۃ الصدور ۵۹۹ھ میں لکھی ہے، امام غزالی المتوفی ۵۰۵ھ کی مجلس سماع کا ایک واقعہ ان لفظوں میں لکھا ہے،

"وقتے در سماع کہ فتوح روح و آسائش عاشقاں مجروح بود، صوفیاں را صفائے دروں ظاہر شدہ و عارفاں را حالت آمدہ مطربے بلحنے خوش و آوازے دلکش بر نوائے نے نہ بر ادائے نائے ایں ترانہ بساختہ بود و ایں

---

[۱] تاریخ جہاں کشا علاء الدین عطا ملک جوینی ص ۲۸ گب [۲] نشوار المحاضرہ قاضی تنوخی ج ۱ مطبوعہ مطبعہ امین ہندیہ مصر، مارگولیتھ،

بیت در انداختہ"

دارم سخناں تازہ وزرِ کہن	آخر بکف آرمت بزر یا بسخن

امام غزالی حاضر بود از سر وجدے گفت زر اچہ محل سخن سخن سخن[1]،

کتاب مذکور میں رباعی کا دوسرا شعر مذکور نہیں،

خود خیام کی رباعیات خیام کے بعد چھٹی صدی میں صوفیوں کے حال وقال کی مجلسوں میں پڑھی جاتی تھیں، اخبار الحکما قفطی میں ہے[2]،

وقد وقف متاخر الصوفیۃ	اور پچھلے صوفیوں نے اس کے اشعار
علیٰ شیٔ من ظواھر شعرہٖ	کے کسی قدر ظاہری مطالب پر
فنقلوھا الی طریقتھم و	اطلاع پائی، تو اُن کو اپنے مشرب
تحاضروا بھا فی مجالسھم	میں ڈھال لیا، اور اپنی مجلسوں
وخلواتھم،	اور خلوتوں میں ان کو پڑھ کر ایک
	دوسرے کو سُنایا،

۵۔ رُباعی کے وزن کو موسیقی کی لے سے کوئی خاص مناسبت نہ تھی، اس کا ایک اور ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ رُباعی کا پہلا موجد شاعر رودکی، اور پہلا رباعی گو حکیم ابو نصر فارابی دونوں موسیقی کے مشہور استاد تھے، رودکی وہی ہے جس نے

بوے جوے مولیاں آید ہمی

---

[1] راحۃ الصدور راوندی (ص ۹۶ گب) [2] اخبار العلماء باخبار الحکماء جمال الدین قفطی تذکرہ خیام،

گا کر امیر سامانی کو بے اختیار بخارا کے سفر پر آمادہ کر دیا تھا[۱]، اور فارابی وہ ہے جو ایک دفعہ اپنے نغمہ و ساز سے مشہور دیلمی وزیر صاحب ابن عباد کی محفل کو مست خواب بنا کر چلا گیا تھا[۲] اور جس نے ایک موقع پر سیف الدولہ حمدانی کے دربار کو محو حیرت بنا دیا تھا[۳]، ابھی حال میں پیرس سے فارابی کی موسیقی کبیر چھپ کر شائع ہوئی ہے،

---

[۱] تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی احوال رودکی، [۲] درۃ الاخبار ذکر ابو نصر فارابی،
[۳] ابن خلکان تذکرۂ ابو نصر فارابی،

(معارف اپریل ۱۹۳۲ء)

محمّد بن عُمر الواقدی

اور

سیرت میں علمائے مستشرقین کی ایک نئی غلطی

سیرت کے مشہور راویوں میں سے ایک محمد بن عمر واقدی ہے، ۱۳۰ھ میں پیدا ہوا، اور ۲۰۷ھ میں وفات پائی، مدینہ منورہ میں پیدائش ہوئی، اور بغداد میں سکونت اختیار کی، اور قضاء کا منصب حاصل کیا، ابتدائی مصنفینِ سیرت میں اُس کا شمار ہے، سیرت میں اُس کی ایک کتاب ہے، جس کا نام کتاب المغازی ہے، جس میں عہدِ نبوت کی لڑائیوں کا حال لکھا ہے، اگلے مصنفین کا یہ حال تھا کہ چونکہ وہ ہر واقعہ کو اور واقعہ کے ایک ایک جزو کو الگ الگ سلسلہ سے بیان کرتے تھے، اس لئے واقعہ کا تسلسل بیچ بیچ سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا، جس سے عام لوگوں کی دلچسپی کم ہو جاتی تھی، واقدی نے یہ طرز اختیار کیا کہ پورے واقعہ یا پورے غزوہ کے سارے راویوں کا نام شروع میں گنا دیا، اور ایک دلچسپ مسلسل داستان کی صورت میں پورے واقعہ یا پورے غزوہ کو بیان کر دیا، اس طرز سے عام لوگ جو روایتوں کے پُرپیچ عالمانہ سلسلوں میں پھنس کر اپنا لطفِ مطالعہ

نہیں کھونا چاہتے تھے، انھوں نے اسکی کتاب کو بیحد پسند کیا، اور خلفاے عباسیہ اور دیگر امراے برامکہ کی نگاہ میں اُس نے بڑا رتبہ پیدا کیا، لیکن جس قدر امرا، و سلاطین کے یہاں اس کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوا، اسی قدر علماے زمانہ، ائمہ حدیث اور معتبر بزرگون کی سندِ اعتبار سے اس کو دوری حاصل ہوتی گئی،

اس بات پر مخالف و موافق رائیں شہادتیں متفق ہیں کہ اس کا حافظہ نہایت قوی تھا، اور اسی قوتِ حافظہ کی بنا پر اس کو خاص امتیاز ہے، چنانچہ اس کے کاتب محمد بن سعد نے طبقات (۵-۳۱۴) میں لکھا ہے،

وکان عالمًا بالمغازی و السیرة والفتوح وباختلاف الناس فی الحدیث والاحکام واجتماعھم علی ما اجتمعوا علیہ،	وہ مغازی، سیرۃ، فتوحات اور حدیث و احکام میں لوگوں کے اختلافات، اور جن امور پر اُن کا اجماع ہے، اُدن کا عالم تھا،

مجاہد بن موسیٰ کا قول ہے کہ میں نے واقدی سے زیادہ قوت حفظ رکھنے والا نہیں دیکھا، حافظ ذہبی میزان میں اس قول کو لکھ کر کہتے ہیں،

قُلت وصدق کان الی حفظہ المنتھٰی فی الاخبار والسیر والمغازی والحوادث وایام الناس والفقہ وغیر ذلک،	میں کہتا ہوں یہ بات سچ ہے کہ واقدی کا حافظہ تاریخ، سیر، غزوات، وقائع اور لوگوں کے حالات، اور فقہ میں انتہا کو پہونچا ہوا ہے،

مُصعب زبیری کہتے ہیں:۔

واللّٰہ ما رأینا مثل الواقدی	بخدا ہم نے واقدی کا مثل
قط	نہیں دیکھا۔

خطیب بغدادی اپنی تاریخ میں کہتے ہیں:۔

ھو ممن طبق الارض	یہ اُن لوگوں میں سے ہے جس کی
شرقھا وغربھا ذکرہ	شہرت نے زمین کے مشرق و
ولم یخف علی احد عرف	مغرب کو گھیر لیا ہے، اور جو شخص
اخبار الناس امرہ وسارت	کہ تاریخ سے واقف ہے، اس
الرکبان بکتبہ فی فنون العلم	سے اس کا حال چھپا نہیں ہے،
من المغازی والسیر و	مغازی، سیر، طبقات، اور
الطبقات واخبار النبی	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
صلعم والاحداث الکائنۃ	حالات، اور جو واقعات آپ کے
فی وقتہ وبعد وفاتہ.	زمانہ میں ہوئے، اور آپ کی
	وفات کے بعد ہوئے ان چیزوں
	میں اُس کی کتابوں کو لوگ ہر جگہ لئے
	پھرتے ہیں،

یہ واقدی کے علم و حفظ کے وہ واقعات ہیں، جن پر سب کا اتفاق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ واقدی وثوق، اعتبار، اور سند کے لحاظ سے کس رُتبہ کا آدمی ہے بعض لوگوں نے اُس کے موافق بھی شہادت دی ہے، مگر فن کے ناقدوں اور رجال کے واقف کار دل

کا بڑا حصہ جس میں امام شافعی امام ابن حنبل، امام بخاری وغیرہ داخل ہیں، اس کو بے اعتبار جھوٹا اور دروغ گو کہتا ہے، اور اسی لئے اس کی روایتوں کو محدثوں نے حدیث کی کتابوں میں جگہ نہیں دی ہے اور نیز علماء کے نزدیک اس کی کتاب المغازی کو وہ حیثیت نہیں حاصل ہوئی جو محمد بن اسحاق کی سیرت کو حاصل ہوئی، بہر حال واقدی کی کتاب المغازی ایک نادر و کمیاب کتاب تھی، اور ہم علمائے مستشرقین کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کو چھاپ کر نفع عام کیا۔

۱۸۵۰ء کے پیش و پیش عہد میں جرمن عالم ڈاکٹر اسپرنگر کے بدولت ہندستان میں عربی کتابوں کی اشاعت کا نادر موقع بہم پہونچا، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال نے اس باب میں خاص اہمیت حاصل کی، اصحابہ کے حالات میں حافظ ابن حجر کی تصنیف الاصابہ فی تمیز الصحابہ کی اشاعت سے ڈاکٹر اسپرنگر اور ایشیاٹک سوسائٹی کو خاص شہرت حاصل ہوئی اور اسی کیساتھ ڈاکٹر اسپرنگر پہلے یورپین عالم ہیں، جنھوں نے عربی ماخذوں سے "دی لائف آف محمد" ترتیب دی اور اس لئے اُس نے یورپ کے علمی حلقوں میں ایک جگہ پیدا کر لی۔

اے وان کریمر (A. von Kremer) جو مشہور یورپین مستشرق ہیں، اور سرکاری تعلق یعنی آسٹریا کے وکیل مطلق کنسولیٹ جنرل کی حیثیت سے اسکندریہ (مصر) میں مقیم تھے، انھوں نے واقدی کی کتاب المغازی کا واحد نایاب نسخہ دمشق کے ایک کتب خانہ میں پایا، جون ۱۸۵۲ء میں ڈاکٹر اسپرنگر نے اسکندریہ میں الفرڈ وان کریمر صاحب سے ملاقات کی، اور اُن کی کتاب المغازی واقدی کا نسخہ دیکھا، اور ان کو آمادہ کیا کہ ببلوتھیکا انڈیکا کے سلسلہ میں وہ اس کو مرتب

(اڈٹ) کریمر، اور بنگال ایشیاٹک سوسائٹی میں چھپوائی، فروری ۱۸۵۶ء
میں جب وہ ہندوستان آئے، تو یہ کتاب چھپ چکی ہے، یعنی ۱۸۵۵ء میں چھپ
چکی تھی، بہر حال ابن ہشام کے بعد سیرت نبوی میں یہ دوسرا ابتدائی ماخذ تھا، جو
یورپ کے ہاتھ آیا، اس نے اس کے ساتھ خاص اہتمام برتا گیا، ولہاوسن نے
۱۸۸۲ء میں "محمد مدینہ میں" کے عنوان سے جرمنی میں اس کا ترجمہ شائع کیا، جو
بڑی حد تک یورپ کے مستشرقوں میں سند اور ماخذ قرار پایا، چنانچہ ۱۹۰۵ء میں
پروفیسر مارگیولیوتھ نے انگریزی میں "محمد اور ترقی اسلام" کے نام سے سیرۃ میں
جو فاضلانہ کتاب تصنیف کی ہے، اور جس میں پہلی دفعہ ایک مستشرق نے سیرۃ میں
احادیث کو ماخذ قرار دیا ہے، اس لئے وہ خاص اعتبار کی مستحق ہے، اس میں بھی وہ
ولہاوسن سے مستغنی نہ ہو سکے، اور کتاب المغازی کے اصل عربی نسخہ کے بجائے، ولہاوسن
ہی کے ترجمہ کو انھوں نے قابل قبول سمجھا،

اتنی تمہید کے بعد اب اصل مقصد سنیے، ابھی حال میں مانچسٹر گارجین اخبار
(انگلستان) میں ایک مضمون نکلا ہے، جس میں مضمون نگار نے ایسے فقرے لکھے ہیں
جن سے حضور انور صلعم کی شان میں گستاخی ہوتی ہے، منجملہ ان کے ایک فقرہ یہ ہے،
کہ "آپ ایسے بزدل اور ڈرپوک تھے کہ بدر میں جب خون بہتے دیکھا، تو آپ کو غش
آگیا،" ایک مسلمان نے مضمون نگار سے اس واقعہ کا حوالہ دریافت کیا، تو اُس نے
مارگیولیوتھ کی کتاب کا حوالہ دیا، مارگیولیوتھ نے اس واقعہ کو اپنی کتاب
(ص ۲۵۹) میں بے حوالہ نقل کیا ہے، اس لئے مارگیولیوتھ صاحب سے اس کا ماخذ
دریافت کیا گیا، تو انھوں نے واقدی کے جرمن ترجمہ ولہاوسن کا حوالہ دیا، اتنی

واقدی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کی بحث چھڑ گئی، جناب خواجہ کمال الدین صاحب نے پچھلی ڈاک سے یہ پوری خط و کتابت میرے پاس بھیج دی ہے، اس کو پڑھ کر یورپین مستشرقین کے علمی تبحر اور فضل و کمال کی ایک اور عمدہ مثال ہاتھ آگئی، پروفیسر مارگیولیوتھ اپنے گرنامہ میں لکھتے ہیں،

مورخہ ۴ر نومبر ۱۹۲۵ء آکسفورڈ

"جناب من! میرا خیال ہے کہ مضمون نگار نے "محمد اور ترقی اسلام" کے حسب ذیل فقرہ کا حوالہ دیا ہے، (ص ۲۵۹) "جب خون کا پہلا قطرہ بہایا گیا، تو پیغمبر اپنے جھونپڑے میں واپس آئے، اور نڈھال ہو کر غش کھا گئے" Fainted یہ بعینہٖ واقدی کے الفاظ ہیں، برٹش میوزیم ۱۶۱۷ء جس کا ترجمہ ولہاوسن نے "محمد مدینہ میں" کے عنوان سے برلن میں ۱۸۸۲ء میں کیا ہے، (ص ۵۴) کہ "جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں، تو محمد نڈھال ہو کر غش کھا گئے (Fainted) واقدی آگے کہتا ہے "محمد بہر حال بہت جلد ہوش میں آ گئے" روایت کی دوسری شکل یہ ہے کہ (ص ۵۰) کہ جب لڑائی شروع ہوئی تو محمد نے دعا کی، ابوبکرؓ نے تسلی دی" صحیح مسلم مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۹ھ جلد ۲ ص ۱۵۵ اور واقدی ص ۵۵ سے ظاہر ہے کہ یہ دعا اس بے ہوشی کے دورہ سے افاقہ کے بعد مانگی گئی تھی، میں نے واقدی کے اس فقرے کو کہ "جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں، اس طرح ادا کرنے میں کہ "جب خون کا پہلا قطرہ گرایا گیا، خود واقدی کا مطلب ادا کر دیا ہے،"

خواجہ صاحب نے جب پروفیسر گیولیوتھ کو لکھا کہ واقدی کا حوالہ بے کار ہے کہ وہ مسلمانوں میں

معتبر نہیں تو موصوف نے یاقوت حموی کی کتاب معجم الادبار کی جلد، کا جو ہنوز ان کی اڈیٹر شپ میں زیر طبع ہے، اس کا حوالہ دیا کہ یاقوت نے لوگوں سے اس کی توثیق نقل کی ہے، خط کی عبارت یہ ہے:-

"مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۲۵ء

"جناب من!

میں فرصت کے وقت اس نقطہ پر غور کروں گا، جدھر آپ نے مجھ کو متوجہ کیا ہے، اور یہ مجھ کو اس صدمہ سے بھی نجات دلانے کے لئے تھوڑا سا وقت لے گا کہ آپ واقدی ایک مسلمان مورخ کو جو بہت سے مستند اصحاب کے نزدیک سب سے زیادہ معتبر ہے، ایک مشہور دروغ گو کہتے ہیں، وہ ائمہ اسلام جو واقدی کو اس نظر سے دیکھتے ہیں، یعنی یہ کہ وہ ہر حیثیت سے بالکل معتبر ہے، یاقوت نے معجم الادبار کی ساتویں جلد میں جو ابھی زیر طبع ہے اُن کو گنایا ہے"

سب سے پہلے ہم کو پروفیسر مارگیولیوتھ صاحب کے اس احسان کا شکریہ ادا کرنا ہے، کہ انھوں نے واقدی کی توثیق اور معتبر ہونے کے لئے یاقوت کا حوالہ دیا ہے، دنیا جانتی ہے کہ یاقوت کا شمار ناقدین حدیث اور علمائے اصول میں نہیں ہے، وہ صرف ادب وجغرافیہ و تاریخ کا آدمی ہے، اس کو اشخاص کی جرح و تعدیل سے کیا تعلق ہے؟ ہمارے پروفیسر صاحب کو واقدی کے معتبر شمار کرانے میں خاص انہماک ہے ۱۵ ۱۶ یا ۱۶ء میں جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے بلاوے پر ہندوستان آئے تھے، تو لکھنؤ میں گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا تھا، لیکن اس ملاقات میں بھی دانستہ یا نادانستہ

واقدی ہی کی معتبری و نامعتبری کی بحث چھڑ گئی تھی، میں نے کہا تھا کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے، جس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہو سکتا، تاریخ و سیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے آپ ملکہ الزبتھ کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں، پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ "امام شافعی کی نسبت کیا کہتے ہو، کہ وہ اس سے روایت کرتے ہیں"، میں نے کہا اگر یہ درست ہے تو محض روایت کرنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ امام نے اس کی توثیق کی ہے، درانحالیکہ کتب نقد میں یہ عبارت تصریح ہے کہ امام موصوف اس کی تصنیفات کو جھوٹ کا انبار کہا کرتے تھے،

بہرحال اب نجم الادبار کی اڈیٹری کی تقریب سے پروفیسر صاحب کو واقدی کے مداحوں کے چند نام اور ہاتھ آئے ہیں لیکن میں بتانا چاہتا ہوں کہ واقدی کی توثیق کے لئے ایک ادیب و جغرافی و اخباری کی تصنیف کے حوالہ کی ضرورت نہیں، واقدی کی حمایت میں جو اقوال اُنھوں نے جمع کئے ہوں گے، وہ ہماری نگاہوں سے مخفی نہیں ہیں، آٹھویں صدی میں یاقوت نے جو کچھ جمع کیا ہے، وہ سب آٹھ صدیوں کی جرح و تعدیل کی کتابوں میں مذکور ہے، محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر واقدی کا حامی اور مداح علامہ ابن سید الناس اندلسی المتوفی ۷۳۴ھ سے زیادہ کوئی نہیں، انھوں نے ان دونوں کے متعلق جس قدر توثیق اور استناد کے اقوال تھے، سب کو اپنی کتاب عیون الاثر فی فنون المغازی والتاریخ والسیر کے مقدمہ میں ... یکجا کر دیا ہے، اسی طرح امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں اُن کے مخالف و موافق جو کچھ کہا گیا ہے، سب جمع کر دیا ہے، اس سے کچھ زیادہ یاقوت کی متوقع جلد میں نہ ہوگا، نفس واقعہ غشی کی تحقیق کے لئے بحث کی تین منزلیں ہیں، واقدی کی حیثیت، اس کی

کتاب[۲] المغازی کی حیثیت اور اصل[۳] واقعہ کی صورت،

واقدی کی حیثیت — واقدی کے حافظہ اور کثرت معلومات کی شہادتیں اوپر گذر چکی ہیں، امام شاذکونی نے اس کے متعلق ایک نہایت ظریفانہ فقرہ کہا ہے کہ واقدی بہر حال بہت بڑا آدمی تھا، اگر وہ جھوٹا تھا، تب بھی بہت بڑا آدمی تھا، اور اگر سچا تھا تب بھی بہت بڑا آدمی تھا، واقدی کی ذات آج نہیں بلکہ ہمیشہ سے معرض بحث میں رہی ہے، اور اس کا سلسلہ خود اس کی زندگی میں شروع ہو چکا تھا، چھوٹے سے چھوٹا کوئی ایسا بد قسمت راوی شاید ہی ملے گا، جس کی ایک آدھ نے توثیق نہ کر دی ہو، اس لئے علماے اصول کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ مخالف یا موافق دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اور ان کو باہم تول کر اس کے متعلق قطعی فیصلہ کر دیتے ہیں، واقدی کا بھی یہی حال ہے چنانچہ اس کے متعلق مخالف و موافق دونوں پہلو حسب ذیل ہیں،

اُس کے موافق پہلو کا روشن ترحصہ یہ ہے کہ اس کے علم و حافظہ کی سب نے تعریف کی ہے، یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ امام مالک سے قتل سحر؟ کی نسبت دریافت کیا گیا تو امام نے فرمایا کہ دیکھو واقدی کے پاس اس کے متعلق کچھ ہے؟ لوگوں نے اس سے پوچھ کر امام مالک کو اطلاع دی تو لوگ کہتے ہیں کہ امام نے اس پر قناعت کی، اسی طرح ایک دفعہ اور امام سے کسی نے دریافت کیا، کہ خیبر کی اس یہودی عورت نے جس نے آپ کے کھانے میں زہر ملایا تھا، آپ نے کیا برتاؤ کیا، امام نے فرمایا کہ مجھکو اس کے متعلق کوئی علم نہیں، اہل علم سے دریافت کروں گا، چنانچہ امام نے واقدی سے ملاقات کی، تو دریافت کیا، وہ حلقہ میں آکر فرمایا کہ اہل علم نے یہ جواب دیا، دراوردی ایک ناقد حدیث ہیں، اُن سے کسی نے پوچھا کہ واقدی

کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟ انھوں نے جواب دیا تم واقدی کو مجھ سے پوچھتے ہو، تم واقدی سے مجھ کو پوچھو، یہی جواب ابو عامر عقدی اور معن بن عیسیٰ نے بھی دیا ہے،

ان اقوال کے علاوہ میزان الاعتدال، تہذیب التہذیب اور عیون الاثر میں جن علماء نے جن الفاظ میں اس کی توثیق کی ہے وہ حسب ذیل ہیں،

نام	اصل قول	ترجمہ
دراوردی	الواقدی امیر المومنین فی الحدیث،	واقدی حدیث میں مسلمانوں کا امیر ہے،
یعقوب بن شیبہ	حدثنی بعض اصحابنا انہ ثقۃ،	ہمارے بعض اصحاب نے کہا کہ وہ ثقہ ہے،
مصعب زبیری	ھو ثقۃ مامون	وہ ثقہ اور مامون ہے،
ابن نمیر	اما حدیثہ ھھنا فھو مستو اما حدیث اھل المدینۃ فھم اعلم بہ،	اس کی حدیث یہاں تو برابر ہے لیکن اہل مدینہ کی حدیث تو وہ اس سے زیادہ واقف ہیں، (یعنی اس کے متعلق وہ فیصلہ کریں)
ابراہیم الحربی	الواقدی امین الناس فی الاسلام،	واقدی اسلام میں لوگوں کا امین ہے،

لے تفصیل کے لئے دیکھو کتب مذکور حالات محمد بن عمر الواقدی،

نام	اصل قول	ترجمہ
محمد بن اسحاق الصغانی	لولا اِنّہٗ عندی ثقۃ ماحدثت بہٖ،	اگر وہ میرے نزدیک ثقہ نہ ہوتا تو میں اس سے روایت نہ کرتا،
یزید بن ہارون	الواقدی ثقۃ،	واقدی ثقہ ہے،
عباس عنبری	ھُواحب الیّ مِن عبدالرزاق	وہ مجھے عبدالرزاق سے زیادہ پسند ہے،
ابوعبید القسم بن سلام	ثقۃ	وہ ثقہ ہے،
مسیبی	ثقۃ	وہ ثقہ ہے،

یہ واقدی کے طرفداروں کی سب سے بڑی فہرست ہے، مگر یہ دیکھو کہ کیا ان میں کوئی بھی مشہور امام ہے؟ فن نقد کے اساطینِ اعلام میں سے کسی کا نام ہے؟ بے شبہہ یہ لوگ بھی قابلِ وقعت ہیں، اور اُن سے بڑی مخالف شہادتیں اگر موجود نہ ہوتیں، تو اُن کی موافق شہادتیں بڑا درجہ رکھتیں، مگر حالت یہ ہے کہ خود ان طرفداروں میں سے بھی جو لوگ اس کی حالت سے واقف ہو گئے، انھوں نے اُس کو چھوڑ دیا، چنانچہ ابن نمیر جنھوں نے یہ کہا ہے کہ "اس کی حدیث یہاں ٹھیک ہے" انھوں نے بھی اس کو چھوڑ دیا، (تہذیب) ابنِ سعد جو واقدی کا کاتب تھا اور جس سے اس کی حمایت کی اُمید ہو سکتی ہے، دو صفحوں میں اُس کا حال لکھا ہے، مگر ایک حرف بھی اُس کی توثیق اور اعتبار و استناد کے متعلق نہیں لکھا، امام شافعی فرماتے ہیں کہ "اس کی کتابیں جھوٹ کا انبار ہیں" سب سے بڑے ناقد فن اور امامِ حدیث امام بخاری اپنی "تاریخ صغیر" میں جو اس وقت اسماء الرجال کی سب سے پرانی دستاویز ہمارے پاس ہے، واقدی کے متعلق متقدمین کا یہ طرزِ عمل ظاہر کرتے ہیں

ہیں، (مطبوعہ الہ آباد ص ۲۲۸)

محمد بن عمر الواقدی ابو عبد اللہ	محمد بن عمر الواقدی ابو عبد اللہ اسلمی
الاسلمی مدنی قاضی بغداد	مدینہ کے ہیں، بغداد کے قاضی تھے،
ترکوہ،	محدثین نے اُن کو چھوڑ دیا ہے،

امام ممدوح کتاب الضعفاء الصغیر میں فرماتے ہیں، (مطبوعہ الہ آباد ص ۳۲)

متروک الحدیث	وہ متروک الحدیث ہے،

امام نسائی المتوفی ۳۰۳ھ جن کی تصنیف حدیث کی چھ معتبر کتابوں میں سے ایک ہے، اپنی تصنیف کتاب الضعفاء والمتروکین میں کہتے ہیں،

متروک الحدیث (ص ۲۲)	وہ متروک الحدیث ہے،

امام موصوف اسی کتاب میں لکھتے ہیں :- (ص ۳۵)

والکذابون المعروفون بوضع	اور وہ جھوٹے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم
الحدیث علی رسول اللہ صلی	پہ حدیث گھڑ کر بیان کرنے میں مشہور
اللہ علیہ وسلم اربعۃ ابن ابی یحیی	ہیں، چار شخص ہیں، ابن ابی یحیی،
بالمدینۃ والواقدی ببغداد	مدینہ میں، واقدی بغداد میں،
ومقاتل بن سلیمان بخراسان	مقاتل بن سلیمان خراسان میں،
ومحمد بن سعید بالشام،	اور محمد بن سعید شام میں،

ان متفق علیہ اماموں کے فتوے کے بعد واقدی کے طرفداروں کی حیثیت جس قدر رہ جاتی ہے، وہ ظاہر ہے، اب آگے چلیئے، رجال کی عام کتابوں تہذیب التہذیب ابن حجر، میزان الاعتدال ذہبی وغیرہ کا جائزہ لیجئے، امام بخاری کے استاد ابن مدینی کہتے ہیں،

عندہ عشرون الف حدیث یعنی مالها اصل وقال فی موضع آخر لیس هو بموضع للروایة وابراهیم بن یحیی کذاب وهو عندی احسن حالًا من الواقدی،

واقدی کے پاس ۲۰ ہزار حدیثیں ہیں یعنی ان کی کوئی اصل نہیں ہے، دوسری جگہ وہ کہتے ہیں، کہ واقدی روایت کے کسی مرتبہ میں نہیں ہے، ابراہیم بن یحیی بڑا جھوٹا ہے، مگر واقدی میرے نزدیک اچھا ہے،

(تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۶، ۳۶۷)

ایک اور اُن کا قول ہے،

الهیثم ابن عدی اوثق عندی من الواقدی ولا ارضاه فی الحدیث ولا فی الانساب ولا فی شیء،

ہیثم بن عدی میرے نزدیک واقدی سے زیادہ قابلِ اعتبار ہیں، واقدی کو حدیث میں اور نہ نسبوں کے بیان میں اور نہ کسی اور چیز میں پسند کرتا ہوں

(تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۴ و ۳۶۵،
ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۱۰)

الواقدی یضع الحدیث:

واقدی حدیث جعلی بنایا کرتا ہے،

(میزان جلد ۳ ص ۱۱۰)

امام شافعی فرماتے ہیں،

کان بالمدینة سبع رجال یضعون الاسانید احدهم

مدینہ میں سات آدمی تھے جو اسناد جعلی بنایا کرتے تھے، ان میں ایک

الواقدی، (تہذیب جلد ۹ ص۳۶۷) واقدی ہے،

اہلِ سنت کے امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں،

الواقدی کذاب، واقدی بڑا جھوٹا ہے،

(تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۴)

لم یزل یدافع امرالواقدی
حتی روی عن معمر عن الزهری
وعن نبهان عن ام سلمة انهما
انتما نجاء بشیٔ لاحیلة فیه
(تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۳ و ۳۶۴)

واقدی کی طرف سے ہمیشہ مدافعت کی جاتی رہی، یہاں تک کہ اس نے معمر، زہری، نبہان، اور ام سلمہ کے مسلسل واسطے سے روایت کی تو اب اس کی مدافعت کا کوئی حیلہ باقی نہیں رہا،

ھو کذاب یقلب الاحادیث
(میزان جلد ۳ ص ۱۱۰)

وہ بڑا جھوٹا ہے، حدیثیں الٹ پلٹ ڈالتا ہے،

دیکھو فن کے اماموں نے اس کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے،

قال البخاری الواقدی متروک
الحدیث، ترکه احمد وابن المبارک
وابن نمیر واسماعیل بن زکریا
(تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۴)

بخاری نے کہا واقدی متروک الحدیث ہے، امام احمد، عبداللہ ابن مبارک، ابن نمیر، اور اسماعیل ابن زکریا نے اس کو چھوڑ دیا،

علی بن مدینی بغداد آئے، تو وہاں کے شیوخ کے حلقوں میں پھرے، واقدی کے حلقہ میں چلنے کی اُن کے رفیق نے سفارش کی تو ان کو متردد پایا، بالآخر بغداد کے امام احمد

ابن حنبل کو لکھ کر استصواب کیا، امام نے یہ جواب دیا۔

كيف تستحل ان تكتب حديث
رجل روى عن معمر حديث بنهان
(تهذيب ج ۹ ص ۳۶۴)

تم اس شخص سے حدیث لکھنا کیسے
جائز سمجھتے ہو جس نے معمر سے بنہان
والی حدیث روایت کی،

فن نقد کے امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں،

ضعيف ليس بشئ كان يقلب
حديث يونس بغيره عن معمر
ليس بثقة۔
(تهذيب جلد ۹ ص ۳۶۴)

ضعیف ہے، وہ کچھ نہیں، وہ یونس
والی حدیث دوسرے کے نام بدل
دیتا تھا، وہ ثقہ نہیں ہے،

ليس بثقة لا يكتب حديثه
(میزان جلد ۳ ص ۱۱۰)

وہ ثقہ نہیں اس کی حدیث نہ
لکھی جائے،

صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ایک ابوداؤد کہتے ہیں،

لا اكتب حديثه ولا احدث
عنه ما اشك انه كان يفتعل
الحديث،
(تهذيب جلد ۹ ص ۳۶۶)

میں اس کی حدیث نہیں لکھتا، اور
نہ اس سے روایت کرتا، مجھ کو کوئی
شک نہیں ہے، کہ وہ حدیث جعلی
بنایا کرتا تھا،

امام ترمذی کے شیخ بندار کہتے ہیں،

ما رأيت اكذب منه،
(تهذيب جلد ۹ ص ۳۶۷)

میں نے اس سے زیادہ جھوٹا نہیں
دیکھا،

اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں،

ھو عندی ممن یضع الحدیث	میرے نزدیک وہ اُن لوگوں میں
(تھذیب ج ۹ ص ۳۶۷)	ہے، جو حدیث وضع کیا کرتے تھے،

ابوزرعہ رازی، ابوبشر دولابی اور عقیلی کہتے ہیں،

متروک الحدیث،	اس کی حدیث چھوڑ دی گئی ہے،

(تھذیب ج ۹ صفحہ ۳۶۷)

ناقد حدیث ابوحاتم رازی کہتے ہیں کہ انھوں نے اور محدثین نے کیونکر اس کا امتحان لیا،

وجدنا حدیثه عن المدینین	ہم نے مدینہ والوں سے اوس کی حدیث
عن شیوخ مجهولین مناکیر	نامعلوم شیوخ سے روایت کی ہوئی
قلنا یحتمل ان تکون تلک الاحادیث	منکر پائی، ہم نے کہا کہ ممکن ہے کہ
منه ویحتمل ان تکون منهم ثم	یہ اس کی کارروائی ہے، یا اس کے
نظرنا الی حدیثه من ابی ذئب	ان نامعلوم استادوں کی ہو، پھر
ومعمر فانه یضبط حدیثهم	ہم نے غور سے اس کی حدیث کو جو
فوجدنا لا قد حدث عنهما	ابن ابی ذئب اور معمر سے تھی دیکھا
بالمناکیر فعلمنا انه منه فترکنا	کیونکہ وہ ان لوگوں کی حدیثوں
حدیثه،	میں ضبط رکھتا تھا، تو پایا کہ اوس
	نے ان دونوں بزرگوں سے بھی منکر
(تھذیب جلد ۹ ص ۳۶۷)	روایتیں کی ہیں، تو ہم نے جان لیا کہ یہ
	کی کارروائی ہے، تو پھر ہم نے اس کی

ابو حاتم اور نسائی کا بیان ہے،

یضع الحدیث	وہ حدیث وضع کرتا تھا،

دار قطنی:۔

فیه ضعف (میزان جلد ۳ ص ۱۱۰)	اس میں کمزوری ہے،

جوزجانی:۔

لم یکن مقنعاً (تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۸)	وہ تسلی دینے والا نہیں،

ابن عدی:۔

احادیثه غیر محفوظة و	اس کی حدیثیں غیر محفوظ ہیں، اور
البلاء منه،	آفت اسی سے ہے،

(عیون الاثر جلد ۱ ص ۲۰)

واقدی کے متعلق اس کے معاصرین اور اُس کے قریب العہد ناقدین کی جن میں اسلام کے نامور ترین علماء اور ائمہ داخل ہیں، یہ رائیں ہیں، غور کرو، کہ ایسا شخص سیرت کے اہم مباحث میں کوئی قابل وقعت سند بن سکتا ہے، متاخرین نے اس کی نسبت جو آخری اور اختتامی فیصلہ کیا ہے، وہ بھی سُن لیجئے،

امام نووی (صحیح مسلم کے شارح)، شرح مہذب کتاب الغسل میں لکھتے ہیں،

الواقدی ضعیف باتفاقهم	واقدی بالاتفاق ضعیف ہے،

(تہذیب ج ۹ ص ۳۶۷، ۳۶۸)

امام ذہبی میزان میں کہتے ہیں:۔

استقر الاجماع علی وهن	واقدی کے ضعیف ہونے پر اجماع

الواقدی (میزان ج ۳ صفحہ ۱۱۱) ہو چکا ہے،

علامہ زرقانی مالکی سیرت کی سب سے مشرح و مبسوط کتاب شرح مواہب میں غزوۂ بدر کے بیان میں واقدی کی نسبت لکھتے ہیں،

الحافظ المتروک مع سعة علمه، (شرح الزرقانی علی المواهب اللدنیه جلد اول ص۴۴) | حافظ باوجود اپنی وسعت علم کے متروک،

غرض بالاتفاق متروک ہے یعنی چھوڑ دیا گیا ہے اور اس کی روایت سے پرہیز کیا جاتا ہے، اس لئے وہ استناد کے قابل نہیں، ابن سید الناس نے عیون الاثر میں محمد بن اسحاق اور محمد بن عمر الواقدی دونوں کی توثیق و جرح کے اقوال یکجا کئے ہیں، اور جرح کے جوابات دینا چاہتے تھے ہیں، چنانچہ محمد بن اسحاق کی جرح کے جوابات بہت جوش و خروش سے دیئے ہیں، مگر محمد بن عمر الواقدی کی جرح کے جوابات نہ دے سکے، اور شروع ہی میں سپر ڈال دیا کہ

اما الکلام فیه فکثیر" (عیون الاثر جلد ۱ ص ۲۰) | اس پر اعتراضات بہت زیادہ ہیں،

واقدی کی کتاب کی حیثیت

خود مصنف کی حیثیت متعین ہو جانے کے بعد اس کی تصنیف کی حیثیت بھی متعین ہو جاتی ہے، ایسے غیر معتبر، دروغگو، اور جھوٹے کی روایتوں کے مجموعہ کا کیا درجہ استناد ہو سکتا ہے، اسی لئے امام شافعی فرماتے ہیں:-

کتب الواقدی کلها کذب (تہذیب جلد ۹ ص ۳۶۶) | واقدی کی تمام کتابیں جھوٹ ہیں،

امام دارقطنی فرماتے ہیں:-

الضعف يتبين على حديثه، — اس کی روایت پر ضعف نمایاں ہے،

(تہذیب ج ۹ ص ۳۶۸)

واقدی کا طرز تصنیف بتا چکا ہوں کہ وہ راویوں کے متعدد ناموں کو یکجا کر کے پورا واقعہ بلکہ پوری کتاب قصہ کی طرح بیان کر دیتا ہے جس سے یہ بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ یہ خاص خاص روایتیں اُس نے کہاں سے لی ہیں، اسی لئے اس کی کتابیں غیر معتبر سمجھی جاتی ہیں۔ اسی کتاب المغازی کو لیجئے جو وان کریمر کے جمع و تحشیہ سے کلکتہ میں چھپی تھی، کہ اس کے شروع میں ایک ہی جگہ اپنے ۲۵ شیوخ کے نام لکھدیئے ہیں، اور کہدیا کہ "ان میں سے بعض کی باتیں بعض میں مل گئی ہیں" (ص ۱ و ۲) اور اُس کے بعد بے سند مسلسل ایک کہانی کی طرح غزوات کے تمام حالات بیان کر دیئے ہیں کہیں کہیں سند الگ بھی آنی جاتی ہے۔ مگر منقطع بہر حال یہ ابتدائی سندیں بھی صرف اُس کے شیوخ کی ہیں، اُن کے آگے کے راویوں کا اس نے کوئی پتہ نہیں دیا ہے۔ اس لئے ایسی روایتوں کے مجموعہ کی محدثین میں کیا وقعت ہو سکتی ہے، اسی لئے واقدی کی کتاب المغازی اہلِ نقد میں کوئی درجہ نہیں رکھتی، چنانچہ امام احمد ابن حنبل نے واقدی کی اس طرز تالیف کی بنا پر اُس کی کتاب کو غیر مسلّم ٹھہرایا ہے۔ ([illegible]) ابراہیم حربی واقدی کے ایک طرفدار نے یہ کہا ہے کہ "اگر یہ واقدی کا عیب ہے تو زہری اور ابن اسحاق نے بھی یہ طرز اختیار کیا ہے[1]"۔ مگر یہ جواب اس لئے صحیح نہیں کہ زہری اور ابن اسحاق کی شخصیت بجائے خود بلند ہے، اس کے علاوہ انھوں نے کہیں کہیں یہ طرز اختیار کیا ہے، پوری کتاب کی یہ حالت انھوں نے نہیں بنا دی ہے، اور واقدی نے اپنی ذاتی کمزوری اور بے اعتباری کے ساتھ ساتھ عموماً یہ طریقہ اختیار کر لیا، اس لئے اس کی کتاب پایۂ اعتبار سے گر گئی، اور سند کے قابل نہیں رہی، پوری کتاب میں شاذ و نادر ہی اُس کے

[1] عیون الاثر ج ۱ ص ۱۰

یہاں پوری سند موجود ہے، اگر کہیں کہیں ہے بھی تو کسی ابتدائی عینی شاہد تک تو وہ پہنچتی ہی نہیں اور جہاں پہونچتی بھی ہے تو اُس کے رواۃ ناقابلِ اعتبار ہیں، اس لئے اس کتاب کے ایسے واقعات جو دوسری معتبر کتابوں میں موجود نہ ہوں ناقابلِ تسلیم ہیں،

واقعہ کی اصلیت | اب اتنی تمہیدوں کے بعد بدر میں آپ کے ڈر کر بے ہوش ہو جانے کی روایت پر غور کیجئے، اگر یہ واقعہ بالفرض واقدی کی کتاب المغازی میں ہو بھی تو اس کی حیثیت کا اندازہ آپ مصنف اور تصنیف کی حیثیت سے لگا چکے ہوں گے، اور آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ ایسے جھوٹے بے اعتبار جعلی حدیث بنانے والے کی روایت کا کیا درجہ ہوگا، یہ واقعہ واقدی کی جس روایت پر مبنی ہے، واقدی نے اس کا سلسلۂ سند مطلق نہیں بیان کیا ہے جس سے معلوم ہو کہ اُس سے کس نے بیان کیا، اور اُس نے کس سے سُنا، اور اُس کا آخری شریک واقعہ عینی گواہ کون ہے، غرض مطلق بے سند بات ہے، اور سیرت اور حدیث کی کسی کتاب سے اس کی تصدیق و تائید نہیں ہوتی،

بہرحال اس خاص واقعہ کی تحقیق کے سلسلہ میں جب مارگیولیتھ صاحب کی کتاب "محمد اور ترقی اسلام" (محمد اینڈ دی رائز آف اسلام) اور ولہاؤسن کی "محمد مدینہ میں" کا اقتباس بغور دیکھا، اور اس کا وان کریمر کے شائع کردہ اصل عربی متن سے مقابلہ کیا، تو معلوم ہوا کہ اس دروغ بافی میں بےچارہ واقدی کا اتنا قصور نہیں جس قدر خود ولہاؤسن صاحب اور مارگیولیتھ صاحب کا ہے۔" اول ظلم در جہاں اندک بود، ہر کہ آمد بران مزید کرد۔"

سب سے پہلے آپ مارگیولیتھ صاحب کی روایت پڑھئے۔

"جب خون کا پہلا قطرہ گرایا گیا تو پیغمبر اپنی جھونپڑی میں واپس آیا، اور غش کھا گیا جب وہ ہوش میں آیا تو اُس نے اپنا وقت دعا کے نذر کیا، تاکہ وہ یہ دکھائے کہ وہ

بالکل ہوشیار تھا" (ص ۲۵۹)

مارگیولیوتھ صاحب اپنے اس اختراعِ فائقہ کا ماخذ واقدی کے جرمن ترجمہ کو بتاتے ہیں، جس کا مترجم ولہاؤسن ہے، اور جس نے اس کا نام "محمد مدینہ میں" رکھا ہے،

"جب فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں، تو محمد کو غش آگیا،.... بہرحال وہ بہت جلد ہوش میں آگئے،"

(برلن ۱۸۸۲ء ص ۵۴)

اب آئیے اور واقدی کی کتاب لمغازی کھولیں: اس میں کیا ہے، اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:-

"پھر عتبہ نے اپنے مقابلہ کے لئے (مسلمانوں کو) پکارا، اور رسول صلعم اپنے عریشہ میں تھے، اور آپکے صحابہ اپنی صفوں میں تھے، تو آپ لیٹ گئے، تو آپ کو نیند نے چھا لیا، جو آپ پر غالب آگئی تھی، اور فرمایا تم اس وقت تک نہ لڑو، جب تک میں تم کو اجازت نہ دوں، اور اگر وہ تمھارے قریب آ جائیں، تو ان کو تیر مارو، اور تلوار اُس وقت تک نہ کھینچو، جب تک وہ تم پر چھا نہ جائیں، ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا یا رسول اللہ! لوگ قریب آگئے، اور انھوں نے ہم کو پا لیا، تو رسول اللہ صلعم بیدار ہوئے، اور خدا نے آپ کو کافروں کو خواب میں تھوڑا کرکے دکھایا، اور بعض کو بعض کی آنکھوں میں تھوڑا کرکے دکھایا، تو رسول اللہ بے قرار ہوئے، اور دونوں ہاتھ اپنے اٹھائے تھے، اپنے رب سے موعودہ نصرت مانگ رہے تھے"

(کتاب لمغازی واقدی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۵ء (وان کریمر)

ناظرین غور کریں کہ بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی، واقدی تو نیند کا ذکر کرتا ہے،

دلماؤسن اس کا ترجمہ غشی کرتے ہیں، اور مارگیولیوتھ صاحب اس سے ڈر سے غش کھاکر گرجانا (Fainted) مطلب نکالتے ہیں کیا یورپین مستشرقانہ تحریف کی اس سے بہتر کوئی مثال ہوسکتی ہے، عربی جاننے والوں کے لئے ہم واقدی کی کتاب کی اصل عبارت نقل کر دیتے ہیں،

"ثُمَّ دعتبۃ عالی الصّبا ذرقی درسول اللّٰہ صلعم فی العریش و اصحابہ علی صفوفہم فاضطجع فغشیہ نوم غلبہ و قال لا تقاتلوا حتّی اذ نکم وان اکتبوکم فارموھم ولا تسلوا السیوف حتی یغشوکم، قال ابو بکر یا رسول اللّٰہ! قد دنا القوم و قد نالوا منا فاستیقظ رسول اللّٰہ و قد اراھم اللّٰہ ایاہم فی منامہ قلیلاً وقلل بعضھم فی اعین بعض ففزع رسول اللّٰہ صلعم وھو رافع یدیہ ینا شد ربہ ما وعدہ من النصر"

ہمارے عربی خواں طلبہ غور سے اس عبارت کا ایک ایک لفظ پڑھ جائیں، اور بتائیں کہ اس میں کون لفظ ہے جس کا ترجمہ اوکسفورڈ اور جرمنی کے پروفیسروں نے ڈر کر غش کھاکر گرجانا کیا ہے، نہ تو اس میں "خون کے پہلے قطرہ کے گرنے" کا لفظ ہے نہ اس میں اس موقع پر "پھر سے اندر عرشیہ میں آنے" کا لفظ ہے، نہ فوجوں کے باہم مقابل آنے کا لفظ ہے نہ غش کھانے کا لفظ ہے، نہ پھر ہوش میں آنے" کا لفظ ہے، کیا مستشرقانہ نکتہ نگاہی کی اس سے اور زیادہ بہتر دلیل چاہئے، کیا یہ علمائے یورپ کے ناطرفدارانہ مستشرقانہ کی سب سے اچھی مثال نہیں، اور آکسفورڈ کے عربی پروفیسر کے تبحر اور فضل و کمال اور بے تعصبی کی عمدہ نمائش نہیں،

اب میں بتاتا ہوں کہ ان فضلائے روزگار کی غلطی کا کیا منشا ہے، واقدی نے اس موقع پر غشیہ نوم علیہ (نیند آپ پر چھا گئی جو آپ پر غالب آگئی تھی) غشی کا لفظ اس میں ہے جس کے معنی عربی میں چھا جانے کے ہیں، جیسے قرآن مجید میں ہے،

واللیل اذا یغشیٰ، قسم ہے، رات کی جب وہ چھا جائے،

اوکسفورڈ اور جرمنی کے فاضلوں نے غشی کو غشی، اور بیہوشی سمجھا، حالانکہ عربی کا ایک معمولی طالب العلم بھی جانتا ہے کہ جب غشی اور بے ہوشی کے معنی اس لفظ سے ادا کرنا چاہیں گے تو باب افعال کا صیغہ مجہول استعمال کیا جائے گا، یعنی "اُغشی" پھر جب اس میں مجرد ثلاثی کے فعل معروف کے ساتھ "غشیہ" موجود ہے، اس کے بعد اس کا فاعل لفظ نوم (نیند) موجود ہے، اس کے بعد "استیقظ" نیند سے بیدار ہونا موجود ہے، پھر خواب کا دیکھنا مذکور ہے، تو پھر اس موقع پر سو جانے کے بجائے غش کھانا ترجمہ کرنا کس درجہ نادانی، اور جہالت ہے اسی کے ساتھ سونے کے وقت جنگ کا نقشہ اور تدبیر بھی آپ بتا رہے ہیں، کیا کوئی ایسی اختیاری غشی بھی ممکن ہے، جس کو تھوڑی دیر روک کر کوئی جنگ کی اہم بحث کا فیصلہ بھی کرتا جائے،

نیند کے چھانے کا محاورہ قرآن میں اسی موقع پر آیا ہے،

اذ یغشیکم النّعاس امنۃ منہ، (انفال) یاد کرو جب خدا اپنے امن سے تم پر نیند کو چھا رہا تھا،

کیا یہاں بھی ترجمہ "بیہوش کر رہا تھا" مناسب ہوگا،

اب رہی واقدی کی اصل روایت یعنی اس وقت آنحضرت صلعم کے سونے اور بیدار ہونے اور خواب میں فوج کو کم تعداد میں دیکھنے کی روایت، تو یہ سرتاپا لغو ہے اس

موقع کے تمام واقعات احادیث اور معتبر کتب مغازی میں مذکور ہیں، لیکن ان میں نیند، بیداری اور خواب کا مطلق ذکر نہیں ہے، بلکہ اس وقت بیداری، اور عام مصروفیت کا بیان بتصریح ہے یہ مشہور و معروف واقعہ کہ جب عتبہ نے مبارزت طلب کی، تو پہلے تین انصاری جوان مقابلہ کو نکلے، عتبہ نے اُن سے لڑنے سے انکار کر دیا، اور چلّا کر کہا کہ محمدؐ یہ لوگ ہمارے جوڑ کے نہیں، ہم کو اپنے برادر عم زاد سے غرض ہے" چنانچہ آنحضرت صلعم کے ارشاد کے مطابق انصار ہٹ آئے، اور آپ نے حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ، اور حضرت عبیدہؓ اپنے عزیزوں کو مقابلہ میں بھیجا، کہاں یہ واقعہ اور کہاں واقدی کا یہ بیان کہ "عتبہ نے مبارزت طلب کی، آنحضرت صلعم پر اُس وقت نیند چھائی جا رہی تھی، آپ سو گئے، اور پھر خواب دیکھا، اور حضرت ابوبکرؓ کے پکارنے سے پھر اُٹھے،

ابوداؤد میں اس واقعہ کی اصلی صورت موجود ہے،

عن الساعدی، قال النبیؐ صلعم یوم بدر اذا اکثبوکم فارموھم بالنبل ولا تسلّوا السیوف حتی یغشاکم (کتاب الجہاد باب فی سل السیوف)	ساعدیؓ سے روایت ہے کہ آپ نے بدر کے دن فرمایا جب قریش تمہارے قریب آجائیں تو اُن کو تیر مارو، اور تلوار اس وقت تک نہ کھینچو، جب تک کہ وہ تم کو چھا نہ لیں،
عن علی قال تقدم یعنی عتبة ربیعة وتبعه ابنه واخوه	حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ وہ یعنی عتبہ آگے بڑھا، اور اس کے

۱؎ اس معنی کی روایت صحیح بخاری جلد ۲ غزوۂ بدر میں بھی ہے،

فنادى من يبارز فانتدب له شباب من الانصار فقال من انتم فاخبروه فقال لا حاجة لنا فيكم انما اردنا بني عمنا فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم قم يا حمزة قم يا علي قم يا عبيدة قم يا حارث، (ابوداؤد کتاب الجہاد)	پیچھے اُس کا بھائی اور اس کا بیٹا آیا، اور عتبہ نے پکارا کہ کون مقابل آتا ہے، تو چند انصاری نوجوانوں نے اس کا جواب دیا، اس نے پوچھا تم کون ہو، انھوں نے بتایا، اُس نے کہا ہم کو تمھاری ضرورت نہیں، ہم کو اپنے چچازاد بھائی چاہئیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے علی تم اٹھو، اے حمزہ تم اٹھو، اے عبیدہ تم اٹھو اے حارث تم اٹھو،

کیا یہ کسی بزدل بے ہوش کے کام ہیں، پھر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ میں تیر لے کر مسلمانوں کی صفوں کو درست کیا، اور اُن کو برابر کیا، کیا یہ کسی بزدل اور بیہوش کا کام ہے، بدر کے ہیرو حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے بہادر شخص وہ سمجھا جاتا تھا، جو لڑائی میں آپ کے برابر کھڑا ہوتا تھا کیا یہ کسی بزدل و بیہوش کا کام ہے! احد میں جب اکثروں کے پاؤں اکھڑ گئے تھے، کون کفار کے حملوں کا نشانہ اور اپنی جگہ پر قائم تھا، ؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ کسی بزدل کا کام ہے حنین میں جب دس ہزار صحابہ نے تھوڑی دیر کے لئے قدم پیچھے ہٹائے، تو پہاڑ کی طرح کون اپنی جگہ پر جما رہا، ؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ایک غزوہ کی واپسی میں ایک منزل پر

دوپہر کو جب تمام صحابہ مختلف درختوں کے سایہ میں آرام کر رہے تھے، اور ایک بدوی آپ ہی کی تلوار بے نیام کرکے آگے بڑھا، اور آپ سونے سے جاگ پڑے، اور اس نے پوچھا، اے محمد! تم کو اب کون مجھ سے بچا سکتا ہے، آپ نے جواب دیا، اللہ! اس نے یہ معجزانہ سکون اور طمانیت دیکھ کر تلوار نیام میں کرلی[1]، تو یہ کارنامہ کسی بزدل کا ہے؟ یہ سچ ہے کہ آپ نے اپنا ہاتھ کسی کے خون سے رنگین نہیں کیا، مگر یہ پیغمبرانہ پاکی تھی، قلب کے ضعف اور دل کی کمزوری کی علامت نہیں تھی، واقدی نے یہ روایت بناکر حقیقت میں قرآن مجید کی اس آیتِ پاک کی تغییر کرنی چاہی ہے، جو واقعۂ بدر کے تعلق سے نازل ہوئی تھی،

اذ یریکھم اللہ فی منامک قلیلاً ولو اریکھم کثیراً لفشلتم ولتنازعتم فی الامر، (انفال)	یاد کرو جب خدا نے تجھ کو تیری نیند کی حالت میں اُن لوگوں کو تھوڑا کرکے دکھایا، اور اگر ان کو زیادہ کرکے تجھے دکھاتا تو تم شکست ہو جاتے، اور لڑائی کے فیصلہ میں باہم اختلاف کرلیتے،

واقدی نے اپنی جہالت سے اس خواب کے موقع کو عین معرکہ کا وقت سمجھ کر اس معجزانہ خواب کی روایت تیار کرلی، حالانکہ خود اسی حالت میں موجود ہے کہ لڑائی کے متعلق فیصلہ ہو جانے سے پہلے ہی آنحضرت ﷺ کو یہ تمثیلی خواب دکھایا گیا تھا جس میں اُن کی تعداد کی کثرت کو متنبہ کے لحاظ سے کم تعداد کرکے دکھایا گیا تھا یعنی قریش کی شکست

---

[1] یہ واقعات حدیث اور مغازی کی تمام کتابوں میں موجود ہیں۔

کی یہ پیشینگوئی عالم رویا میں دکھائی گئی تھی ۔

پروفیسر مارگیولیوتھ صاحب نے اسی "فرضی واقعۂ بے ہوشی" کے تذکرہ سے پہلے آنحضرتؐ کی کمزوری کے ثبوت میں ایک دو اور بے جوڑ باتوں کی تمہید کی ہے، وہ بھی سرتا پا لغو ہیں، پروفیسر صاحب کو واقعات کے بگاڑنے، واقعات کی غلط ترتیب دینے، اور اچھی سے اچھی بات کو بدنما صورت میں دکھانے میں ید طولیٰ حاصل ہے، جس کے لئے وہ عقل کے علاوہ صرف و نحو و ادب یا لغت ہر فن کا خون کرنے کے لئے فوراً تیار ہو جاتے ہیں، اس کی بدترین مثال اُن کی کتاب کے ص ۷۰ میں ہے کہ

"محمد خدیجہ کے ساتھ مل کر ہر رات کو سونے سے پہلے ایک خانگی عبادت ایک دیبی کی تعظیم میں کیا کرتے تھے"

موصوف نے اس کے لئے مسند ج ۴ ص ۲۲۲ کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ مسند کی روایت محولہ میں بالکل اس کے خلاف واقعہ درج ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا نہیں، بلکہ اہل عرب کا یہ دستور مذکور ہے کہ وہ عزیٰ کی پوجا کر کے سویا کرتے تھے، عربی جاننے والوں کے لئے اصل روایت لکھی جاتی ہے۔

حدثنی جار لخدیجة بنت	حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کے
خویلد انہ سمع النبی صلعم	ایک ہمسایہ نے مجھ سے بیان کیا کہ
وھو یقول لخدیجة اخدیجة و	انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ لا اعبد اللات والعزی	کو سُنا کہ وہ حضرت خدیجہؓ سے
واللہ لا اعبد اللات والعزی	فرما رہے تھے کہ اے خدیجہ خدا

والله لا اعبد ابدا، قال فنقول
خديجة خل اللات خل العزى
قال كانت صنمهم التي كانوا
يعبدون ثم يضطجعون،

کی قسم! میں لات و عزیٰ کی پرستش
نہیں کروں گا، خدا کی قسم نہیں
کروں گا، حضرت خدیجہؓ کہتی تھیں
لات کو جانے دیجئے، عزیٰ کو جانے
دیجئے، (یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجئے)
راوی کہتا ہے کہ یہ قریش کا وہ بت
تھا جس کو وہ پوجتے تھے، پھر لیٹتے تھے،

اللہ اللہ یہ کتنی بڑی تحریف ہے؟ ایک معمولی عربی کا واقف بھی سمجھ سکتا ہے کہ "صنمھم" اور "کانوا یعبدون" اور "یضطجعون" میں جمع کی ضمیر ہے، جو اہل عرب اور قریش کی طرف پھرتی ہے، اور "وہ دو" یعنی (محمد صلعم اور حضرت خدیجہؓ) کی طرف نہیں پھر سکتی، انھوں نے بجائے عربی کے شاید انگریزی قاعدہ کے مطابق جمع کی ضمیر تثنیہ کی طرف پھیر کر ایک ایسی بات کہی، جو علمائے یورپ کے فضل و کمال کے دامن پر ہمیشہ داغ رہے گا،

ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا

افسوس کہ معارف کے مختصر صفحات اس سے زیادہ بحث کی گنجائش نہیں رکھتے، اس کیلئے سیرت کی پانچویں جلد کا جو خاتمہ اسی موضوع پر ہوگی، ناظرین کو انتظار کرنا چاہئے،

س ن
ماہ جنوری ۱۹۲۶ء

پھر واقدی

امام زہری پر الزام

پروفیسر گولیم (درہم یونیورسٹی، انگلینڈ)

کا

خط بنام اڈیٹر اسلامک ریویو ووکنگ

جناب من!

میں اسلامک ریویو کا باقاعدہ اور مستقل پڑھنے والا ہوں، فاضل سید سلیمان صاحب ندوی کے مضمون سے جو واقدی پر شائع ہوا ہے، مجھے نہایت دلچسپی ہوئی، کیا میں یہ درخواست کر سکتا ہوں کہ آپ میرے اس خط کو مزید آگاہی کے لئے شائع کر دیں، جو حسب ذیل سوالات پر مشتمل ہے،

اول وہ کیا اصول ہے جس کی بنا پر واقدی کی صداقت رد کی جاتی ہے، مہربانی کر کے مجھے یہ کہنے دیجئے کہ میں مذہبی گروہوں کے اس حق کے خلاف لڑنا نہیں چاہتا کہ وہ ان تحریروں کو جو میرے نزدیک لائق قبول نہ ہوں، مستند ماننے سے انکار کر دیں، بلکہ میں وہ اصول جاننا چاہتا ہوں جو کسی مصنف کے رد و قبول پر حاوی ہے، میں یقیناً جرح و

تمدن کے عظیم الشان لٹریچر اور مناظرہ وغیرہ کے مسائل سے واقف ہوں، لیکن واقدی ایک مورخ تھا، دینیات کا مصنف (تھیالوجین) نہ تھا، اور یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ وہ بیگم اور ولی نما بخاری کی موت سے ۵۰ سال پہلے وفات پا چکا تھا،

یہ بھی آپکے خیال سے دور نہ رہا ہوگا کہ وہ سندیں جو واقدی کی نسبت عمدہ رائیں ظاہر کرتی ہیں، وہ اُن سے جو اُس کی تنقیص کرتی ہیں، ایک نسل مقدم ہیں۔

پھر آپکے فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ہم واقدی کو معتبر ثابت کرنے کے لئے ایک انشا، پرداز، ایک جغرافیہ دان، یا ایک مورخ کی شہادت منزل تک نہیں پہنچا سکتی ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیوں نہیں پہنچا سکتی ہے؛ اور ہم کیوں ابتدائے اسلام کے ممتاز مصنفوں، جغرافیہ دانوں اور مورخوں کے فیصلوں کو اس عجلت کے ساتھ چھوڑ دیں، کیا واقدی کی تصنیف اسی طرح ان اشخاص کو اپنی رائے زنی کے لئے دعوت نہیں دیتی، اور کیا اس کا فیصلہ صرف مذہبی علماء (تھیالوجینس) کی رایوں سے ہوگا،

یہ نہ سمجھئے کہ میں یہ سوالات مناظرہ کے لئے کر رہا ہوں، بلکہ زیادہ تر میں یہ سوالات اپنی زیر تالیف کتاب روایات اسلام کے چوتھے باب کے متعلق معلومات تلاش کرنے کے لئے کر رہا ہوں، میرے خیال میں ابو حاتم کا واقدی کی نسبت بُری رائے ظاہر کرنا درحقیقت موضوع سے خارج ہے، پھر ابراہیم حربی نے واقدی کے طرز تحریر یعنی ہر واقعہ کی الگ الگ سند لکھے بغیر روایت کی مدافعت کی ہے، یہ ایسا طرز تحریر ہے، جو یادر ہے کہ واقدی کی وفات کی ایک نسل بعد تک کم وقعت نہ تھا، کیونکہ زہری اور ابن اسحاق ان دونوں نے بھی ایسا ہی کیا ہے، آپکے فاضل مضمون نگار ...... جواب دیا ہے کہ زہری اور ابن اسحٰق کی سطح واقدی سے بلند تر ہے، لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں؟ میں جانتا ہوں کہ علمائے مذہب

(تھیالوجینس) کی نظر میں اُن کی زیادہ وقعت ہو لیکن مغازی میں اُن کی وقعت کیوں زیادہ ہے؟ کیا یہ فراموش کردیا گیا ہے کہ زہری نے خود اقرار کیا ہو کہ انھوں نے بادشاہوں سے مجبور ہو کر جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں،

اکرھنا علیہ ھولاء الامراء، — اس پر ہم کو ان بادشاہوں نے مجبور کیا،

پھر بہت سے مصنفین نے صحیحین کی حدیثیں بھی رد کردی ہیں، اور نیز یہ کہ بخاری کی راویوں میں سے ایک ابوہریرہ بھی ہیں، جو روایت کرتے ہیں کہ چاند پھٹ گیا تھا، (شق القمر) اس بنا پر کوئی اس خیال سے باز نہیں رہ سکتا کہ کوئی قومی سبب اس کا نہیں ہے کہ واقدی کو بخاری کے فیصلہ کی بنا پر رد کردیا جائے،

اسلام کے ایک سچے طالب علم ہونے کی حیثیت سے میں نہایت شکور رہوں گا کہ اگر سید صاحب یا کوئی دوسرا فاضل مجھ کو وہ اصول بتائے، جس کی بنا پر کسی ابتدائی مسلمان کی شہادت قبول یا رد کر دگئی ہے،

آپ میرے ساتھ اتفاق کریں گے کہ جب کسی شخص کے خود معاصرین اس کو اعلیٰ سند تسلیم کریں، تو یہ بشکل مناسب ہوگا کہ بعد کی نسل کے علمائے مذہب (تھیالوجینس) کی بلادلیل رائیوں کی بنا پر اس کو جھوٹا کہہ کر بدنام کیا جائے،

آپ کا مخلص

الفرڈ گونیم

پروفیسر عربی: درہم یونیورسٹی،

انگلینڈ

الجواب

از

سید سلیمان ندوی

پروفیسر موصوف کے ان سوالات کو پڑھ کر سب سے پہلے اس بات کی خوشی ہوتی ہے، کہ ہمارے فاضل مستشرقین کی علمی تحقیق کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے، ایک زمانہ تھا کہ سیرت نبوی پر لکھنے کے لئے تنہا ابوالفدا ایک ماخذ اُن کے سامنے تھا، اس کے بعد واقدی، اور پھر ابن سعد اور ابن اسحاق کی باری آئی، یہاں تک کہ پروفیسر مارگیولیوتھ نے اس کا سب سے بڑا ماخذ حدیث کو قرار دیا، اور خصوصاً ابن حنبل کی ضخیم جلدوں کو، لیکن ابھی تک اس کی کسر تھی کہ انھوں نے کسی واقعہ کی تنقید میں اصولِ روایت سے کام نہیں لیا، مگر کیا پروفیسر گولیم کے ان سوالات سے یہ خوشخبری نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اب ہمارے ان اصول و ضوابط کو سمجھنا چاہتے ہیں، جن پر اسلام کی ابتدائی روایتوں کی تنقید کی اصلی بنیاد قائم ہے،

دنیا میں صرف مسلمان ہی وہ قوم ہے جس نے واقعات و روایات کی تنقید و تصحیح کے لئے اصول و ضوابط قائم کئے، اور اس سلسلہ میں اصول حدیث، اسماء الرجال، علم الجرح والتعدیل، اختلاف الحدیث اور اسناد وغیرہ متعدد فنون کی بنیاد ڈالی، اسی کے ساتھ درایت کے اصول اور نقد کے قوانین بنائے، اور ان پر صدہا کتابیں لکھیں، اور وہ ہماری مشرقی درسگاہوں کے نصاب تعلیم کا ایک جزو ہیں، اور محض عربی زبان کی ادبی واقفیت ان مشکلات کی گرہ کشائی نہیں کر سکتی،

مسلمانوں میں اصول کے رو سے واقعات کی تنقید دو پہلوؤں سے کی جاتی ہے جن میں

ہے ایک اصول روایت اور دوسرا اصولِ درایت ہے، روایت کے مختصر اصول یہ ہیں کہ
شروع سے آخر تک واقعہ کے ناقل اور راوی معتبر اور ثقہ ہوں، پہلا راوی یا خود واقعہ
کے وقت موجود اور اُس کا عینی شاہد ہو، یا کسی شریکِ واقعہ اور عینی شاہد سے اُس نے
خود سُنا ہو، یا اُس کے متعلق یہ تجربہ سے ثابت ہو کہ وہ ہمیشہ عینی شاہدوں سے سُن ہی کر
اس قسم کی روایتیں کیا کرتا ہے، پھر یہ کہ ہر راوی یہ اقرار کرے کہ اُس نے خود دوسرے راوی
یعنی اپنے پیشرو راوی سے یہ سنا ہے یا یہ ثابت ہو کہ وہ اُس سے عمر میں کم سے کم ایک زندگی
ہے، یا یہ کہ وہ دونوں کم از کم ایک زمانہ میں موجود تھے، اور ایک کی دوسرے سے سماعت
ممکن ہے، اوّل سے اخیر تک سند کی کڑی متصل اور ملی ہو، کہیں سے ٹوٹی نہ ہو، یعنی بیچ کا
راوی کوئی نامعلوم شخص نہ ہو،

درایت کے مختصر اصول یہ ہیں کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، وہ دیگر مستند تاریخی بیانات
کے مخالف تو نہیں ہے، کسی دوسری صحیح تر سند سے اس کے خلاف کوئی ایسی شہادت تو
موجود نہیں ہے، جو اس کی تکذیب کرتی ہو، راوی سے مطلب سمجھنے میں تو کوئی غلطی نہیں ہوئی،
راوی نے کوئی ادھوری بات تو نقل نہیں کی ہے، اسلام کے مسلّمہ متیقنہ اور معروف
اصول کے خلاف تو نہیں ہے؛

یہ اس فن کی مختصر دفعات ہیں جن پر اسلام کی ابتدائی تاریخ و احکام کی نقل و روایت
کی بنیاد قائم ہے اسلام کے ابتدائی مصنفین نے خواہ علمائے حدیث ہوں، علمائے مغازی
ہوں یا علمائے تاریخ ہوں، انہی اصول کی پیروی جہاں تک زیادہ کی ہے، وہیں تک
اُن کی تصنیفات امت کے نزدیک زیادہ قابلِ قبول ہوئی ہیں، اسی بنا پر امام بخاری کی
جامع صحیح کا، پھر امام مسلم نیشاپوری کی کتاب کا، پھر علی الترتیب اسی طرح حدیث کی دوسری

کتابوں کا درجہ ہے،

امام بخاری نے اپنی کتاب میں کوئی ایسی روایت تن کتاب میں نقل نہیں کی ہے، جس میں ہر ایک راوی نے دوسرے راوی سے اپنی ملاقات اور سماعت کا اقرار نہیں کیا ہے، امام مسلم نے ایسے راویوں کی روایتیں بھی قبول کرلی ہیں جن کی باہمی ملاقات اور سماعت کا کوئی ثبوت نہ ہو، مگر اتنا ثابت ہو کہ وہ دونوں ایک عہد اور ایک زمانہ میں موجود تھے، اس بنا پر ایک منصف مزاج یہ یقین کرے گا کہ روایات اور وقائع کے تمام دفتر میں صحیح بخاری سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ صحیح مسلم کا درجہ صحیح بخاری کے بعد کیوں قرار دیا گیا ہے، دوسری کتابوں کے مصنفین نے اپنا اصول یہ قرار دیا ہے کہ وہ ہر اس واقعہ کو قبول کرتے ہیں جس کی نسبت علماء کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ موضوع جھوٹا اور بنایا ہوا نہیں ہے، اور ہر اس راوی کو قبول کیا ہے جس کو علماء نے جھوٹا، کاذب اور دروغ گو نہیں کہا ہے، نیچے درجہ کے مصنفین نے اس اصول کو بھی برقرار نہیں رکھا ہے، بلکہ ہر جھوٹی سچی روایت کو قبول کرکے اپنی کتاب میں بھر دیا ہے، اس لئے اسی ترتیب سے ان کی کتابوں کے بھی اہل فن نے درجے مقرر کر دیئے ہیں،

جو کتابیں مغازی اور سیرۃ پر لکھی گئی ہیں، ان میں ان اصولوں کا عموماً بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے تاہم ان اصولوں کی پابندی اور خود مصنفین کی ذاتی حیثیت کی بنا پر مغازی کی کتابوں میں سب سے اول امام زہری کی مغازی کو جگہ دی گئی تھی، اور اس کی عدم موجودگی میں ان کے شاگردوں میں سے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی کا رتبہ ہے، اور اس کے بعد ان کے ہم درس محمد بن اسحاق کا درجہ ہے، اور واقدی کے لئے اس دربار میں وہی جگہ رکھی گئی ہے جو اسی کے ہم رتبہ کسی حدیث کی کتاب کے مصنف کا پایہ محدثین میں ہے،

پروفیسر صاحب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علمائے اسلام کی جماعتی یا فن وار تقسیم سے ناآشنا ہیں، اور یقیناً کسی بیرونی قوم کے افراد کو دوسری قوم کے مذہب، علوم اور زبانوں کی اصطلاحات کا سمجھنا اس بنا پر مشکل ہوتا ہے کہ وہ بچپن سے اس ماحول سے باہر پلے ہیں، اور اُن کی واقفیت کا ذریعہ محض کتابیں ہیں، اور ان چیزوں کے پوری طور سے سمجھنے میں اس قوم کی زبان کی محض ادبی واقفیت پوری معین نہیں ثابت ہوتی، اس لئے لامحالہ وہ شخص دوسری قوم کی اصطلاحات، خیالات اور ماحول کو اپنی قومی اصطلاحات، خیالات اور ماحول کے مطابق کر کے سمجھتا ہے، ہمارے پروفیسر صاحب نے اپنے خط میں دو قسم کے علمار کے نام لئے ہیں، ایک کو وہ تھیا لوجین یعنی علماے الٰہیات اور دوسرے کو مورخین اور اصحاب مغازی کہتے ہیں، لیکن اسلام میں یہ کوئی تقسیم نہیں ہے، اور ہمارے یہاں علماے الٰہیات، عام علمار سے کوئی الگ نہیں ہیں، یہاں پر علمار کی تقسیم تھیالوجی (الٰہیات) کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ "روایت" کی بنا پر ہے، اس لئے وہ تمام اشخاص جو کسی قسم کی نقل وروایت کرتے ہیں، ایک جنس میں داخل ہیں، اور ان کا نام "علماے نقل" ہے اور دوسرے "علماے عقل" ہیں، جن کا یہاں کوئی تعلق نہیں۔

علماے نقل یعنی وہ تمام اشخاص جو کسی حکم یا واقعہ کو نقل وروایت کرتے ہیں، اُن کے اس حکم و واقعہ کی حیثیت کی بنا پر مختلف نام ہیں، مثلاً وہ اشخاص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد اول کے ہر قسم کے احکام و واقعات کی نقل وروایت کی خدمات انجام دیں، وہ محدث کہلاتے ہیں، اور جو صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح ذاتی اور واقعات و اخلاق کا ذکر کریں، وہ اصحاب سیرۃ ہیں، اور جو آپ کے صرف اخلاق وعادات کو نقل کریں، وہ اصحاب شمائل ہیں، اور جو صرف غزوات، اور اُن کے

متعلقات کو بیان کریں، وہ اصحابُ المغازی ہیں، بہرحال محدث یا صاحب سیرت، یا صاحب شمائل، یا صاحبِ المغازی، یہ کل کے کل گو مضامینِ متعلقہ کی حیثیت سے الگ الگ ناموں سے موسوم ہیں، لیکن روایت کی حیثیت سے ان سب کا ایک ہی درجہ ہے، یعنی یہ سب اصحابِ روایت اور علماء نقل ہیں، اور تمام اصحابِ روایت اور علمائے نقل ایک ہی ترازو کے پلہ میں تولے جائیں گے،

اس بنا پر، جو شخص بھی اسلامی روایات کا کوئی ٹکڑا بھی کسی سے نقل کرکے بیان کریگا خواہ وہ دینی احکام و فرائض سے متعلق ہو، خواہ پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی ذاتِ گرامی سے منسوب ہو، خواہ وہ غزوات اور لڑائیوں کے بارہ میں ہو، خواہ وہ آپ کے اخلاق و عادات سے تعلق رکھتا ہو، اس کے لئے اس بات کے ثبوت کی ضرورت ہے کہ درحقیقت ایسا ہی ہے، عقلِ انسانی پر آئندہ پچھلی نسلوں یا غائب اشخاص کو اس حکم یا واقعہ کا علم صرف روایت ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، اور ایک انسان کے ہاتھ میں یہی ایک ذریعہ ایک سے دوسرے تک بات کے پہنچانے کا ہے، اور تمام دنیا کے واقعات اور حوادث کے علم کا مدار صرف تاریخ پر ہے،

اسلامی اور غیر اسلامی روایات میں فن کی حیثیت سے یہی سب سے بڑا امتیاز فرق ہے کہ غیر مسلم قوموں نے اپنے انبیاء اور ہادیوں کے اقوال اور افعال کی روایتوں کی جانچ اور پڑتال کے متعلق کوئی اصول مدوّن نہیں کیا ہے، اور مسلمانوں نے اس کے لئے بہت سے اصول مدوّن اور منضبط کئے ہیں، اور اسی معیار پر غلط اور صحیح، سچی اور جھوٹی روایت کو وہ پرکھتے ہیں، مثلاً ہمارے عیسائی بھائیوں کے یہاں، ان چار مشہور انجیلوں کے علاوہ اور بہت سی انجیلیں ہیں، مگر انھوں نے چار کو مسلّم مان کر بقیہ کو جعلی اور ناقابلِ تسلیم قرار دیا ہے، مگر

ہیں وہ اصول نہیں معلوم جن کی بنا پر اس جھوٹ اور سچ، صحیح اور جعلی میں فرق کیا جا سکے، لیکن مسلمانوں کے پاس اُن کے جانچنے کے لئے وہ فن ہے جس کا نام اصول ہے اور جس کی متعدد شاخیں ہیں،

آج تنقیدی تاریخ کے فن نے یورپ میں بے انتہا ترقی کی ہے، اور ابن خلدون کے بنیادی فلسفۂ تاریخ نے یورپ جا کر عظیم الشان برگ و بار پیدا کیا ہے، اور اس امر پر بڑا زور صرف کیا جاتا ہے کہ اس تاریخ کا فلاں واقعہ نظرت، مقتضائے عہد اور اس زمانہ کے ماحول کے لحاظ سے ممکن بھی ہے، یا نہیں، غرض درایت کے نقطۂ نظر سے کوئی پہلو جدید یورپ کے نقاد مورخین کی محققانہ نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے پاتا، لیکن یہ پہلو کہ اس واقعہ کو کس نے دیکھا، کس سے سُنا؟ ہم تک کس واسطہ سے پہنچا کبھی معرض بحث میں نہیں آتا، آج یورپ میں محققین اور عدالتوں نے حوادث اور واقعات میں شہادت کی حیثیت کو جو اہمیت دی ہے وہ مخفی نہیں، مدعی اور شاہدوں اور گواہوں کی وقعت، پوزیشن، اخلاق، عینی شہادت اور سچائی کو ہر طرح سے جانچنے کی انتہائی کوششیں کی جاتی ہیں، پھر یہ کیا ظلم ہے کہ موجودہ واقعات کی تحقیق کے سلسلہ میں تو شاہدوں اور گواہوں کے متعلق یہ احتیاط برتی جائے اور گذشتہ واقعات کے قبول و رد میں اس کے بالمقابل شہادت کے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ دیا جائے، اور سچ اور جھوٹ میں کوئی تفریق نہ کی جائے، نہ اس کی تلاش اور جستجو کی جائے،

حدیث و روایت بھی دنیا کے ہزاروں علوم و فنون میں سے ایک فن ہے، ہر علم و فن کی طرف جو لوگ منسوب ہیں، یا جو کسی علم و فن کی آگاہی اور واقفیت کے مدعی ہیں، ہر شخص جانتا ہے کہ ان سب کا درجہ برابر نہیں ہوتا، بہت سے ان میں کسی فن کے آشنا اور

اس علم کے محض ابجد خوان اور حرف شناس ہوتے ہیں، دوسروں کی حالت اُن سے بہتر ہوتی ہے،
بعض کا درجہ بہت بلند ہوتا ہے، اور کچھ ایسے باکمال بھی ہوتے ہیں جو اس علم یا فن کے محقق،
اس کو ترقی دینے والے، اس کے تمام حقائق اور اسرار کے کامل ماہر ہوتے ہیں، اس کا فیصلہ
کہ اس کو اس علم یا فن میں نقص یا کمال کا کونسا درجہ حاصل ہے، اس علم و فن کے متعلق اس
کے کارنامے اس کے ہم عصر و ہم پیشہ فضلاء کی رائیں اور اس زمانہ کے قبولِ عام کی نگاہیں
اس کو نمایاں کر دیتی ہیں، اور بالآخر ان کو اس علم و فن کا معیاری درجہ اور رتبہ حاصل ہو جاتا ہے،
ہر عہد اور ہر زمانہ میں علم و فن کی ہر شاخ میں اس کی ہزاروں مثالیں گذر چکی ہیں، اور گذر رہی ہیں،
گذشتہ اور موجودہ علما اور مصنفین کے اعتبار، استناد اور صحتِ نقل کا پیمانہ اسی معیار پر
قائم ہے،

یہی اصول اسلامی روایات کے حاملین اور ابتدائی مسلمان مصنفین کے فرقِ مراتب
اور امتیازات میں قائم ہے، جس کی بنا پر مالک، بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی،
ابن حنبل، ابن ماجہ، ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، ابن ہشام، طبری، دیلمی، کلبی وغیرہ
ابتدائی مسلمان مصنفین کی کتابوں میں مراتب اور درجات ہیں،

ہر علم و فن کے مسائل کے متعلق اس کے جاننے والوں اور محققوں ہی کی رائے معتبر
ہو سکتی ہے، ایک عالم لغت کی رائے کیمسٹری کے کسی مسئلہ کی نسبت یا ایک جغرافیہ دان کی
رائے طب کے متعلق، ایک ادیب کی رائے ما بعد الطبیعیات کے بارہ میں یا ایک محدث کی
رائے ہیئت کے کسی مسئلہ کے فیصلہ میں بالکل بے سود ہے، مسلمان علما اور حکما میں بو نقاسم
حریری سے ریاضیات کی نسبت اور موسیٰ خوارزمی سے مقامات کی نسبت سوال بے کار
ہوگا، بو علی سینا سے حدیث کی تحقیق اور امام بخاری سے طبیعیات کے مسائل حل نہیں

کئے جا سکتے، اس لئے یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ حدیث و روایت نبوی کی تحقیق میں "ایک انشا پرداز جغرافیہ داں اور محاضرات نویس کی رائے کیوں معتبر نہیں، جس طرح گبن کا کام نیوٹن سے نہیں لیا جا سکتا، اسی طرح ابنِ حجر کا کام یاقوت سے نہیں لیا جا سکتا، اور نہ یاقوت کا کام ابنِ حجر سے لیا جا سکتا ہے، اس لئے یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ "ہم کو واقدی کو معتبر ثابت کرنے کے لئے ایک انشا پرداز، ایک جغرافیہ داں اور ایک مورخ (یاقوت) مورخ نہیں سوانح نگار تھا) کی شہادت منزل تک نہیں پہونچا سکتی۔

اس کے فیصلہ کے بارہ میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ تھیالوجین (عالم الٰہیات) اور غیر تھیالوجین کے تعصب کی دیوار حائل ہے، بلکہ فن کی واقفیت اور تحقیق کی دیوار حائل ہے، کسی شہر کی جائے وقوع، اور اس کے نام کی صحت کے بارے میں ابنِ خردازبہ، مقدسی، مسعودی، ادریسی اور یاقوت جغرافیہ دانانِ اسلام کی جو رائے ہوگی، اس کے مقابلہ میں امام بخاری، امام مسلم، امام احمد بن حنبل، خطابی، اور ابنِ حجر کی رائے قابلِ تسلیم نہ ہوگی، یہ بالکل ایک کھلا ہوا مسئلہ ہے، اس لئے آپ کی یہ حیرت کہ "ہم کیوں ابتدائے اسلام کے ممتاز مصنفوں جغرافیہ دانوں، اور مورخوں کے فیصلوں کو اس عجلت کے ساتھ چھوڑ دیں، کیا واقدی کی تصنیف اسی طرح ان اشخاص کو اپنی رائے زنی کے لئے دعوت نہیں دیتی، اور کیا اس کا فیصلہ صرف مذہبی علماء (تھیالوجینس) کی رایوں سے ہوگا" دور ہو جائے گی،

اب میں آپکے اس سوال پر آتا ہوں کہ "وہ کیا اصول ہے جس کی بنا پر واقدی کی صداقت رد کی جاتی ہے، اور وہ اصول عرض کرنا چاہتا ہوں جو کسی مصنف کے رد و قبول پر حاوی ہے، پہلے گذر چکا ہے کہ ہر علم و فن کے فضلاء اور محققین کے کارنامے معاصرانہ شہادتیں ہیں، اس علم و فن کے ساتھ اس کا شغف و شوق اور کاوش و تحقیق اُن کے مرتبہ اور درجہ کو متعین کر دیتی ہے،

اور ایک ناآشنائے فن عطائی، مدعی محض، عالم، فاضل، اور محقق کامل کے متفاوت درجوں کی تعیین کر دیتی ہے، یہی حال سلسلۂ روایت اور اسناد کے واقفوں، عالموں، اور محققوں کے رتبوں اور درجوں کی تعیین اور تشخیص کا ہے، امام بخاری کے سامنے بغداد میں روایات کے دس متفرق سلسلے باہم الٹ پھیر کر امتحاناً پیش کئے جاتے ہیں، وہ بہ ترتیب ان سلسلوں کو ٹھیک اپنی جگہ رکھ کر پیش کر دیتے ہیں، اور علماء کا مجمع اُن کی حیرت انگیز یادداشت اور حافظہ کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے، اس بنا پر اس فن میں امام بخاری کا جو درجہ ہوگا، وہ اس اناڑی کا نہیں ہو سکتا جس کو اپنی کسی روایت کی پوری سند بھی نہیں معلوم،

اول نفس مصنفین کو لیجیے، فضل وکمال، دیانت و تقویٰ، حفظ و یادداشت، فہم و استنباط کے لحاظ سے ان میں بہت کچھ فرق ہوتا ہے، پھر آپ کو معلوم ہے کہ کم از کم ایک دو نسل تک اسلامی روایات کا بڑا حصہ زبانی کتاب کے سبقوں کی طرح رٹ کر یاد کیا جاتا تھا، اس لئے راویوں کی قوت حافظہ کا امتحان بھی ضروری تھا،

اب اسلامی فن روایت کے اصول کی بنا پر کسی مصنف کی کتاب میں کسی واقعہ کے مستند طور سے درج ہونے اور اس کے معتبر ہونے کیلئے ضروری ہے کہ

۱۔ مصنف خود معتبر، ثقہ، دیانت دار، اور صادق القول، اور اپنی روایتوں کے تمام سلسلوں سے واقف ہو، اور اپنے راویوں کے انتخاب میں اس نے پوری کوشش کی اور کامیابی حاصل کی ہو،

۲۔ اس کی ہر روایت کا سلسلۂ سند ہو،

۳۔ اس کی روایت کا ابتدائی راوی واقعہ کا عینی شاہد ہو، یا کسی عینی شاہد سے اس کے ملنے کا کافی ثبوت ملتا ہو،

۴ واقعہ کے شاہد عینی سے لے کر مصنف تک ہر دور کے راوی کی کڑی موجود ہو ۔

۵ ہر دور کے راوی کی نسبت یہ بھی معلوم ہو کہ وہ ثقہ، معتبر اور صادق ہو ۔

۶ ہر دور کے راوی کی نسبت ثابت ہو کہ اُس نے اپنے پیش رو سے سنا ہو اور یا کم از کم دونوں ایک زمانہ میں موجود تھے ۔

یہ چند اصول ہیں جو ایک ایسے مختصر مضمون کی چند سطروں میں بیان کئے جا سکتے ہیں۔ اس معیار پر ہم بخاری اور واقدی کی روایتوں کو جانچتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کے تمام معاصرین بالاتفاق اس کو ثقہ، معتبر، صادق، متدین اور روایت کے اشخاص اور رجال کا سب سے بڑا پرکھنے والا کہتے ہیں، اور دوسرے کے اکثر معاصرین اس کو جھوٹا، کاذب اور دروغ گو، اور روایت کے اشخاص و رجال سے اس کو نابلد محض کہتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے۔

اب ان دونوں کے راویوں کا حال ہم دیکھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ بخاری اپنی ہر روایت کے شروع سے اخیر تک راویوں کے نام بنام گناتے ہیں، اور ان میں سے اس کے ہر دور کا راوی اپنے زمانہ کا مشہور و معروف، متدین، راست باز اور معتبر تھا، دوسری طرف واقدی کے یہاں اکثر سے یہی معلوم نہیں کہ اُس نے واقعہ کو کس سے سُنا؟ اس نے کس سے کہا، اور اس کا شاہد عینی کون تھا؟ اس لئے ایسی حالت میں ہر منصف مزاج روایت کے دونوں مصنفوں کے بیانات کے رد و قبول کا آسانی فیصلہ کر سکتا ہے۔

واقدی نے اگر کہیں کہیں ایک دو راویوں کے نام لکھے بھی ہیں، تو وہ غیر مشہور، نامعتبر یا مجہول ہیں، اور بخاری کا ہر راوی اپنی جگہ پر معاصرین میں مسلم الثبوت اور اہل فن کے نزدیک مستند رہا ہے۔ پھر نفس واقعہ اور اس کی تفصیلات کو دیکھتے ہیں، تو ثابت ہوتا ہے کہ بخاری کے بیان کی تصدیق دوسری معاصر و مماثل روایتوں کی تائید سے بھی ہوتی ہے، اور واقدی کے

خاص بیان کی تائید کسی معاصر سے نہیں ملتی، اس قسم کی متعدد مثالیں جب دو مصنفوں میں ملیں گی، تو ضرور ایک کو مستند اور دوسرے کو غیر مستند قرار دیا جائے گا" یہ اصول ہی جس کی بنا پر ایک مصنف کو قبول اور دوسرے کو رد کیا جاتا ہے"،

جس طرح دوسرے علوم و فنون کے ممتاز و مستند محققین ہر زمانہ میں ہوتے رہے ہیں، اسی طرح اسلامی علم روایت کے ممتاز و مستند محققین بھی ہر دور میں گذرتے رہے ہیں جن کا تدین، جن کی ثقاہت، جن کا علم و فضل خود اُن کے کارناموں، علمی کاوشوں، ان کی زندگیوں کے سوانح اور اُن کے معاصرین کی شہادتوں سے ثابت ہے، اور جنھوں نے اپنی پوری زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ روایتوں کی تحقیق، راویوں کی چھان بین، رجال کی تلاش و تفتیش میں بسر کیا، اور اُن کے عہد کے انسانوں نے ان کے تدین، تحقیق اور فضل و کمال پر بھروسہ کیا، اُن کی تحقیقات اور بیانات اس عہد کے راویوں کے متعلق معیار قرار پائے،

اور چونکہ مختلف اشخاص کے متعلق اُن کے مختلف واقف کاروں کے تجربے کبھی کبھی مختلف بھی ہوتے ہیں، اس لئے راویوں کے متعلق مختلف رائیں بھی ہیں، ان راویوں کی صحت کا معیار خود ان اصحاب رائے کا فضل و کمال ہے، اور یہ اختلاف رائے خود علم اسماء الرجال کی صداقت کی دلیل ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعی مختلف اشخاص کے ذاتی تجربوں پر قائم ہے، اگر ان میں بجائے اختلاف کے یکسانی ہوتی، تو اول تو یہ اشخاص کے متعلق نقد و تجربہ کی غیر فطری مثال ہوگی، دوسرے اس سے شبہہ پیدا ہو سکتا تھا کہ یہ ایک جعلی، بناوٹی اور مرتبہ جھوٹ ہے، اس بنا پر کسی راوی کے متعلق اگر مختلف ناقدین کی مختلف رائیں ہوں، تو ان رایوں میں سے کسی ایک پہلو کی ترجیح کے لئے حسب ذیل اصول ہیں،

۱۔ معاصر ناقدین کی اکثریت کدھر ہے ؟

۲ - مختلف رتبوں کے ناقدوں میں سے اعلیٰ درجہ کے مستند ناقدین کس طرف ہیں۔

۳ - عام ناقدین کی اکثریت کس طرف مائل ہے؟

کسی راوی کے متعلق متاخر عہد کے غیر معاصر ناقد جب اپنی رائے دیتے ہیں تو اس کی بنیاد حسب ذیل چیزوں پر ہوتی ہے،

۱ - راوی کی موجودہ روایات کے ذخیرہ کی نوعیت کیا ہے اور زیادہ تر اس میں معروف یا منکر کس قسم کی باتیں ملتی ہیں؟

۲ - دوسرے مستند لوگوں کے بیانات سے اس کا بیان کہاں تک موافق یا مخالف ہے؟

۳ - اس مختلف فیہ راوی کے معاصر فضلاء کی رائیں اس کے متعلق کیا ہیں، اور اگر وہ مختلف ہیں، تو اُن میں مشہور و معروف ناقدین کدھر ہیں، یا اُن کی کثیر تعداد کس جانب ہے،

۴ - متاخر ناقد نے گو خود اس راوی کو نہیں جانچا، مگر اس کے متعلق اُس نے اپنے شیوخ کی زبان سے سُنا جو اس راوی کے معاصر تھے،

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ واقدی کے متعلق پچاس برس بعد امام بخاری کیونکر اپنی رائے ظاہر کر سکتے ہیں،

واقدی کے متعلق ابو حاتم رازی کی رائے موضوع سے خارج ہے، ابو حاتم [illegible] یہ ہے کہ واقدی کے ہم عصر محدثین اور فضلائے روایت نے دیکھا، کہ [illegible] ی مدینہ کے [illegible] اور غیر معروف راوی جن کے حالات سے واقفیت نہیں اُن سے روایت کیا کرتا ہے کہ اور ایسی روایتیں کرتا ہے، جو منکر ہیں یعنی کسی ثقہ اور معتبر راوی کے بیان سے اُن کی تائید و تصدیق نہیں ہوتی، اور جن کو ہم جانتے ہیں، اب ایسی حالت میں یہ اشتباہ ہو سکتا تھا کہ

ممکن ہے کہ یہ منکر اور غیر مصدقہ روایتیں خود واقدی نے گھڑلی ہوں، اور دوسرے غیر معروف شیوخ کی طرف اُن کو منسوب کر دیا ہو یا یہ کہ جھوٹی روایتیں انہی غیر معروف شیوخ کی ساختہ ہوں اور واقدی نادانستگی میں اُن کو سچ کر بیان کیا کرتا ہے، شک کے ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کی تعیین واقدی کے ہم عصر فضلاء نے اس طرح کی کہ انھوں نے دیکھا کہ وہ معروف و مشہور اساتذہ جو اس قسم کی منکر روایتیں ہرگز نہیں کرتے، اور نہ انھوں نے کی، واقدی ان سے بھی اس قسم کی روایتیں علانیہ اُن کی طرف نسبت کر کے کیا کرتا ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ ان لغو اور غیر مصدقہ روایتوں کے گھڑنے کا کارخانہ خود اسی کے گھر میں قائم تھا،

کیا یہ موضوع بحث سے خارج رائے ہے،

ابراہیم حربی جنھوں نے واقدی کی حمایت کی ہے اور کہا ہے کہ

"مفصل سند کے بغیر روایت کرنا اگر جرم ہے تو امام زہری اور محمد بن اسحاق بھی اس سے بری نہیں"

ہم نے اپنے گذشتہ مضمون میں اس کے دو جواب دیئے ہیں

۱۔ زہری اور ابن اسحاق واقدی سے بہت زیادہ بلند ہیں، اس لئے اُن کی بلا سند بات بھی واقدی کی بے سند باتوں سے زیادہ وقیع ہے کہ واقدی کا جعل ساز ہونا ثابت تھا، اور وہ دونوں اس الزام سے قطعاً بری ہیں، اور خصوصاً زہری تو امام الائمہ ہیں، اور ابن اسحاق گو اُن سے بہت کم رُتبہ ہیں، تاہم واقدی سے تو اُن کا پایہ بلند ہے،

۲۔ زہری اور ابن اسحاق نے ایسی بے سند بات کبھی نہیں کہی، البتہ کہیں کہیں مختلف سندوں کو ایک جگہ ملا کر روایت کی ہے، بقیہ ہر جگہ انھوں نے اپنی ہر بات اور ہر روایت کی الگ الگ سندیں ذکر کی ہیں، اور واقدی نے یہ کیا ہے کہ ایک جگہ کتاب کے آغاز میں

سو پچاس آدمیوں کے نام اکٹھا کرکے باقی پوری کتاب بلا سند ایک کہانی اور ایک قصہ کی طرح سنا دی ہے، اس لئے اُن میں عظیم الشان فرق ہے۔

علاوہ ازیں اگر زہری اور ابن اسحاق نے واقدی ہی کی طرح کوئی بے سند روایت کردی ہے تو اس روایت کا درجہ بھی واقدی ہی کی روایت کے قریب قریب ہوگا، گو زہری اور واقدی کے ذاتی امتیاز اور فضل و کمال کا جو فرق ہے وہ اب بھی محسوس ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ مغازی کی کتابوں کا درجہ احادیث کی کتابوں سے فروتر ہے، واقدی ہی کی مغازی کی تخصیص نہیں، مغازی کی ہر کتاب احادیث کی کتاب کے مقابلہ میں کم رتبہ ہے۔

پھر آپ میری نسبت کہتے ہیں کہ آپ کے مضمون نگار نے یہ جواب دیا ہے کہ زہری اور ابن اسحاق کی سطح واقدی سے بلند ہے لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ کیوں" آپ یقیناً پوچھ سکتے ہیں، یہ سطح کا نشیب و فراز اس سے ہے کہ امام زہری کا کوئی جھوٹ ثابت نہیں ہوا، محمد ابن اسحاق بھی اس الزام سے بری ہیں، گو ان پر بے احتیاطی کے اور الزامات ثابت ہوں، اور واقدی کی نسبت اُن کے معاصرین کا بار بار کا یہ تجربہ ہے کہ وہ جھوٹی گھڑ کے اور جعلی سے روایت کیا کرتا تھا، زہری ہمیشہ راویوں سے اپنی روایتیں کرتے ہیں، جو اپنے عہد کے مشہور و معروف و ثقہ تھے، محمد بن اسحاق اُن سے کم درجہ کے [illegible] واقدی بالکل غیر معروف اور مجہول لوگوں سے روایتیں کرتا ہے، اور اس اصول کی بنا پر [illegible] واقف کاروں اور ماہروں کے تفاوتِ مدارج کی نسبت ہر زمانہ کے علماء فیصلہ کیا [illegible] زہری اور ابن اسحاق اور واقدی کی سطح کی بلندی اور پستی کا فیصلہ بھی انہی نے کیا ہے تاہم سند کے لحاظ سے زہری کی بھی ہر قسم کی روایتیں یکساں نہیں ہیں، اور ان کی بے سند روایت بھی مستند روایت کے مقابلہ میں چھوڑ دی جائے گی، یا کم سمجھی جائے گی،

آپ کہتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ علمائے مذہب (تھیا لوجینس) میں اُن کی (زہری اور ابن اسحاق کی وقعت زیادہ ہے، لیکن مغازی میں اُن کی وقعت کیوں زیادہ ہے"؟ اول عرض یہ ہے کہ زہری تو بلا شبہہ ہر صنف روایت میں اعتبار و استناد کے بلند ترین درجہ پر ہیں، مگر ابن اسحاق کا یہ حال نہیں ہے، وہ صرف مغازی میں مقبول ہیں، احکام میں دوسرے معتبر لوگوں کے مقابلہ میں اُن کی کوئی وقعت نہیں، بہرحال آپکے اس سوال کہ "مغازی میں زہری اور ابن اسحاق کی وقعت واقدی سے کیوں زیادہ ہے، کے متعلق کئی مرتبہ عرض کرچکا ہوں کہ اسلامی اصول روایت میں مغازی اور غیر مغازی کا کوئی فرق نہیں ہے، ہر وہ شخص جو آنحضرت صلعم کے متعلق کوئی بات نقل کرتا ہے، اس کو اسی مقررہ اصول پر جانچا جائے گا، خواہ وہ لڑائیوں کا حال ہو، یا اخلاق کا بیان ہو، یا کسی مذہبی حکم کا اظہار ہو، گو یہ سچ ہے کہ محدثین نے عملاً جانچ پڑتال کی وہ سختی اور شدت مغازی اور فضائل کے باب میں اتنی نہیں کی ہے، جتنی احکام کے باب میں کی ہے، اور اس کا انھوں نے علانیہ اقرار کیا ہے، اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مغازی اور فضائل میں کثرت سے لوگوں نے فضول اور لغو روایتیں شامل کردی ہیں، اور فن کے ناآشناؤں میں وہ مقبول اور عوام میں دل پسند ہیں،

واقدی کی مدافعت میں تین باتیں کہی گئی ہیں،

۱- واقدی کی وفات سے ایک نسل بعد کا طریقۂ روایت یا طرز تحریر (یعنی حذف اسناد یا خلط اسناد کا طریقہ) قابل اعتراض نہ تھا،

۲- امام زہری اور ابن اسحاق نے بھی ایسا ہی کیا ہے، پھر وہ کیوں واقدی کے مقابلہ میں معتبر اور مقبول ہیں ؟

۳- امام بخاری پر بھی لوگوں نے جرحیں کی ہیں، پھر وہ کیوں غیر معتبر نہیں، اور اُن کو

اس کے بعد کیا حق رہتا ہے کہ وہ واقدی پر معترض ہوں،

گو میں اپنے سابقہ بیانات میں ضمناً ان سوالات کا جواب دے چکا ہوں مگر براہِ راست بھی دینا چاہتا ہوں،

۱- یہ صحیح نہیں ہے کہ واقدی کی ایک نسل بعد تک یہ طرزِ تحریر قابلِ اعتراض نہ تھا، جن لوگوں نے اس پر اعتراض کیا ہے۔ وہ اس کے معاصر ہی تھے، اس سے ثابت ہوا کہ خود اس کے عہد میں یہ طرز ناپسندیدہ تھا، زہری اور ابنِ اسحاق کے طرزِ عمل سے اس پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہے، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اور آگے پھر لکھتا ہوں

۲- زہری نے کہیں کہیں ساری روایتوں میں دس پانچ جگہ ایسا کیا ہے، ابنِ اسحاق نے اس سے زیادہ ایسا کیا ہے لیکن واقدی نے پوری کی پوری کتاب اسی طرز پر لکھ ڈالی ہے، اس لئے اگر زہری اور ابنِ اسحاق کی صرف چند روایتیں جو اس طرز پر ہیں، قابلِ اعتراض ہیں، تو واقدی کی پوری کی پوری کتاب قابلِ اعتراض ہے، واقدی نے جہاں جہاں سندیں لکھی ہیں، اُن کو کہیں ایک جگہ بھی اصل خبر شاہدِ عینی تک پہنچانے کی کوشش نہیں کی ہے، یہاں تک کہ زہری کی روایتوں کا بھی اس نے یہی حال کیا ہے؛

زہری باوجودیکہ امام الائمہ اور تمام محدثین کے شیخ اعظم ہیں، تاہم اُن کی مرفوع و متصل روایتوں کا جو مرتبہ ہے۔ وہ اُن کے مراسیل اور بلاغات کا نہیں ہے، اور وہ بھی اسی طرح کم وقعت ہیں جس طرح دوسروں کی غیر مرفوع اور غیر متصل روایتیں، صرف اتنا فرق ہوگا کہ چونکہ زہری بذاتِ خود معتبر ہیں، اور واقدی جھوٹا، کاذب اور جعل ساز ہے، اس لئے زہری کی بے سند روایت کا اعتبار واقدی کی بے سند روایت سے زیادہ ہوگا، اور یہ وہی فرق ہے، جو ایک صادق البیان مورخ اور ایک عامی گپ ہانکنے والے مصنف میں تمام دنیا کرتی ہے۔

۳- امام بخاری پر دارقطنی وغیرہ نے بےشک اعتراضات کئے ہیں، لیکن وہ اعتراضات صرف فضل وکمال کی نمائش کے لئے محض اصطلاحی اور لفظی (ٹکنیکل) ہیں، واقعی نہیں ہیں، اسی لئے وہ اعتراضات علماء کے نزدیک ناقابلِ قبول ٹھہرے، اور ابن حجر نے مقدمہ میں ان میں سے ایک ایک اعتراض کو رد کردیا ہے۔ علاوہ ازیں کسی نے یہ جرأت نہیں کی ہے کہ واقدی کی طرح بخاری کو جھوٹا اور دروغ گو کہے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ بخاری کے چند راویوں کی معتبری اور نامعتبری پر بعض لوگوں کو اعتراضات ہیں، اس کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ ان معترضین کے نزدیک بخاری کی وہ روایتیں قابلِ اعتراض ٹھہریں گی، مگر اس سے یہ الزام نہیں آئیگا کہ بخاری کی ۶ ہزار روایتیں دفعۃً معیار سے گر جائیں، بر خلاف واقدی کے کہ اس کی ہر غیر مصدق روایت پایۂ اعتبار سے ساقط اور نامعتبر ہے،

بخاری کو ضعیف ثابت کرنے کے لئے آپ نے لکھا ہے کہ اس کے راویوں میں سے ایک ابوہریرہ ہیں جنھوں نے شق القمر جیسا واقعہ نقل کیا ہے، یہ طرز استدلال تو صحیح نہیں، ورنہ دنیا کے ہر مذہب کا مجموعۂ روایت ناقابل تسلیم ہو جائے گا، خواہ وہ نبوت کے ستارہ کا طلوع ہو، یا کسی کی موت کے وقت دنیا جہان کا تین گھنٹہ اندھیرا ہو جانا ہو، اور اسی کے علاوہ سیکڑوں ہزاروں معجزے ہیں، چاند کا پھٹنا، یا پانی پر چلنا عقلاً ممکن ہے یا نہیں، اور روٹی اور مچھلی کے چند ٹکڑے، سیکڑوں انسانوں کو یک وقت سیر کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اس کی بحث کا یہ موقع نہیں، میں نے اپنی سیرت نبوی کی تیسری جلد میں اس پر پوری بحث کی ہے، اور ہیوم کے فلسفہ (معجزات) سے متفق ہوں، کہ معجزات ممکن ہیں، بشرطیکہ ان کا ثبوت قطعی شہادت سے ہو سکے، لیکن بحث اس موقع کے لئے موزوں نہیں ہے، البتہ آپ بھی ہم سے متفق ہوں گے، کہ کسی راوی کے سچے یا جھوٹے ہونے کا یہ معیار نہیں، کہ اس نے

کسی معجزہ کی روایت کی ہے یا نہیں کی ہے، کہ اس کے وقوع اور عدمِ وقوع اور امکان اور عدمِ امکان میں ہم سب متفق نہیں ہیں،

اب میں آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ ابوہریرہؓ نے شقِ قمر کی روایت قطعاً نہیں کی ہے اور نہ بخاری میں اُن کی یہ روایت مذکور ہے، شقِ قمر کے راوی صحابہ میں عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، جبیر بن مطعمؓ، علیؓ ابن ابی طالب اور حذیفہ بن یمانؓ وغیرہ ہیں، ابوہریرہؓ اس واقعہ کے تقریباً آٹھ برس بعد مسلمان ہو کر اپنے وطن یمن سے مدینہ آئے ہیں، اس بارہ میں اُن کا کوئی بیان بخاری میں قطعاً نہیں ہے اور نہ کسی دوسری کتاب میں میری نظر سے گذرا ہے،

اس الزام کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے کہ "امام زہری نے خود اقرار کیا ہے کہ انھوں نے دباؤ سے مجبور ہو کر جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں"، اور میں یہ کہنے کی ہمت نہیں پاتا، کہ انگلینڈ کی ایک بڑی یونیورسٹی کا عربی پروفیسر ایک معمولی عربی عبارت کے سمجھنے میں قصداً غلطی کرتا، اور اضطراراً غلطی پر مجبور ہے، خوش قسمتی سے اس نے وہ عبارت بھی نقل کر دی ہے جس کے معنی اس نے یہ سمجھے ہیں کہ زہری نے خود اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے بادشاہوں کے دباؤ سے جھوٹی حدیثیں بنائی ہیں، اصل عبارت یہ ہے:-

اکرھنا علیہ ھؤلاء الامراء　　　　بادشاہوں نے ہم کو اس پر مجبور کیا،

اب فوراً سوال ہوتا ہے کہ کس امر پر مجبور کیا، ؟ اس کا مشارٌ الیہ اس منقولہ عبارت میں موجود نہیں، اس لئے جہاں سے یہ عبارتِ بالا نقل کی گئی ہے وہیں سے اس کا بقیہ ٹکڑا بھی نقل کر کے فقرہ کو مکمل کیا جائے،

عن عبدُ الرزاق عن معمر　　　　عبدالرزاق معمر سے اور معمر زہری سے

عَنِ الزهری قال کنا نکرہ	روایت کرتے ہیں، کہ زہری کہتے ہیں
کتابُ لعلم حتّیٰ اکرھنا علیہ	کہ ہم لوگ علمِ حدیث، کو لکھنا ناپسند
ھٰولاء الامراء فرأینا انْ	کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم کو بادشاہوں
لایمنعہٗ احد من المسلمینْ	نے (یعنی خلفائے بنوامیہ نے) اس کے
(ص ۱۳۵)	لکھنے پر مجبور کیا، اور اب ہم یہ سمجھتے
	ہیں: کہ کوئی مسلمان اب اس کو منع

یہی عبارت مختصر جامع بیان العلم لابن عبدالبر (ص ۳۷، مصر) تقیید العلم ابن ... تہذیب التہذیب وغیرہ میں ہے، اس کا تعلق اس مسئلہ سے ہے، کہ بعض علماء حدیث کے لکھنے سے منع کرتے تھے، اور وہ بشدت اس سے پرہیز کرتے تھے، مگر سلاطین بنوامیہ نے فرمایش کرکے محدّثین کو مجبور کر دیا کہ وہ احادیث کو اوراق میں لکھیں، اور اُن کے تحریری مجموعے ترتیب دیں، اور آخر امام زہری کو بھی اس کی مصلحت معلوم ہوئی، اور انھوں نے اس کی تعمیل کی، چنانچہ اُن کے ترتیب دئے ہوئے احادیث کے مجموعے ولید کے خزانہ سے اُس کے قتل کے بعد برآمد ہوئے (ابن سعد ۲-۱-۱۳۶) غور کیجئے کہاں زہری کا یہ اقرار کہ "انھوں نے سلاطین کی فرمائش سے احادیث کے مجموعے مرتب کیئے" اور کہاں یہ اقرار کہ سلاطین کے مجبور کرنے سے انھوں نے حدیثیں وضع کیں، اور گھڑیں" اللہ اکبر!

ع ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

فاضل پروفیسر کا یہ کہنا کہ "وہ سندیں جو واقدی کی نسبت عمدہ رائیں ظاہر کرتی ہیں، وہ ان سے جو اس کی تنقیص کرتی ہیں، ایک نسل مقدم ہیں" تحقیق پر مبنی نہیں، بلکہ فقط واقدی کے ساتھ حسن ظن پر مبنی ہے، واقدی کے موافقین اور مخالفین دونوں میں اس کے ہم عصر اور اس کے بعد کے لوگ

داخل ہیں، مزید ثبوت کے لئے ذیل میں دونوں کی ولادت اور وفات کی تاریخیں لکھدی جاتی ہیں،
چونکہ واقدی کے موافقین اس کے مخالفین کے مقابلہ میں کم درجہ کے لوگ ہیں، اس لئے ان میں اکثر
کی ولادت کی تاریخیں کم ازکم مجھ کو نہ مل سکیں،

۱- محمد بن عمر الواقدی

سنہ ۱۳۰ھ　　سنہ ۲۰۷ھ

۱- موافقین واقدی

	نام	سال ولادت	سال وفات
۱	عبدالعزیز بن محمد دراوردی		سنہ ۱۰۶ھ
۲	یزید بن ہارون	سنہ ۱۱۷ھ (شاید)	سنہ ۲۰۶ھ
۳	ابو عبید قاسم بن سلام	سنہ ۱۵۰ھ	سنہ ۲۲۳ھ
۴	مصعب بن عبداللہ الزبیری	سنہ ۱۵۶ھ "	سنہ ۲۳۶ھ
۵	محمد بن عبداللہ بن نمیر	.	سنہ ۲۳۴ھ
۶	محمد بن اسحاق مسیبی	.	سنہ ۲۳۶ھ
۷	عباس عنبری	.	سنہ ۲۴۶ھ
۸	یعقوب بن شیبہ	.	سنہ ۲۶۲ھ
۹	محمد بن اسحاق الصغانی	.	سنہ ۲۷۰ھ
۱۰	ابراہیم الحربی		سنہ ۲۸۰ھ

۲- مخالفین واقدی

	نام	سال ولادت	سال وفات
۱	امام شافعی	سنہ ۱۵۰ھ	سنہ ۲۰۴ھ

نام	سالِ ولادت	سال وفات
۲۔ یحیٰی بن معین	سنہ ۱۵۸ھ	سنہ ۲۳۳ھ
۳۔ احمد بن حنبل	سنہ ۱۶۰ھ	سنہ ۲۴۱ھ
۴۔ علی بن المدینی	سنہ ۱۶۱ھ	سنہ ۲۴۱ھ
۵۔ اسحاق بن راہویہ	سنہ ۱۶۱ھ	سنہ ۲۳۸ھ
۶۔ محمد بن بشار بندار	سنہ ۱۶۷ھ	سنہ ۲۵۲ھ
۷۔ ابوحاتم رازی	سنہ ۱۹۵ھ	سنہ ۲۷۷ھ
۸۔ امام بخاری	سنہ ۱۹۴ھ	سنہ ۲۵۶ھ
۹۔ جوزجانی (ابراہیم بن یعقوب)	۔	سنہ ۲۵۹ھ
۱۰۔ ابوزرعہ رازی	سنہ ۲۰۰ھ	سنہ ۲۶۴ھ
۱۱۔ ابوداؤد سجستانی	سنہ ۲۰۲ھ	سنہ ۲۷۵ھ
۱۲۔ امام نسائی	سنہ ۲۱۵ھ	سنہ ۳۰۳ھ
۱۳۔ ابوبشر دولابی	سنہ ۲۲۴ھ	سنہ ۳۱۰ھ
۱۴۔ ابن عدی	سنہ ۲۷۷ھ	سنہ ۳۶۵ھ
۱۵۔ دارقطنی	سنہ ۳۰۶ھ	سنہ ۳۸۵ھ

امام بخاری کی وفات کا واقدی کی وفات کے پچاس (۵۰) برس بعد واقع ہونا، ان دونوں کی معاصرت کی نفی کی کوئی دلیل نہیں۔ معاصرت کا حساب دونوں کی زندگیوں کے کم و بیش ایک ساتھ ہونے سے لگایا جاتا ہے نہ موت سے، واقدی نے سنہ ۲۰۷ھ میں وفات پائی، اور امام بخاری سنہ ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے؛ اس لئے وہ اس وقت ۱۳ برس کے طالب العلم تھے، اور

واقدی کے ذاتی طور سے ملنے والے اور جاننے والے تمام درس گاہوں میں موجود تھے، امام بخاری نے اپنی کتاب تاریخ صغیر میں جو کچھ لکھا ہے، اس کا یہی مطلب ہے، انھوں نے واقدی کے متعلق لکھا ہے (ص ۲۲۸، الہ آباد) ترکوہ یعنی لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا ہے، یہ ظاہر ہے کہ یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں، جو امام بخاری سے پہلے کے تھے، یا اُن کے زمانہ میں تھے، پہلی صورت میں یہ چھوڑنے والے خود واقدی کے معاصرین ہوں گے، اور دوسری صورت میں کچھ معاصر ہوں گے، اور کچھ معاصرین سے سننے والے ہوں گے، اس سے ثابت ہوا کہ بخاری کے مرنے سے واقدی کا پچاس برس پہلے مرجانا، بخاری کی واقدی سے عدم واقفیت کی دلیل نہیں ہو سکتی، خصوصاً جب کہ یہ معلوم ہوگا کہ وہ بچپن سے تحصیلِ علم میں مصروف ہوگئے تھے، اور واقدی کی وفات کے دو برس بعد ہی وہ عرب جانے کے لئے عراق پہونچ چکے تھے،

بہر حال موافقین کی ولادت کی تاریخیں چونکہ کمتر معلوم ہیں: اس لئے واقدی المتولد سنہ ۱۳۰ھ المتوفی سنہ ۲۰۷ھ کے معاصرین کا حال پورے یقین سے نہیں معلوم ہو سکتا، تاہم مخالفین کی تاریخوں کی نظیر سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۵۰ھ تک جس نے وفات پائی ہو اُس نے واقدی کا زمانہ پایا ہے، اس لحاظ سے موافقین میں سے نمبر ۲ تک یعنی عباس عنبری تک اوس کے معاصرین میں ہیں، اور تین متاخر ہیں،

مخالفین میں امام شافعی المتولد سنہ ۱۵۰ھ یحییٰ بن معین المتولد سنہ ۱۵۸ھ، احمد بن حنبل المتولد سنہ ۱۶۰ھ علی بن المدینی المتولد سنہ ۱۶۱ھ اسحاق بن راہویہ المتولد سنہ ۱۶۱ھ بندار المتولد سنہ ۱۶۷ھ جیسے جلیل القدر ائمۂ فن ہیں، جنھوں نے اوس کی ہم عصری کا زمانہ پایا ہو، اور کم از کم ستاون برس سے ۴۰ برس تک اس سے اُن کی معاصرت قائم رہی ہو، واقدی کی وفات کے

وقت امام بخاری کی عمر ۱۴ برس کی تھی، جیسا کہ ابھی کہا گیا، ابو حاتم رازی کی عمر اس وقت ۱۳ برس کی، اور ابوزرعہ رازی کی عمر ۸ برس کی تھی، اور اس وقت واقدی کا چرچا درس کے اُن حلقوں میں کافی موجود ہوگا جن میں جاکر وہ بیٹھے۔ بقیہ اشخاص کی رائیں ذاتی تجربہ پر نہیں، بلکہ واقدی کے مجموعوں اور اپنے ان شیوخ کی آرا پر مبنی ہیں جنھوں نے واقدی کو خود دیکھا تھا، یا واقدی کے دیکھنے والوں کو دیکھا تھا، البتہ ابو بشر دولابی، ابن عدی، اور دار قطنی کی رائیں اس کے متعلق اس کے معاصر جمہور علما اور بعد کے اکابر کے اختلافی فیصلہ پر بھی ہیں، اس لئے واقدی کے معاملہ میں یہ اصول صحیح ہوگا کہ جب کسی شخص کے خود معاصرین اس کو اعلیٰ سند تسلیم کریں، تو مشکل مناسب ہوگا، "کہ بعد کی نسل کے تھیا دو جنبش کی بلا دلیل رایوں کی بنا پر اس کو جھوٹا کہکر بدنام کیا جائے،

واقدی کے مخالفین اور موافقین کی ترجیحی ترازو کا فیصلہ دو اور پاسنگ سے بھی ہو سکتا ہے، ایک ان کے فضل و کمال، جمہور اہلِ عصر میں، ان کے اعتبار و استناد، اور اُن کی شہرت اور عزت کی بنا پر، چنانچہ آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بحیثیت ایک سچے طالب علم اسلام کے ان دو جماعتوں میں سے آپ سب سے زیادہ کس سے واقف ہیں، اور اسلامی لٹریچر میں کس کے نام کو اہمیت، اور کس کی رائے کو وقعت حاصل ہے، امام شافعی، امام بخاری، علی ابن مدینی، ابن حنبل، ابن معین، اور ابن راہویہ کو، یا دراوردی، زہیری، مسیبی، یزید بن ہارون اور عنبری کو،

دوسرا ترجیحی معیار یہ ہے کہ واقدی کا ابتدائی زمانہ گو مدینہ میں گذرا، لیکن اس کی عمر کا بڑا حصہ بغداد میں بسر ہوا، اور وہیں اس کو شہرت حاصل ہوئی، اس بنا پر ان ائمہ کی رائے کو ترجیح حاصل ہے، جو بغداد اور عراق میں عموماً سکونت رکھتے تھے، یا اکثر آتے جاتے تھے، اس

حیثیت سے ان دونوں جماعتوں کا یہ حال ہے کہ درآوردی مدینہ میں رہے، ۱۸۶ھ میں
وفات پائی، اور بغداد آکر واقدی میں جو خاص انقلاب ہوا، اور جو ان کی موت سے
کم از کم ۲۲ برس بعد تک رہا اس کی واقفیت سے وہ قطعاً محروم رہے، اس لئے اُن کی رائے
واقدی کی صرف مدنی زندگی تک محدود ہے، بقیہ میں ایک زبیری البتہ بغداد میں رہتے
رہتے تھے، ابن نمیر کوفہ میں اور یزید بن ہارون واسط میں رہتے تھے، مگر معدلین کو دیکھو
کہ ان میں بیشتر اصحاب یا بغداد ہی میں رہتے تھے، یا بہت دنوں تک مدینہ اور بغداد
دونوں میں رہے تھے، چنانچہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین خاص بغداد کے تھے، علی بن مدینی
مدینہ اور بصرہ میں تھے، بندار بصرہ اور بغداد میں سکونت رکھتے تھے، اسحاق بن راہویہ عراق
ہی میں سکونت پذیر تھے، امام شافعی مدینہ میں رہے، اور بغداد بھی آتے رہے، نتیجہ صاف ظاہر ہے

معارف جنوری ۱۹۲۷ء

سُنّت

خوشی کی بات ہے کہ کچھ لوگوں میں آج کل مذہبی تحقیقات کا شوق پیدا ہو رہا ہے

گو وہ ہمارے نقطۂ نظر سے آج کتنے ہی دور ہوں، مگر بہر حال اُن کا یہ شوق اس لحاظ سے قابلِ

تعریف ہے کہ انھوں نے اس قسم کی بحثوں میں پڑنا اپنے لئے تضیع وقت نہیں سمجھا، گو اس کا

افسوس ہے کہ کامل تحقیق سے پہلے اپنے غور و فکر کے نتائج کو عام مسلمانوں کے سامنے پیش

کر دینا ممکن ہے کہ بہتوں کی ٹھوکر کا باعث ہو، حق کی اشاعت ضروری ہے، لیکن شائع

کرنے والے پر اس کی بڑی ذمہ داری آتی ہے، کہ وہ پہلے حق کا حق ہونا اچھی طرح سمجھ لے،

ایک ادبی رسالہ[۱] میں ماہ بماہ ایسے مضامین نکل رہے ہیں، جن میں اس قسم

کی تحقیقات کے نمونے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں، خصوصاً ایک خاص صاحب[۲] کے مضمون

اور بھی زیادہ عجیب حقائق کا مجموعہ ہوا کرتے ہیں، جن کا سلسلہ خدا خدا کرکے اب تمام

ہوا ہے، میں نے اس سلسلۂ مضمون کے بعض ٹکڑوں کو اس وقت بھی پڑھا تھا، جب وہ

پہلے پہل معارف میں چھپنے کی خاطر بھیجے گئے تھے، اور اب بھی دیکھا، پھر موصوف کے خیالات

سے اکثر خطوط و مکاتیب کے ذریعہ بھی واقفیت ہوتی رہی، مگر ان تمام معلومات کے بعد

بھی موصوف [illegible] یا مسلک کوئی خاص اصول پیش نظر نہیں معلوم ہوتا، میں نے ایک دفعہ انکو

---

[۱] رسالہ نگار [illegible] نیاز فتحپوری۔

یہاں کے ایک ہم خیال جج صاحب کو لکھا تھا،

گاہ بر دل زند و گاہ زند بر جاں

یا رز لفِ تو ندانم کہ چہ در سر دارد

یہی شعر اب بھی پڑھتا ہوں۔ ہمارے دوست نے ان احکام کی ایک طویل فہرست دی ہے جو قرآن پاک میں مذکور نہیں، اور اُن کا ماخذ صرف حدیث ہے، مجھے تو ان میں سے اکثر احکام قرآن پاک میں نظر آتے ہیں،

اصول فہم قرآن میں نے ایک سے زائد بار لکھا ہے کہ اس قسم کے مباحث میں جزئی باتوں کی تحقیق میں پڑنا بیکار ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ اُن کے اصول کلیہ پر بحث کی جائے۔ جن کے اندر یہ تمام جزئیات داخل ہیں، مثلاً ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی عبارت سے کسی مفہوم و معنی کے مستنبط کرنے کے کیا اصول ہیں؟ ہمارے یہاں اصول فقہ کا بڑا حصہ انہی مباحث کی تفصیل میں ہے، اور اس میں وہ اصول بتائے گئے ہیں، جن کی بنا پر کسی عبارت سے کسی مفہوم و معنی کا استنباط کرسکتے ہیں،

مثلاً بحث یہ ہے کہ اگر قرآن میں کوئی ایسا لفظ یا محاورہ ہے، جس کے متعدد معنی ہیں، جس کے حقیقی معنی یا مجازی معنی مراد ہونے میں شک ہو تو تعیین کیونکر ہوگی، یا یہ کہ اس کے معنی تو معلوم ہوں لیکن اس کے شمول میں شک ہو کہ کتنے افراد کو یہ شامل ہے۔ یا یہ بحث کہ یہ حکم مطلق ہے، یا اُس کے اندر کوئی استثنار یا تخصیص بھی ہے، یا اور اسی قسم کی دوسری باتوں کے معلوم کرنے کے کیا قواعد ہیں؟

پھر یہ کہ ایک عبارت سے مطلب نکالنے کی متعدد صورتیں ہیں، ایک تو صاف صاف لفظوں سے مطلب نکلتا ہے، ایک اس کے عنوان بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے اشارات

وکنایات سے کچھ سمجھا جاتا ہے اسلئے اگر کوئی بات قرآن پاک کے لفظوں میں مذکور نہیں مگر اس کے عنوان بیان اور اشارات وکنایات سے مفہوم ہوتی ہے، تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ قرآن میں نہیں۔

کیا جس طرح آج آپ کو قرآن پاک کی آیتوں کے نزول کے ماحول سے سیکڑوں برس کی دوری کے باوجود اُن کے متعلق بیسیوں نکتہ آفرینیوں کا حق حاصل ہے، یہ حق خود اس کو حاصل نہ تھا جس پر یہ قرآن اترا، اور جس کو اُس کے تبیین اور تشریح کا حکم تھا؟

تفاوتِ ذہن

فرض کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن میں یہ حکم نازل ہوتا ہے، کہ صبح سے شام تک روزہ رکھو، اب ایک شخص آکر پوچھتا ہے، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے بھولے سے کھا لیا کیا میرا روزہ صحیح ہوا؟ آپ نے فرمایا ہاں، بھول چوک معاف ہے، روزہ صحیح ہوا، اب سوال یہ ہے کہ آپ نے جو یہ مسئلہ بتایا، اصولاً یہ قرآن کے اندر تو مذکور ہے مگر خاص روزہ کے حکم کے ساتھ مذکور نہیں، تو کیا یہ کہا جائے گا کہ یہ حکم قرآن کے اندر نہیں اور یہ حدیث قرآن کے خلاف ہے

لیکن میں دوسری بات کہتا ہوں، دنیا میں تمام انسان ایک ہی قابلیت و ذہانت اور فہم کے نہیں ہوتے تو کہیے کہ آج آپ کو جو نکتہ آفرینیاں سوجھتی ہیں، وہ نہ پہلے کسی کو سوجھیں، اور نہ خود اس زمانہ کے بہت سے آدمیوں کو سوجھتی ہیں۔ قرآن پاک ہر آدمی پڑھتا ہے، مگر ایک صاحبِ علم کو اس کے لفظ لفظ سے جو حقائق و معارف معلوم ہوتے ہیں وہ ایک عام آدمی کو نہیں معلوم ہوتے،

احادیث سے چارہ نہ تھا

جب یہ مسلم ہے، کہ افرادِ انسانی کی عقلیں متفاوت ہیں، اور اُن کے فہم و ذہانت کے معیار مختلف ہیں، تو اب سوال یہ ہے کہ اگر آنحضرت پر قرآن میں ایک حکم نازل ہونے کے بعد، اگر وہی یا اس سے بظاہر کسی قدر مختلف کوئی بات پیش آئے، یا کسی صحابی کو یہ شک پیدا ہو، کہ یہ واقعہ اس کلی حکم کے تحت میں ہے، یا نہیں

تو اب وہ اپنی مشکل کے حل کے لئے کیا صورت اختیار کرتے؟ ظاہر ہے کہ یہی ممکن اور موزوں صورت ہو سکتی تھی کہ وہ صاحب وحی علیہ السلام سے آکر دریافت کرتے، پھر سوال یہ ہے کہ جب وہ آکر پوچھتے تو آنحضرت صلعم کیا کرتے، خاموش رہتے، یا قرآن پاک کی اس آیت کے بقیہ الفاظ کو سنا کے سمجھاتے اس کو اپنی صورت واقعہ پر چسپاں کرنے میں ان کو شبہ پیدا ہو رہا ہے، دہرا دیتے یا یہ کرتے کہ جو گتھی ان کے سامنے تھی، اس کو سلجھا دیتے، اور بات صاف کر دیتے، ظاہر ہے کہ یہی آخر صورت قابل اختیار تھی، اب ایسی حالت میں کیا ان صحابی کے لئے یہ ناجائز قرار دیا جاتا کہ اپنی صورت واقعہ کو دربار رسالت میں اپنے سوال کو اور آپ کے جواب کو کسی دوسرے کے سامنے بیان نہ کرتے، یا اگر کسی دوسرے کو وہی صورت حال پیش آتی، تو اس کو وہ بتا نہ سکتے، کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس کو ناجائز اور ناروا نہیں کہہ سکتا، ایسی صورت حال ہے، جس کا نام اصطلاح میں "حدیث" ہے،

اس کو کسی مثال میں دیکھئے تو واضح ہو جائے گا قرآن پاک میں ہے کہ

لا تحرموا طیبات ما احل — خدا نے تمہارے لئے پاک چیزیں حلال

اللہ لکم — کی ہیں اس کو اپنے اوپر حرام نہ کرو

ایک صحابی آکر پوچھتے ہیں کہ یا رسول اللہ صلعم میں چاہتا ہوں کہ شادی نہ کروں، شادی کا جذبہ جن اسباب سے انسان میں پیدا ہوتا ہے انہی کو کاٹ ڈالوں، آپ نے فرمایا جائز نہیں ہے، اس کے بعد قرآن پاک کی آیت مذکور پڑھی جس سے ان صحابی کی [illegible] دور ہوئی تھی. تو کیا ان صحابی کے پوچھنے اور آپ کے جواب دینے کے واقعہ کو کسی سے بیان کیا جانے، اور اگر کسی تابعی کے ذہن میں وہی سوال پیدا ہوتا ہو تو کسی صحابی کے لئے یہ ناجائز تھا کہ وہ اس واقعہ کو اس کے سامنے دہرائے، اور اس کے شک کو دور کرے، اگر یہ جائز تھا

اور ہے تو اسی کا نام روایت حدیث ہے،

روایت سے چارہ نہیں، | روایت سے دنیا میں کسی فن کسی مذہب کسی حکومت کسی انسانی کاروبار کو کبھی بھی چھٹکارا نہیں ہو سکتا، ظاہر ہے کہ ہر انسان، ہر واقعہ، ہر تجربہ اور ہر حادثہ کے وقت بذات خود موجود نہیں رہ سکتا، ایسی صورت میں غیر موجود اشخاص تک اس واقعہ تجربہ اور حادثہ کو پہنچانے کی روایت کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں ہو سکتی، خواہ وہ زبانی ہو، یا تحریری ہو، یا اُن لوگوں تک جو اس زمانہ کے بعد آئیں، پہنچانے کا ذریعہ روایت کے سوا کوئی دوسرا موجود نہیں ہے، دنیا کے تمام فنون، مسائل، مخترعات اور واقعات وحوادث کی نقل اور تسلیم اسی طرح دنیا میں عہد بعہد پہنچا، اور پھیلا ہے۔ تو پھر کیا اسلام دنیا سے کوئی انوکھا واقعہ ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و فرامین واقوال کو دوسروں تک یا آیندہ آنے والوں تک پہنچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ تلاش کیا جاتا،

آج کے یہ نئے مفسرین اور یہ جدید بانیانِ مذاہب بالفرض اپنی اُمت کے امام اور مقتدا بن جائیں، تو اُن کی ذاتی تحقیقات، کاوشیں، نکتہ آفرینیاں اُن کی اُمت کے ان افراد تک جو اُن کے حلقہ درس سے دور ہیں، یا آج سے سینکڑوں برس بعد آئیں گے، پہنچانے کا تحریری یا زبانی روایت کے سوا اور کیا ذریعہ ہوگا، خصوصاً اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ابھی کاغذ کی صنعت بھی اس ملک میں نہیں، لکھنے پڑھنے کا رواج بھی کم ہے، اور ڈاک، تار، برقی مشین، پریس، اور چھاپہ کی ایجاد کو ابھی ہزار برس باقی ہیں،

آج دنیا میں بڑی بڑی قوموں کی تاریخیں، بڑے بڑے علماء کے خیالات، پرانے مصنفین کی تصنیفات، ہم تک کس طرح پہونچی ہیں، خود قرآن پاک ہم تک کس طرح

پہنچا ہے، اسی تحریری یا تقریری روایت کے ذریعہ سے' فرق اگر ہے تو یہ ہے کہ قرآن پاک ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی روایت ہے، اور احادیث چند انسانوں کی، مگر ایسے انسان جن کا حال ہم کو معلوم ہے، اور اُن کا سلسلۂ سند ہمارے پاس محفوظ ہے، اس لئے قرآن و حدیث میں جو فرق ہو سکتا ہے، وہ وثوق اور اعتبار کی زیادتی اور کمی کا، اور قرآن و حدیث کے درمیان اس نسبت کو ہر مسلمان بلکہ ہر اہلِ حدیث تسلیم کرتا ہے،

اس لئے جس طرح دنیا میں عام روایتوں کے صحیح یا غلط ہونے کی تنقید کے اصول ہیں وہی حدیث کی بھی تنقید کے اصول ہیں، ہم سے جب کوئی بات کہی جاتی ہے، تو ہم اس کو کس طرح جانچتے ہیں؟ اسی طرح نہ کہ ہم دیکھتے ہیں، کہ بیان کرنے والا کیسا ہے، جس سے بیان کیا تھا، وہ کیسا تھا، جس وقت یہ واقعہ ہوا، وہ اُس میں موجود تھا یا نہیں، جس شخص سے یہ بات منسوب کی جاتی ہے، اُس کے عام حالات سے یہ بات لگتی ہوئی ہے یا نہیں، یہی چیزیں ہیں جن کا نام اصولِ حدیث ہے،

اسلام کی تاریخ برباد ہو جائے گی،

اسلام کا یہ عظیم الشان کارنامہ ہے، کہ اس نے اپنے رسول کے ایک ایک واقعہ، ایک ایک قول، اور ایک ایک حکم کو دنیا میں محفوظ رکھا، اور اس کے لئے متعدد اصول اور فن ایجاد کئے، اگر اسلام کے اِن نئے محسنوں کے خیالات مان لئے جائیں تو یہ کارنامہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے لعنت بن جائے گا، اور صحابہ سے لے کر آج تک وہ تمام اخیار و ابرار اُمت جن کی زندگیوں پر آج نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کو ناز ہے، وہ سب کے سب راست بازی اور صداقت کی بارگاہ سے راندہ نکلیں گے، کیا اسلام پر احسان ہے؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے لے کر آج تک خلفائے راشدین، تابعین، ائمہ مجتہدین اور علمائے خیر تمام کے تمام اپنے استنباطات، اور اجتہادات میں قرآن پاک کے بعد احادیث ہی

اقوالِ نبوی کی تقلید و اتباع کرتے رہے ہیں لیکن اگر آج کے اجتہادات مان لئے جائیں تو لازم آئے گا کہ یہ سب کے سب نعوذ باللہ مشرک، انسان پرست اور کتاب اللہ کے تارک تھے، اور آج جو نئے مفسر اور نئے فقیہ بنے ہیں اُن کے اقوال و اجتہادات و استنباطات کے سننے والے موحد، سچے دیندار، اور کتاب اللہ کے سچے پیرو ثابت ہوں گے۔ اور یہ تسلیم کرنا ہو گا کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشن سخت ناکام رہا، اور تیرہ سو برس تک اسی طرح ناکام رہا، یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک قطعہ میں کتاب اللہ کے چند ماہرین پیدا ہوئے، جنھوں نے اصل اسلام کو دنیا میں آشکارا اور وہ کام کیا، جو نہ خود رسول نے کیا، نہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کیا، نہ عمر فاروق نے کیا، نہ عثمان غنی نے کیا، نہ علی مرتضیٰ نے کیا، نہ دوسرے صحابہ اور تابعین نے کیا اور نہ دوسرے ائمہ مجتہدین سے ہو سکا۔ اس کے بعد کوئی بتائے، کہ قرآن کی عملی تصویر دنیا میں کبھی جلوہ گر تھی یا نہیں۔ اگر تھی تو وہ کب، اور اُس کی تاریخ کہاں ملے گی اور اگر نہ تھی تو قرآن سے زیادہ ناکام صحیفۂ آسمانی دنیا میں اور کون ہو گا، کیا کسی مسلمان کی غیرتِ ایمانی اس خیال کو جائز رکھتی ہے؟

احادیث کا کتنا حصہ قابلِ بحث ہو سکتا ہے؟

بہر حال آئیے غور کریں کہ احادیث میں کیا کیا ہے، اور اُس کے کتنے حصے پر بحث کی جا سکتی ہے۔ احادیث کا بڑا حصہ درحقیقت تاریخی ہے، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے حالات، سوانح، اور واقعات کی روایتیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی قابلِ بحث چیز نہیں۔ یہ تاریخ کا اسی طرح حصہ ہیں جس طرح دنیا کی اور تاریخیں ہیں، فرق یہ ہے کہ یہ تاریخ کا ایسا مستند و معتبر حصہ ہے جس سے زیادہ معتبر اور مستند حصہ دنیا میں موجود نہیں، مصر، ہندوستان، بابل، نینوی، سیریا، یونان و روم کس ملک اور کس قوم کی تاریخ ہے، جو اس استناد، اس اعتبار، اس سلسلہ کے ساتھ محفوظ ہے، اور

جو تقلید روایت کے اصول پر ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہر سکتی ہے۔

۲۔ دوسرا حصہ اخلاق و حکم کا ہے جس میں عقل و حکمت کی عمدہ عمدہ باتیں۔ مثلاً جھوٹ کی برائی۔ عدل کی تعریف، علم کی خوبی وغیرہ بیان کی گئی ہیں جن کی قرآن کے علاوہ خود فطرت انسانی تصدیق و تائید کرتی ہے کیا یہ رد کے قابل ہیں؟

۳۔ تیسری چیز عقائد ہیں۔

اسلام کے ایک چھوٹے سے فرقہ کے سوا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ غالی ظاہریہ کے سوا کوئی اس کا قائل نہیں، کہ عقائد کا ثبوت قرآن کے علاوہ کسی اور طور سے ہو سکتا ہے کیونکہ عقیدہ نام ہے یقین کا، اور یقین کا ذریعہ صرف ایک ہے، اور وہ وحی، اور اُس وحی کا تواتر ہے اس لئے عقائد کا مبنی صرف قرآن پاک یا احادیث متواترہ ہیں۔ ظاہر ہے، کہ احادیث متواترہ کا مطلق وجود نہیں۔ یا ایک دو سے زیادہ نہیں۔ ایسی حالت میں عام احادیث عقائد کا مبنی نہیں قرار پا سکتی ہیں، عموماً احادیث روایتِ احاد ہیں، اور اُن کا ایک حصہ مستفیض ہے یعنی صحابہ کے بعد ان کے راویوں کی کثرت ہوئی ہے، اس لئے یہ روایتیں صرف قرآن پاک کی آیات کی تائید میں کام آسکتی ہیں، مستقلاً ان سے عقائد کا ثبوت حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ اب رہ گئے احکام، ان کے لئے مستفیض و احاد سب کچھ کارآمد ہیں۔ دنیا میں تمام عملی کاروبار اسی پر چل رہا ہے۔ ایک آدمی تنہا آپ کو آکر اطلاع دیتا ہے، کہ فلاں شخص آپ کو بلاتا ہے۔ آپ بے چون و چرا اُس کے ساتھ ہو جاتے ہیں کبھی سوال و جواب نہیں کرتے، کہ اُس نے بلایا بھی ہے، یا نہیں، ہاں اگر کسی قرینہ سے شک ہوتا ہے، تو سوال و جواب کر لیتے ہیں، یہی سب صورتیں احادیث میں بھی جاری ہیں، مثلاً اگر کوئی حدیث

کسی دوسری زیادہ معتبر روایت کے خلاف ہو، قرآن کے خلاف ہو، یا اور کوئی بات
اس کے مخالف نظر آئے تو ایسے موقع پر یقیناً صاحبِ تحقیق کو حق ہے کہ اس پر بحث کرے۔

احادیثِ قرآن سے ماخوذ ہیں

بہت سے علمائے محققین کی طرح میرا بھی یہ اعتقاد ہے کہ احکام و اخلاق
کے متعلق صحیح احادیث میں جو کچھ ہے، وہ تمام تر قرآن سے ماخوذ و
مستنبط ہیں، اور چونکہ خود صاحبِ وحی کا بتائیدِ الٰہی و بشرحِ ربانی استنباط ہے، اس لیے
بشرطِ تواتر وہ بھی یقینی اور واجب التعمیل ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کا نام "تبیین"
کھولنا اور واضح کر کے دکھانا ہے۔ اس موقع پر ہم کو بے شک یہ گلہ ہے، کہ ہمارے علماء اور
خصوصاً فقہا متاخرین نے اس حیثیت سے قرآن پاک کی خدمت کم کی، حالانکہ صحابہ اور
ائمہ مجتہدین نے اپنے اجتہادات اور استنباطات میں ہمیشہ قرآن کو سب سے اول پیشِ نظر
رکھا لیکن بطورِ فن کی حیثیت سے اس کو مستقل نہیں کیا۔ اُن کا زمانہ تدوینِ فن کا نہ تھا،
یہ بعد کے لوگوں کا کام تھا، اس کی وجہ یہ ہوئی، کہ جس طرح کتبِ فتاویٰ کی سہولت نے
لوگوں کو فقہ سے اور کتبِ فقہ کی سہولت نے حدیث سے باز رکھا، اسی طرح حدیث کی سہولت
اور ابواب کی تقسیم نے لوگوں کو قرآن کی طرف رجوع کرنے سے باز رکھا، کہ قرآن مجید میں
ہر مسئلہ الگ عنوانوں اور بابوں میں درج نہیں، اس لیے لوگوں کو تلاش میں دقت
ہوتی ہے، پھر قرآن سے استنباط کر لینا ہر عامی کا کام نہیں۔ علماء میں سے جنھوں نے
احکام القرآن پر کتابیں لکھیں، انھوں نے بھی تفسیری ترتیب کو چھوڑ کر فقہی ترتیب کو اختیار
نہیں کیا، جس کی وجہ سے جو مشکل لوگوں کو قرآن کی طرف رجوع ہونے میں پہلے پیش آتی
تھی، وہ پھر باقی رہی۔ بہر حال ضرورت ہے کہ اب عقائد القرآن اور اخلاق القرآن پر ہمارے
علماء مستقل کتابیں لکھیں، آج بھی جو لوگ قرآن پاک کے ساتھ شغف کا اظہار کر رہے ہیں،

اور قرآن ہی کو صرف حجت جانتے ہیں، وہ بجائے اپنے موجودہ طرزِ عمل کے قرآن واحادیث کے باہمی تعلق وارتباط پر اس نظریہ کو سامنے رکھ کر کام کرتے، تو اسلام کے لیے کتنا بڑا عظیم الشان کارنامہ انجام دیتے، مگر افسوس ہے کہ اس کے بجائے، اور بھی تفرقہ وانتشار کا باعث ہو گیا، جس کی مثالیں چند ہی سال میں پنجاب کے مختلف اضلاع میں نظر آتی ہیں،

بہرحال اس غلط طریقہ کے سوا ایک اور غلط مبحث بھی ہو رہا ہے،

حدیث و سنت میں فرق

آج کل لوگ عام طور سے حدیث و سنت میں فرق نہیں کرتے، اور اس کی وجہ سے بڑا مغالطہ پیش آتا ہے، حدیث تو ہر اس روایت کا نام ہے، جو ذاتِ نبوی کے تعلق سے بیان کی جائے، خواہ وہ ایک ہی واقعہ ہو یا ایک ہی شخص نے بیان کیا ہو، مگر سنت دراصل عملِ متواتر کا نام ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عمل فرمایا، آپ کے بعد صحابہ نے کیا، پھر تابعین نے کیا، گو یہ زبانی روایت کی حیثیت سے متواتر نہیں، مگر عملاً متواتر ہے، اسی طرح یہ بالکل ممکن ہو کہ ایک واقعہ روایت کی حیثیت سے مختلف طریقہ سے بیان کیا گیا ہو، اس لئے وہ متواتر نہ ہو مگر اس کی عام عملی کیفیت متواتر ہو، اس متواتر عملی کیفیت کا نام سنت ہے،

فرض کیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی فرضیت کے بعد تمام عمر دن میں پانچ دفعہ پڑھتے رہے، آپ کے بعد تمام صحابہ کا یہی طرزِ عمل رہا، یہی تابعین کا رہا، اور یہی روئے زمین کے تمام مسلمانوں کا رہا، ان کا بھی جو بخاری و مسلم کے وجود سے پہلے تھے، اور ان کا بھی جو اس کے بعد پیدا ہوئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ وقت کی نماز، اصطلاحی روایت متواترہ سے ثابت ہو یا نہ ہو، لیکن عملِ متواترہ سے

بلا شک و شبہ ثابت ہے، تیرہ سو برس زمانہ سے آج تمام دنیا کے مسلمان جن کے عقائد، اعمال، خیالات، اخلاق، زبان، تمدن، وطنیت اور زمانہ میں بعید اختلافات اور تفاوت ہیں، تاہم اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب دن میں پانچ دفعہ نماز پڑھا کرتے تھے، فلاں فلاں اوقات میں پڑھا کرتے تھے، اور فلاں فلاں ارکان کے ساتھ پڑھا کرتے تھے، یہ تواتر عملی ہے، جس کا انکار مکابرہ ہے،

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان پانچ اوقات کا تعین اور اس طرح طریقہ نماز بخاری یا مسلم یا ابو حنیفہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہم کی وجہ سے مسلمانوں میں رواج پذیر ہو گیا ہے، جو اگر بخاری یا مسلم دنیا میں نہ بھی ہوتے، تو بھی وہ اسی طرح عملاً ثابت ہوتا، ... ...

... ... بلکہ اگر دنیا میں بالفرض احادیث کا ایک صفحہ بھی نہ ہوتا، تو بھی وہ اسی طرح جاری رہتی، احادیث کی تحریر و تدوین نے اس طرز عمل کی تائید اور انکار تاریخی حیثیت ثبت کر دی ہے، تو کیا پھر اس بنا پر کہ اس عملی کیفیت کو دوسری یا تیسری صدی کے کسی محدث نے الفاظ و تحریر میں قلم بند کر دیا، وہ تواتر عملی درجہ اعتبار سے گر گیا؟

عملی روایتوں میں اختلاف | اس موقع پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض عملی روایات میں بھی تو اختلاف ہے، روایتوں میں ہے کہ آپ یا صحابہؓ رفع یدین کرتے تھے، بعض میں ہے کہ نہیں کرتے تھے، بعض میں ہے کہ سینے پر ہاتھ باندھتے تھے، دوسری روایت میں ہے کہ ناف پر ہاتھ باندھتے تھے، ایک میں ہے کہ آمین زور سے کہتے تھے، دوسری میں ہے کہ

آہستہ کہتے تھے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں عملاً کیونکر درست ہو سکتے ہیں، میرا جواب یہ ہے کہ اس مشکل کے حل کی بھی وہی تدبیر ہے جو دنیا کے دوسرے روایتی واقعات کے حل میں اختیار کرتے ہیں۔ اگر آپ کے سامنے کسی نادیدہ واقعہ کے متعلق دو قسم کی مختلف روایتیں آتی ہیں، تو آپ کیونکر فیصلہ کرتے ہیں؟ یہی کرتے ہیں کہ دیکھتے ہیں کہ ان دونوں بیان کرنے والوں میں سے کون زیادہ معتبر اور ثقہ ہے، یا کس کا بیان دوسرے یقینی حالات و واقعات سے زیادہ قرین قیاس ہے، یہی صورت ان احادیث میں بھی ہے، جتنا حصہ ان عملی روایات کا ایسا ہے جو بلا کسی اختلاف ثابت ہے، وہ یقینی اور ناقابلِ رد ہے، اور جتنا حصہ مختلف فیہ ہے اگر ان مختلف پہلوؤں میں کوئی ایک پہلو اصولاً اور قیاساً زیادہ معتبر ہے اس کو اختیار کرنا چاہئے اور اگر سب پہلو برابر ہیں، تو یہ مان لینا چاہئے کہ ان مختلف طریقوں میں جس طرح بھی کیا جائے وہ صحیح ہے۔

فرض کیجئے نماز کے متعلق پانچ اوقات کے عمومی تعین، نمازوں کی تعداد، نمازوں کی عام ہیئت، یعنی قیام، رکوع، سجود، اور بحالت قیام قرآن پڑھنے میں، اور دوسرے ارکان میں تسبیح و تہلیل کہنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اس لئے یہ عمل متواتر ہے، اور اس میں کوئی شبہہ اور شک نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ بات کہ رفع یدین کیا جائے یا نہ کیا جائے، آمین زور سے کہی جائے، یا آہستہ، دو وقت کی نماز ایک وقت میں کب اور کہاں پڑھی جا سکتی ہے، ان کے متعلق اگر اختلاف ہے تو تحقیق کرنی چاہئے کہ ان میں سے غالب پہلو کس طرف ہے، اگر آپ کو اس کا پتہ لگ سکے، تو اس کو اختیار کیجئے ورنہ یہ سمجھ لیجئے کہ دونوں طرح سے جائز ہے، اور ان میں سے جو پہلو بھی کوئی اختیار کرے

اس پر ملامت نہیں ہے،

سنت کی حقیقت اس تفریق سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ سنت اور حدیث میں عظیم الشان فرق ہے، حدیث محض روایت کی حیثیت کا اور سنت اس کے عملی تواتر کا نام ہے، احادیث کو چھوڑ کر قرآن پاک کی بھی یہی صورت ہے، قرآن پاک کا حکم ہے، کہ نماز پڑھو "اقیموا الصلوٰۃ" اور اس کی تفصیلات بھی جا بجا بتا دیں، انہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھ کر بتا دیا، اور فرمایا "صلوا کما رایتمونی" اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم نے مجھے پڑھتے دیکھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر اسی طرح پڑھتے رہے، قرآن پاک کے الفاظ کی جو عملی تصویر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی، وہی سنت ہے، اور یہ گویا قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے، جس کا مرتبہ احادیث کے لفظی روایات سے بدرجہا بلند ہے، سنت کے علاوہ اسی مفہوم کے لئے قرآن پاک، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ نے دوسرے الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے، مثلاً سبیل اور اسوہ وغیرہ، مگران سب کے معنی چلے ہوئے راستہ اور پیروی کے ہیں، یعنی وہ راستہ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عمر بھر چلے، تمام صحابہ چلے، اور اکابر امت چلے، وہ سنت ہے، سبیل ہے، طریق ہے، اور اسوہ ہے، اور یہی وہ مفہوم ہے، جس کے لئے امام مالک نے موطا کا لفظ ایجاد کیا، اور اپنے مجموعہ روایات کا نام رکھا، موطا کے لفظی معنی پامال اور روندے کے ہیں یعنی وہ پامال اور روندا ہوا راستہ جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ گذرے، یہی راستہ علی الاسلام کا ہے، اور وہی قرآن کی صحیح عملی تفسیر ہے،

کتاب وسنت احادیث میں اکثر کتاب وسنت کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے خصوصاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبوں میں ہے، کہ "میں تمہارے درمیان دو چیزیں

چھوڑ جاتا ہوں، کتاب اللہ اور اپنی سُنّت" اس حدیث کی تشریح میں سُنّت سے مقصود سر لفظی
روایت اور عن عن کی حدیث نہیں ہے، بلکہ آپ کا عمل متواتر اور موطا طریق ہے، جو قرآن پاک
کی صحیح تفسیر و تشریح ہے،

سنّت اور بدعت

آپ نے دیکھا کہ سُنّت کی حقیقت کیا ہے، اور احادیث میں جس سُنّت کے
اتباع کی بار بار تاکید آئی ہے، وہ کیا چیز ہے اور "علیکم بسنتی" میرا طریقہ اختیار کرو بعض امور کے
متعلق من سُنتی میرا طریقہ کہنا بعض چیزوں کے متعلق اصبت السّنۃ تم نے سُنّت کو پالیا
کہنے کا کیا مفہوم ہے،

اسی سُنّت کا مقابل بدعت ہے، جس کے معنی نئی بات کے ہیں، اور ہمیشہ سنّت
اور بدعت یہ دونوں لفظ مقابل اور ضدین کی حیثیت سے بولے جاتے ہیں، کیونکہ سنت کے معنی
ہیں وہ طریق جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا، اور بدعت کے معنی ہیں اس کو چھوڑ کر اور
اس سے الگ ہو کر اپنے لئے کوئی نئی راہ عمل اختیار کرنا، اسی لئے پہلی چیز ہدایت اور دوسری ضلالت ہے

کیا سنت عبرانی لفظ ہے؟

اردو کے اسی سابق الذکر رسالہ میں اسی سابق الذکر مضمون نگار
نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سُنّت کا لفظ عبرانی "مناۃ" سے نکلا ہے، یہودیوں نے توراۃ کو چھوڑ کر
اسی قسم کے مجموعۂ روایات کو اپنا ماخذ بنالیا تھا جس کو وہ مناۃ کہتے تھے، اسی طرح مسلمانوں
نے کتاب اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کو اپنا ماخذ بنایا ہے، اس کا نام بھی اسی لفظ مناۃ سے لیکر
سنت بنالیا ہے،

افسوس ہے کہ یہ تحقیق انیق ہر قسم کے اندرونی و بیرونی، اسلامی و افرنگی، عربی و عبرانی
تحقیقات کی ٹکسال سے باہر ہے، اور ایسا دعویٰ کرنا اہل علم کی نگاہوں میں اپنی حقیقت کو عریاں
پیش کرنا ہے،

عبرانی لفظ مناۃ "س" سے نہیں ہے، بلکہ "ث" سے ہے، یعنی ثناۃ جو عربی میں ثنی اور ثنین اور تثنیہ کی صورت میں ہے، اس کے لفظی معنی دو کے ہیں، اور یا مکرر اور دوہرائے ہوئے کے ہیں، "ثناۃ" تورات کی پانچویں کتاب کا نام ہے، جس کو آج کل عربی میں "تثنیہ" کہتے ہیں، اور غلطی سے اس کا ترجمہ استثناء کر دیا گیا ہے، انگریزی میں اس کا ترجمہ ڈیوٹرونومی (Deutranomi) ہے، جس کے لفظی معنی وہی ثنی اور مکرر کے ہیں، توراۃ کے وہ وہ قوانین جو پچھلی کتابوں میں مذکور تھے، اس کتاب میں اُن کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ مرتب اور مدون کرکے پیش کیا گیا ہے، اس لئے اس کا نام ثناۃ تثنیہ، یا ثنی اور مکرر کہا گیا، خود قرآن پاک نے اپنے اوپر ثناۃ کی جمع مثانی کا اطلاق متعدد آیتوں میں کیا ہے، غور کیجئے کہ اس ثناۃ کے لفظ کو سُنّت سے کیا تعلق ہے، ثناۃ کوئی ایسا لفظ نہیں، جو علمائے سلف اور لغویین عرب کو معلوم نہ ہو، لسان العرب صحاح جوہری، مجمع البحار لغتی سب میں یہ لفظ ثنی کے تحت میں مذکور ہے، اور اس کے معنی لکھے ہیں، اور اس پر تھوڑی سی بحث کی ہے، سُنّت خا[illegible]بی زبان کا لفظ ہے، اس کے لفظی معنی رستے کے ہیں، لیکن بول چال میں اس کے معنی، اس طریقۂ عمل کے ہیں، جس پر ہمیشہ کوئی عمل جاری رہے، قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہے،

قد مضت سنة الاولین،	گذشتہ قوموں کا طریق عمل گذر چکا،
(انفال)	
الا ان تاتیهم سنة الاولین	لیکن یہ کہ گذشتہ قوموں کا طریق عمل اُن کے ساتھ برتا جائے،
(کہف)	
قد ارسلنا	اُن لوگوں کا طریقہ عمل جن کو ہم نے

قبلک ، — تم سے پہلے رسول بنایا،

(اسرائیل)

سنۃ اللہ کا لفظ قرآن مجید میں اس معنی میں کئی دفعہ آیا ہے،

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلاً ، — خدا کے طریقِ عمل میں تم تبدیلی نہ پاؤگے،

(احزاب و فتح)

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَحْوِیْلاً — خدا کے طریقِ عمل میں تم تغیر نہ پاؤگے،

(ملائکہ)

کیا اس سے بھی زیادہ ہم کو اپنی شہادت کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت ہے.

سنت اور بدعت کا معیار

مسلمانوں میں اختلاف کا آغاز قرنِ اول ہی سے ہو گیا تھا، لیکن غور سے دیکھئے کہ یہ اختلاف زیادہ تر نظریات و آراء کا تھا، جن کو عمل سے تعلق نہ تھا کیونکہ غیر مادی یعنی غیر محسوس امور کے متعلق کوئی محسوس و مادی عملی شہادت پیش نہیں کی جاسکتی تھی، مثلاً یہ کہ خلافت مسلمانوں کے مشورہ سے ہے، یا نصِ الٰہی سے ہے، یہ شیعہ اور اور اہلِ سُنت کے درمیان سب سے اہم بحث ہے، یا یہ کہ قیامت میں دیدارِ الٰہی ان ظاہری آنکھوں سے ہوگا، یا نہیں؟ یہ ایک معرکۃ الآراء اختلافی بحث معتزلہ اور اشاعرہ و ماتریدیہ کے درمیان میں ہے، لیکن یہ تمام اختلافات نظریاتی حیثیت رکھتے ہیں، ان مسائل میں جن کی حیثیت عملی، مادی اور محسوس تھی، مسلمانوں میں کوئی بڑا اختلاف کبھی پیدا نہیں ہوا، اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر عملی سنت سب کے پیشِ نظر تھی اور یہ اسلام کا سب سے بڑا امتیاز تھا، رفعِ یدین، آمین بالجہر، وضعِ ید علی الصدر، قرأت

فاتحہ خلف الامام کی بحثیں اگر فریقین کا غلو اور تعصب علٰحدہ کر دیا جائے تو یہ صرف افضلیت کی بحث رہ جاتی ہے جو زیادہ اہم نہیں،

یہ ہر مذہب کا اصول کلی ہے، خصوصاً اسلام کا اور فطرۃً ایسا ہی ہونا بھی چاہئے، کہ ہر مذہب کا بہترین عہد اور دور وہ ہوتا ہے، جو خود صاحب مذہب کا مبارک زمانہ ہوتا ہے، اس کے بعد اس کے جانشینوں اور صحبت یافتوں کا، پھر رفتہ رفتہ اس میں ضعف ہوتا جاتا ہے، اور اس کے مذہب کا قوام بگڑتا جاتا ہے، اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ اصل مذہب نہیں، بلکہ وہ ہے، قرآن کا یہ حکم نہیں، بلکہ وہ ہے تو اس کا فرض ہے، کہ رسول کے مبارک عہد میں جو طرز عمل اس کو نظر آتا ہے، اس کو اصل مذہب کا معیار قرار دے، اور جو چیز اس عہد میں نظر نہیں آتی، اور بعد کو وہ شامل ہو جاتی ہے، اس کو مذہب سے خارج یعنی بدعت قرار دے، اس اصول کی بنا پر جو بالکل واضح ہے، ہر اس شخص کا جو اسلام کے اصلی پیکر کی جلوہ آرائی کا مدعی ہے، اور قرآن کی صحیح تعلیم کو آج دنیا میں پیش کرنا چاہتا ہے، یہ فرض ہے کہ وہ اس اصلیت اور اس صحیح تعلیم کے خط و خال اس عہد مبارک کی عملی زندگی میں دکھائے، اور یہ بتائے کہ آج جو غلطیاں اس کو نظر آتی ہیں، وہ اس وقت نہ تھیں، بلکہ بعد کو اسلام میں داخل ہو گئی ہیں، مثلاً یہ بتائے کہ اس عہد مبارک میں صرف دو وقت یا تین وقت کی نماز تھی، بعد کو جب بخاری و مسلم و ابو داؤد مرتب ہو گیا، تو مسلمانوں میں پانچ وقتوں کی نماز کا رواج ہوا، پہلے اس طرح نماز پڑھی جاتی تھی، بعد کو اس میں فقہاء اور محدثین نے یہ اضافہ کر دیا، اگر یہ ثابت نہیں ہو سکتا، اور یقیناً ثابت نہیں ہو سکتا، تو یہی ماننا پڑے گا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(نعوذُ باللہ) اپنے زمانہ میں اپنی وحی کے سمجھنے میں غلطی کی، اور اب اُس کو ہندوستان کے عجمی اپنی معمولی صرفی و نحوی لیاقت سے درست کر رہے ہیں، کیا کوئی مسلمان بلکہ انسان بھی ایسا احمقانہ دعویٰ کر سکتا ہے؟

(معارف اگست ۱۹۲۹ء)

پھر بحث سنت

کچھ اور اختراعات و الزامات

(۱)

دوستوں کو یاد ہوگا کہ اگست ۲۹ء کے معارف میں ایک صاحب[1] کے جواب میں "سنت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا گیا تھا جس میں مدعی مذکور کے اس خیال کی تردید کی گئی تھی، کہ سنت اور زبانی روایات یا حدیث ایک چیز ہیں، اور اس کے اس اختراع کی غلطی ظاہر کی گئی تھی، کہ مسلمانوں کا لفظ "سنت" یہودیوں کے لفظ "مسناہ" سے ماخوذ ہے، جو یہودیوں کے اُن زبانی روایات کے مجموعہ کا نام ہے، جو سنہ عیسوی سے پس و پیش زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تقریباً ڈیڑھ ہزار برس بعد مُرتب ہوا تھا۔

اسی مضمون سنت کے چھپنے کے بعد مدعی مذکور نے پہلے خط و کتابت کے ذریعہ سے سوال و جواب کیا، اور اس کے بعد ایک طویل مضمون اپنے مدعا کے اثبات اور میری تردید میں چھپوایا، جہاں تک اصل مسئلہ کا تعلق ہے، اس کے جواب میں انشاء اللہ

---

[1] نیاز فتحپوری۔

کوتاہی نہ ہوگی لیکن موصوف کے مضمون کے لب ولہجہ اور طرز و انداز کے جواب کی توقع کم از کم معارف میں نہ رکھنی چاہیے،

مجھے یہ ظاہر کرنے میں خوشی ہے کہ معارف کے اس مضمونِ سنت کو اللہ تعالیٰ نے توقع سے زیادہ کامیابی بخشی، موافقین کے علاوہ بعض مذہب دوستوں کے شکوک بھی اس سے دور ہوئے،

مگر افسوس ہے کہ اصل مخاطب کو اس سے تشفی نہیں ہوئی، بلکہ اپنی غلطی یا غلط فہمی پر اُن کا اصرار اور بڑھ گیا، موصوف کو میرے انگریزی نہ جاننے پر تاسف ہے، یہ تاسف مجھے خود بھی ہے، مگر اُن کی تسلی کے لئے بطور اظہار واقعہ یہ امر ان پر ظاہر کر دینا ہے کہ اُن کی آرزو کے مطابق میں کم از کم اتنی انگریزی جانتا ہوں کہ انسائیکلوپیڈیا کے تاریخی و مذہبی مضامین پڑھ اور سمجھ سکوں، انھیں اس کا اطمینان رکھنا چاہئے، اور یہ بات اُن کو میری اس تصنیف (ارض القرآن) کو پڑھ کر سمجھ لینی چاہئے تھی جس کی ابھی انہوں نے اپنے والا نامہ مورخہ ۱۰ر فروری سنہ ۱۹۳۰ء میں تعریف و توصیف کی ہے، اور اپنے مضامین میں اس سے سرقہ کا "بخلوص" اعتراف بجا کیا ہے، اور ناظرین بھی میرے مضامین "قرآن مجید و آثار قدیمہ" اسلامک ریویو اور اشاعت اسلام میں دیکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں،

مضمون زیر بحث میں دو قسم کی بحثیں ہیں، ایک لفظی اور دوسری معنوی، ان دونوں بحثوں کو علیحدہ کر دینا ہے، تاکہ مسئلہ صاف ہو جائے،

مسنات اور سُنّت

لفظی بحث یہ ہے کہ ہمارے دوست کا دعویٰ ہے کہ یہود اپنی زبانی روایات کو "مسناۃ" اور مسلمان اپنی زبانی روایات کو "سنت" کہتے ہیں، مسلمانوں کا یہ عربی

لفظ "سنت" یہودیوں کے عبرانی لفظ "سناۃ" سے ماخوذ ہے، دونوں بالکل ایک لفظ ہیں، اور ہم معنی ہیں،

میں نے اگست ۱۹۲۹ء کے معارف میں مدعی کی اس تحقیق سے اختلاف کیا، اور ثابت کیا کہ اولاً عبرانی لفظ "سناۃ" "س" سے نہیں بلکہ "ث" سے ہے، یعنی "ثناۃ" اور دوم اس کے معنی عبرانی میں دوسرے، دوہرانے اور اعادہ و تکرار کے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ اس کا اطلاق موسیٰ کی پانچویں کتاب پر ہوتا ہے، جس کو یونانی ڈیٹرونومی کہتے ہیں، جس کے معنی دوسرے اور دوسرے قانون کے ہیں، اور عبرانی میں اس کو مشنا کہا جاتا ہے، اور عربی میں ثناۃ کہتے ہیں، اور آج کل تثنیۃ الاشتراع (دوبارہ قانون سازی) کہتے ہیں، اور اس کا ماخذ عبرانی میں "شنا" اور عربی میں "ثنی" اور ان دونوں کے معنوں میں دونوں زبانوں میں دو، دوم اور دوہرانے کا مفہوم ہے، اور "سنت" خالص عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی راستہ اور طریق کے ہیں، اور اصطلاح میں اس کے معنی وہ طریقہ ہے، جس پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر قائم رہے، اس کے معنی زبانی روایات کے نہ لغوی میں نہ اصطلاحی، اس لئے عبرانی "مشناۃ" اور عربی سنت میں کوئی باہم مشارکت و مماثلت نہیں، اور نہ عربی سنت عبرانی مشناۃ سے ماخوذ ہے،

ہمارے مخاطب اول نے اس مضمون کو پڑھ کر ۵ دسمبر ۱۹۲۹ء کو مجھے خط لکھا کہ "تمہاری تحقیق غلط ہے، ڈوٹرونومی کے لئے مسنا (س) لفظ ہے، اور مشنا بالکل جداگانہ لفظ ہے، میں ایک سے زائد یہودی معلمین سے اس لفظ کی تحقیقات کر چکا ہوں، اور اس کی تائید انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا سے بھی مل سکے گی،

"اگر اس کے معنی آپ سنت سے علیحدہ دکھائیں تو میں ہار مان لوں"

میں نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا اُس کا مطلب یہ تھا، کہ مشنا تورات کی پانچویں کتاب پر بھی اطلاق کیا گیا ہے، اور تالمود کے ایک حصہ کا نام بھی ہے، یہ کوئی اہم نقطۂ اختلاف نہیں ہے، بلکہ اصل چیز "مشنا" کے معنی ہیں، ساتھ ہی میں نے اطلاع دی کہ "مشنا" کے معنی تعلیم اور سکھانے کے بھی ہیں، انھوں نے اس کے ماننے سے بھی انکار کیا، اور لکھا کہ تم کو تالمود کے معنی سے دھوکا ہوا ہے، جس کے معنی واقعاً تعلیم اور سکھانے کے ہیں، اب اس تازہ مضمون میں ہمارے دوست نے پھر اپنی پرانی تحقیق کو بہت فخر و ناز کے ساتھ دہرایا ہے، مگر صرف دہرایا ہی ہے، کوئی دلیل یا حوالہ نہیں درج فرمایا ہے،

اب نقطۂ اختلاف دو ہیں،

۱۔ کیا تورات کی پانچویں کتاب کو بھی عبرانی زبان میں مشنا بولتے ہیں،

۲۔ کیا سنت اور مشنا ایک ہیں،

مشنا توراۃ | تورات کی پانچویں کتاب کو میرے "مشنا" کہنے پر مُدعی نے مضحکہ اڑایا ہے، اور فرمایا ہے "کہ ایک یہودی بچہ بھی اس کو سُن کر ہنس دے گا" مگر میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ تحقیق کا راستہ مضحکہ سے بمراحل دور ہے، توراۃ کی پانچویں کتاب کا نام "قانون ثانی" اس لئے رکھا گیا ہے کہ قانون اوّل کے بعد دریائے اردن کے اس پار حضرت موسیٰؑ نے اس کو دوبارہ بیان کیا، جیسا کہ اس کتاب کے آغاز میں تحریر ہے، اس کا عبرانی نام "الوہی وبران" بھی ہے، مگر بعد کو شاید مصر کے ترجمۂ سبعینی کے وقت سے اس کا نام "مشنا توراۃ" مشہور ہو گیا، جس کے معنی "قانون دوم" کے ہیں، اسی لئے یونانی اور اس سے یورپ کی زبانوں میں اس کا نام "ڈیوٹرونومی" یعنی دوسرا قانون پڑا، اور اسی لئے پرانی

عربی میں "مثناۃ" اور نئی عربی میں اس کا نام تثنیۃ الاشتراع ہے یعنی "دوبارہ قانون بنانا"
بہرحال ان سب کے معنوں میں دو، دوم اور دہرانے کا مفہوم داخل ہے جس سے یہ مسئلہ
حل ہو جاتا ہے کہ توراۃ کی اس کتاب کے لئے جس مشنا کا لفظ بولا جاتا ہے، وہ "ش" سے ہے
"س" یا "ث" سے نہیں، جیسا کہ مدعی کا دعویٰ ہے، کیونکہ دو اور دوم کے لئے جو عبرانی مادہ ہے
وہ مشنا ہے۔

حوالوں کے لئے سب سے پہلے "ڈکشنری آف بائبل" (مرتبہ جیمس ہسٹنگز وغیرہ) جلد اول
ص ۵۹۶ مطبوعہ ۱۹۰۰ء ملاحظہ فرمایئے جس میں لکھا ہے کہ اس کا نام ڈیوٹرونومی عبرانی
الفاظ "مشنا توراۃ" کا ترجمہ ہے، جس کے معنی "نسخۂ ثانیہ" کے ہیں۔ اس کے بعد انگریزی
کی مشہور ڈکشنری ویبسٹرز انٹرنیشنل میں لفظ ڈیوٹرونومی (Deuteronomy)
دیکھئے اس میں ہے۔

"ڈیوٹرونومی اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ یہ موسیٰ کے قانون کا دہرانا (یا اعادہ) ہے"
اب عبرانی لغت میں دیکھ لیجئے کہ دہرانے اور دوسرے اور دوبارہ کرنے کیلئے لفظ مشنا ہے
مسنا یا ثنی یا ثنہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ہمارے محقق دوست ہم کو باور کرانا چاہتے ہیں، جیسا کہ آگے
بتفصیل معلوم ہوگا۔

میرے مضمون سنت کی اشاعت کے بعد موصوف نے ۵ دسمبر ۱۹۲۹ء کو جو خط مجھے
لکھا تھا اس میں تحریر فرماتے ہیں۔

"مثنہ جس کے معنی ڈیوٹرونومی کے سمجھے ہیں، وہ مشنا سے بالکل جدا
لفظ ہے اور اس کا تلفظ مسنا ہے"

اب موصوف اپنے تازہ مضمون میں ڈیوٹرونومی کے لئے ہم کو لفظ ثنی دیتے ہیں۔

ع کہئے یہ حکم رب کہئے وہ ارشاد رب

اگر آپ کے کہنے سے توراۃ بجم کے لئے مسنا صحیح مانا جائے تو تالمود کے لئے بھی تو آپنے مسنا اور مسناہ تو ہی تلفظ پہلے مضمون میں لکھا ہے، اب یہ التباس کیونکر دور ہوگا،

آپ میرے قول کی تکذیب کے لئے توراۃ بجم اور حصۂ تالمود دونوں کے درمیان فرق مسنا اور مشنا یا مثنہ یا مثنی کہکر لاکھ پیدا کیجئے سب محکہ تحقیق کے سامنے رد ہو جائے گا، دونوں لفظ قرشت والی شین منقوطہ سے ہیں، اس غیر منقوطہ یا ش منقوطہ سے ان میں کوئی لفظ نہیں بنتا اور ث کا حرف تو عبرانی میں سرے سے موجود ہی نہیں، اس لئے مثنہ یا مثنی تو عبرانی میں ہو ہی نہیں ہوسکتا،

اب ہمارے دوست غور فرمائیں کہ کس کی تحقیق پر "ایک یہودی بچہ بھی ہنس دیگا"

درسفالیں کاسۂ رنداں بخواری منگرید

کایں حریفاں خدمت جام جہاں بیا کردہ اند

مشنا، مسنا اور سنت | بہرحال یہ مسئلہ کہ مشنا تالمود مراد ہے، یا مشنا توراۃ ایک ضمنی بحث ہی، اصل سوال یہ ہے کہ کیا عبرانی "مسناہ" اور عربی سنت ایک چیز ہے،

اس سلسلہ میں ہم اپنے محقق دوست کی ایک دلچسپ لفظی تحریف کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں، اصل عبرانی لفظ مشنا (ش منقوطہ) ہے، جیساکہ میرے ٹوکنے پر اب اس دوسرے مضمون میں انھوں نے استعمال کیا ہے، مگر پہلے مضمون میں اس کا عبرانی تلفظ "مسناہ" بتایا تھا اور یہ اس غرض سے تاکہ سنت اور مسناہ میں س "ن" اور "ۃ" کا اشتراک ہو جائے، اور یہ دعویٰ بآسانی ثابت ہو جائے کہ سنت اور مسناہ ایک ہیں، اور اب جب انھیں معلوم ہوا کہ عبرانی کا حرف شناس "ن" کے سوا کوئی اور بھی ہے۔ تو مجبوراً اس کے لئے دوسرے

مضمون میں (مشناس) منقوطہ سے بولے یا للعجب!

میں نے اپنے سنت والے مضمون میں یہ دکھایا تھا، اور پھر باعلان دعویٰ کرتا ہوں کہ سُنت اور مشنا میں کوئی لفظی یا معنوی مناسبت نہیں ہے، مشنا کے معنی اگر بقول اُن کے زبانی روایات کے ہیں، تو سُنّت کے معنی عربی میں طریق و روش اور راستے کے ہیں، قرآن میں سُنّت کا لفظ انہی معنوں میں بار بار آیا ہے، احادیث میں انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے، اور لغت اور اشعار عرب میں بھی ان ہی معنوں میں یہ لفظ بولا گیا ہے، قرآن پاک میں ہی لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللہِ تَحْوِيلًا، کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ تم خدا کی "زبانی روایتوں" میں ہرگز تبدیلی نہ پاؤ گے، یا یہ معنی ہیں کہ تم خدا کے طریق اور طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے؟

احادیث میں ہے من سن سُنّۃً حسنۃ فلہٗ اجرھا۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی اچھی "زبانی روایت" کرے گا تو اس کو اس قسم کی نیکیاں ملیں گی؛ یا یہ معنی ہیں کہ جو شخص کوئی اچھا اور پسندیدہ راستہ یا طریقہ نکالے گا تو اس کو بھی اُس کی نیکیاں ملتی رہیں گی؛

مشہور حدیث ہے النِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي، کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ نکاح میری زبانی روایت ہے، یا یہ معنی ہیں کہ نکاح میرا طریقہ ہے، اشعار عرب میں ہے:-

وَانَّ الالٰى بالطف من آل هاشم تاسوا فسنوا للكرام التاسيا

(آل ہاشم جو طف میں ہیں، انھوں نے باہم غمخواری کی، تو غم خواری کو شریفوں کا طریقہ بنا دیا)

"سنوا" کے معنی یہاں عملی طریق و روش و طرز عمل کے ہیں، یا زبانی روایت کے، زبانی روایت کے معنی جو کبھی سکتے ہیں، بن بھی سکتے ہیں،؟

یہ تو عربی زبان کی تحقیق ہوئی، اب آئیے عبرانی زبان کی خانہ تلاشی لی جائے "مشنا" کے معنی "زبانی روایات" کے ہیں؟ اس بارہ میں میں نے پہلے جو لکھا تھا، اس کو دہرا دیتا ہوں کہ یہ وہی لفظ ہے جو عربی میں ثنی، تثنیہ، ثمنی وغیرہ کی صورت میں ہے، اور اس کے معنی دہرانے، دوبارہ کرنے، اور دوہرا ہونے کے ہیں، مضمون نگار کا دعویٰ ہے کہ اُس کے معنی "زبانی روایات" کے ہیں، میں سوا اس کے اور کیا کہوں،

میاذئی ولا تو نخچیر مکن ہر سے کہ نخو ... تو تغنیر مکن

ان کی تشفی کے لئے اُن کے حسب مشورہ میں سب سے پہلے یورپ کے علمی صحیفہ کو پیش کرتا ہوں جس پر، اُن کا ایمان شاید تمام دوسرے مشرقی صحیفوں سے زیادہ ہو، انسائکلوپیڈیا طبع یازدہم کے مضمون تالمود کے شروع میں (جلد ۲۶، صفحہ ۳۸۰) ہے:

"تالمود (عبرانی میں: سیکھنا سکھانا) مشتمل ہے، مشنا پر (عبرانی میں (زبانی) دہرانا (Repetition)

پھر اسی کتاب کے اسی اڈیشن (یازدہم) کی جلد ۱۳ صفحہ ۱۰۷، مضمون ہبرو (عبرانی) کے ضمن میں ہے،

"مشنا کا نام عبرانی لفظ "شنا" سے مشتق ہے، جو آرامی لفظ "تنا" سے مطابق ہے اور اسی لئے یہ تناک کتاب کے لئے موزوں ہے، جس کے معنی زبانی قانون کے دہرانے یا سکھانے کے ہیں"

ان دونوں اقتباسوں سے ظاہر ہے کہ اُس کے اصلی معنی دہرانے یا سکھانے کے ہیں، لفظ زبانی یا زبانی قانون کا اضافہ، اگر کسی نے کر دیا ہے، تو وہ لغت کی حیثیت سے نہیں، بلکہ صرف وجہ تسمیہ کی مناسبت دکھانے کے لئے خارج سے اضافہ کر دیا گیا ہے، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ نام

اس کا کیوں پڑا، اس کی تائید کے لئے میں لغات عبرانی کا حوالہ پیش کرتا ہوں،

شناوشنہ	بدل جانا، جدا ہونا، دوبارہ کرنا، دہرانا،
شنیم	دو،
شنتیم	دوبارہ
مشنہ	دوسرا درجہ، دوسرے درجہ کا، دوچند،
مشنا	دوسرا

(لغات عبرانی مصنفہ پادری ولیم ہوپر، پرنسپل، ڈوِنٹی، کالج، شائع کردہ پنجاب رلجیس سوسائٹی الہ آباد ۱۸۸۲ء ص ۲۲) شنہ کے معنی بھی عبرانی میں دوبارہ کرنا، دوسرا اور پھیرکے ہیں، یہی الفاظ عربی میں اثنین، اثنین، ثمنتین، ثمنۃ، تثنیہ، ثنی، مثنیٰ، اور شنی ہے، پہلے تمام الفاظ کے معنی دو اور دوسری کے ہیں، اور اخیر لفظ کے معنی پھیرنے کے ہیں،

مشنا اور اس کے مصدر شنا کے بھی تمام معنی عبرانی، انگریزی ڈکشنری، شائع کردہ سموال باگسٹر (لندن) ص ۲۷۲، و ۳۰۳، میں ہیں، تحقیق کے لئے کتاب مذکور کی طرف رجوع کیجئے،

انگریزی کی مشہور ڈکشنری ویبسٹر نیو انٹرنیشنل ڈکشنری ہے، اس میں "مشنا" ... کی نسبت حسب ذیل تحقیق ہے،

"مشنا (عبرانی مشناہ) یعنی تعلیم، زبانی قانون، عبرانی لفظ شنہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی دہرانے (ری پیٹ) کے ہیں، قدیم ہیلنک عبرانی میں اس کے معنی، سیکھنے سکھانے کے ہیں، یہ یہودیوں کے روایتی تعلیمات کو کہتے ہیں، جو ربیوں کے زیر نظر خاص طور سے تیسری صدی عیسوی میں مرتب ہوئیں، تالمود کے ایک حصہ کا نام ہے، جس میں

اُس کی بنیاد ہے"

صاف ظاہر ہے کہ "زبانی روایات" اس کے لغوی معنی نہیں، اُس کے لغوی معنی دہرانے اور اعادہ کرنے اور دوبارہ کرنے اور دوسرے درجہ کے ہیں، اس کا اطلاق یہود اپنی زبانی روایات کی کتاب پر اس لئے کرتے ہیں، کہ وہ گذشتہ قانون کا اعادہ ہے، یا پہلے قانون پر نظر ثانی ہے، یا توراۃ کے مکتوبی قانون کے بعد یہ زبانی روایات کی کتاب دوسرے درجہ پر ہے، یا قدیم عبرانی کے مطابق اُس کے معنی سیکھنے، یا سکھانے کے لے کر، اس کی کوئی مناسب وجہ تسمیہ بنائی جائے۔

ثناۃ | اب میرا کہنا وہی ہے، جو پہلے کہا جا چکا ہے کہ جس کو عبرانی میں مشنا یا مشناۃ کہتے ہیں، وہی عربی تلفظ میں ثناۃ ہے جس کے معنی دو یا دوہرانے کے ہیں، اور ساتھ ہی یہ بھی عرض ہے کہ عبرانی مشنا جس کا ثانی قانونی کتاب پر اطلاق ہوا ہے، اس کے لئے بھی عربی لفظ "ثناۃ" ہے، اور اُس کی جمع "مثانی" ہے، اور خود قرآن پاک نے اس کا کئی مقام پر اپنے اوپر اطلاق کیا ہے،

۱- ولقد اٰتینٰک سبعًا من المثانی	اور ہم نے اے پیغمبر! تم کو "مثانی" میں سے سات دیئے؛
۲- نزل احسن الحدیث کتابا متشابهًا مثانی۔	اس خدا نے اتارا بہترین کلام ایک کتاب جو باہم موافق اور مثانی ہے۔

ثناۃ کے معنی کتاب کے بھی عربی میں موجود ہیں؛ نیز مشناۃ المود کے بیان میں لفظ عربی میں مستعمل ہے، لسان العرب لفظ ثنی کے تحت میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کی ایک روایت کی شرح میں ہے،

قیل وما المثناۃ قال ما استکتب	پوچھا گیا کہ ثناۃ کیا ہے کہا جو خدا کی

مِنْ غیرِ کتابِ اللہ کأنہ جُعِل
ما استکتبَ مِن کتابِ اللہ مبدأ
وهذا اثنی، قال ابو عبید کان
سألت رجلاً مِن اهل العلم
بالکتاب الأول قد عرفها و
قرأها عن المثناة فقال ان
الأحبار والرُّهبان من بنی
اسرائیل من بعد موسیٰ وضعوا
کتاباً فیما بینهم علیٰ ما ارادوا
من غیر کتاب اللہ فهو المثناة

کتاب کے سوا لکھا گیا، گویا خدا کی جو
کتاب لکھی گئی، وہ پہلی تھی، اور یہ
دوسری ہے، ابو عبیدہ نے کہا کہ میں
نے توراۃ کے ایک عالم سے جو مثناۃ
سے واقف تھا، اور اس کو پڑھ چکا
تھا پوچھا کہ مثناۃ کیا ہے؟ اس نے جواب
دیا کہ یہودی عالموں اور درویشوں
نے حضرت موسیٰ کے بعد اپنے حسب
خواہش خدا کی کتاب کے سوا ایک اور
کتاب بنالی تھی، وہی مثناۃ ہے،

کیا عبرانی مشناۃ بعینہٖ یہی عربی مثناۃ نہیں ہے، اب بھی شک کی گنجائش ہے،؟

خلاصہ

بہرحال اس سخت گیری کی پالیسی سے ہم اپنے حریف کو دق کرنا نہیں چاہتے، بلکہ یہ عرض کرتے ہیں کہ خواہ آپ توراۃ کی پانچویں کتاب مراد لیجئے، یا تالمود کی کتاب، دونوں کا اصل عبرانی لفظ مشنا اور مشنہ ہے، جس کے معنی بدلنے، دہرانے یا دوسرا ہونے، یا دوبارا لکھے گئے، یا سکھائے گئے ہیں، اور سوا اس اخیر معنی کے الفاظ ثنہ، ثُنی، تثنیہ اور ثُمنی اس کے مرادف ہیں، اور عربی لفظ سُنّت کہ جس کے لغوی معنی راستہ اور طریق کے اور اصطلاحی معنی طریق محمدی کے ہیں، اس سے ادنیٰ سا بھی تعلق نہیں، سُنّت کا مادہ س، ن، ن یعنی سُنن ہے، اور مثنا یا مثناۃ کا عبرانی میں ش، ن، ہ، یا الف اور عربی میں ث، ن، ی ہے، اس تفصیل کے بعد امید ہے کہ ہمارے دوست اپنی تحقیق پر مزید نظر ثانی فرما کر علم اور اسلام دونوں کو

اپنا ممنون احسان بنائیں گے، ورنہ ان کی اس تحقیق کو بقول اُن کے ایک یہودی بچہ بھی سُن کر ہنس دے گا۔"

آخر میں ایک اور بات عرض کر دوں کہ "مشنا" زبانی روایات کو بھی نہیں کہتے، بلکہ اس کتاب کا نام ہے جس میں یہود نے اپنی زبانی روایات کو جمع کیا ہے، اگر گلستان اخلاقی قصص وحکایات کے کسی مجموعہ کا نام ہے تو اُس کے یہ معنی نہیں کہ گلستان کے معنی: اخلاقی قصص حکایات کے ہیں۔

دوران تحقیق میں فرماتے ہیں کہ

"مولانا کی یہ دلیل اور بھی پُرلطف ہو کہ سُنّت کا لفظ قرآن میں ہے؛ اس لئے یہ عبرانی زبان سے ماخوذ نہیں"

میں نے اگر ایسا کہا ہو تو یہ یقیناً غلط لیکن

ع سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

میں نے خدمتِ والا میں یہ عرض کیا تھا کہ

"سُنّت خالص عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے لفظی معنی راستہ کے ہیں لیکن بول چال میں اس کے معنی طریقۂ عمل کے ہیں، جس پر ہمیشہ کوئی عمل جاری رہے قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں مستعمل ہے۔"

ہر صاحب بصیرت میرے استدلال کو سمجھ سکتا ہے، کہ عبرانی لفظ مشناہ (ش) عربی میں ثناۃ (ث) ہے، اور جس کے معنی دونوں زبانوں میں دوہرانے یا اعادہ کے ہیں، اور اس سے الگ سُنّت کا لفظ ہے، جس کے معنی راستہ اور طریق کار کے ہیں، اور عربی میں یہ دونوں لفظ الگ الگ مستقل صورتوں میں وارد ہیں، اور خود قرآن پاک میں ہیں۔

وَلَقَدْ آتَیْنَاکَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِی — ہم نے تم کو "مثانی" میں سے سات دیں۔

مثانی جمع ہے، واحد کی صورت وہی مثناۃ ہے۔ اور سنت الگ ہے،

سُنَّۃَ الْاَوَّلِیْنَ، — پہلوں کا راستہ یا طریقہ یا سُنّت

اگر مثناۃ اور سُنّت ایک لفظ ہوتے تو عربی میں مثناۃ اور سُنّت دو لفظ موجود نہ ہوتے، اور قرآن ان کو دو لفظ دو تلفظوں کے ساتھ دو معنوں میں استعمال کرتا، اس سے معلوم ہوا کہ مثناۃ اور سُنّت دو الگ الگ مستقل اور مختلف المعنی لفظ ہیں۔ یہ ہے میرا استدلال جس کی آپ نے غلط تعبیر کی، میرے گذشتہ مضمون پر ایک نظر ڈالنے سے مضمون نگار کی غلط فہمی واضح ہو سکتی ہے۔

معارف جولائی ۱۹۳۰ء

عرب و امریکہ

عام طور سے مشہور ہے کہ امریکہ کو کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں دریافت کیا ہے۔ یہ شہرت اس لحاظ سے تو صحیح ہے کہ عام متمدن پرانی دنیا کو اس نئی دنیا سے پوری واقفیت اسی وقت سے ہوئی اور اسی کے بعد سے دونوں میں میل جول اور ہر قسم کے علمی و تمدنی و تجارتی تعلقات قائم ہوئے، یہانتک کہ آج نئی اور پرانی دنیا ایک گھر کے دو آنگن بن گئے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں کہ کولمبس سے پہلے اس نئی دنیا میں پرانی دنیا کی کسی نو وارد قوم یا اشخاص کے قدم نہیں پہونچے،

یہ مسئلہ کہ امریکہ تک کبھی عرب جہازراں پہنچ چکے تھے، گو ہندوستان میں نیا ہو، مگر مصر کے بعض ممتاز فاضلوں نے اس پر متعدد اوقات میں بحثیں کی ہیں، علامہ زکی پاشا نے سسلی کے عرب جغرافیہ نویس ادریسی المتوفی سنہ ۵۶۰ھ کی نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق کا ایک حوالہ پیش کیا تھا، جس میں بحر ظلمات میں اندلس کے چند عرب نوجوان جہازرانوں کے جہاز چلانے کا ذکر ہے، مگر ابھی تک نہ تو مصر میں اور نہ ہندوستان میں اس مسئلہ کے تمام اطراف پر بحث کی گئی ہے۔ اور نہ تمام ممکن مواد یکجا فراہم کیا گیا ہے،

اس سلسلہ میں حسب ذیل باتیں تنقیح کے قابل ہیں،

۱۔ کیا عربوں نے اور زیادہ عام لفظوں میں کیا مسلمانوں نے ربع مسکون کے پرانے

نظریہ کی تنقید کی تھی،

۲ - کیا ان کو زمین کی گولائی، اور اس کے تحتانی اور فوقانی حصّوں کا علم تھا؟

۳ - کیا ماوراے بحرِ ظلمات انھوں نے پہونچنے کی کوشش کی؟

۴ - کیا آج کل کے نئے محققین اس نظریہ کو قبول کر سکتے ہیں؟

ذیل کی سطروں میں ان میں سے ہر ایک مسئلہ پر اپنی تلاش و فکر کے نتیجے پیش کرتا ہوں،

ربع مسکوں: بطلیموس نے دو خطوں کے تقاطع سے روے زمین کے چار برابر حصّے کئے تھے، ایک خط قطب جنوبی سے قطب شمالی تک فرض کیا تھا، اور دوسرا زمین کے بیچ سے آفتاب کے بالمقابل پہلے خط کو کاٹتا ہوا (اس کو خط استوار کہتے ہیں) وسط افریقہ سے گذرتا ہے، اس طرح دو خطوں کے تقاطع سے زمین کے چار فرضی حصّے ہوئے، دو شمالی اور دو جنوبی، اور خط استوا ان دونوں شمالی اور ان دونوں جنوبی حصّوں کے بیچ سے گذرتا ہے، بطلیموس کی رائے یہ ہے کہ انسانی آبادی روے زمین کے ان چار حصّوں میں سے صرف ایک شمالی حصّے میں ہے۔ اسی کو اصطلاح میں ربع مسکوں کہتے ہیں یعنی چوتھائی حصّہ (رُبع) جو آباد ہے، (مسکون) باقی تین چوتھائی حصّے زیادہ تر سمندروں میں غرق ہیں، اور کچھ گرمی اور سردی کی غیر معتدل شدّت کے سبب سے سکونت کے قابل نہیں،

مسلمانوں نے شروع میں بطلیموس کے اس نظریہ کو بعینہٖ تسلیم کیا لیکن بہت جلد وہ اس پر شکوک و اعتراضات وارد کرنے لگے بطلیموس کے حامیوں نے اس کی رائے کی صحت پر فلسفیانہ اور طبعی دلائل گڑھ گڑھ کر جمع کئے، مگر دوسروں نے اُن کو توڑ دیا، اور ایک مدت تک یہ مناظرہ گرم رہا، بیرونی، ابن رشد، طوسی، قطب شیرازی، شریف جرجانی، برجندی، قوشجی اور جغمینی کی تصنیفات میں زمین کی ہیئت کے باب میں یہ بحثیں مذکور ہیں، یہاں مثال کیلئے

نصیر طوسی المتوفی سنہ ۶۷۲ھ کے تذکرہ اور اس کی شرح توضیح التذکرہ مؤلفہ نظام عرج (تالیف سنہ ۷۱۱ھ) اور اس کے حاشیہ سے کچھ عبارتیں نقل کرتا ہوں۔

وهذا التقسيم غير صحيح	یہ تقسیم صحیح نہیں، غلط ہے، اس لئے کہ
فاسد، ايضاً لانا ما دامنا لهم	اُن کے دعوی کے ثبوت میں کوئی شبہہ
في هذا المقدار من شبهة	بھی میں نے نہیں پایا، چہ جائے کہ کوئی
فضلاً من حجة يعني هذا	دلیل ان کے پاس ہو، اس بنا پر یہ
يحتمل ان يكون في الارباع	بالکل ممکن ہے، کہ زمین کی باقی چوتھائی میں
الباقية عمارات كثيرة	میں بہت سی آبادیاں ہوں جن کی خبر
لم يصل الينا خبرهم لما	ہم تک اس لئے نہیں پہونچی کہ ہمارے
بيننا وبينهم من البحار المغرقة	اور ان کے درمیان جدا کر دینے والے
والجبال الشاهقة، (نسخہ قلمی دارالمصنفین)	سمندر اور بڑے بڑے پہاڑ ہیں،

اسی طرح جنوبی حصہ میں آفتاب کی شدتِ گرمی کے سبب سے عدم آبادی کا جو بڑا نظریہ تھا، اس پر بھی ضرب کاری لگائی، اور کہا۔

لجواز ان يكون مسكوناً	اس امکان کے سبب سے کہ وہ بھی آباد
ولا يصل الينا خبرهم للبحار	ہوں، اور ہم تک اُن کی خبر اس لئے
العظيمة والجبال الشامخة (الشاهقة)	نہ پہونچی ہو، کہ بڑے بڑے دریا، اور
المانعتان من ان يصل	پہاڑ بیچ میں حائل ہوں، جو اُن کے
خبرهم،	حالات ہم تک پہونچنے سے مانع ہوں

(کتاب مذکور)

آخر میں اس نظریہ کی کہ صرف ربع مسکون ہی کیوں کھلا ہوا ہے، اعتراض اور جواب کے بعد بظاہر کوئی سنجیدہ دلیل نہ پا کر کہا،

وبالجملة ليس لانكشاف	حاصل یہ کہ زمین کے شمالی چوتھائی حصہ
هذا القدر المذكور من	کے صرف کھلے ہونے کا سوائے عنایت
الارض اى الربع المسكون	الٰہی کے کوئی سبب معلوم نہیں، اور
الشمالى سبب معلوم غير	نہ کوئی دلیل اس پر ہے کیوں ایک
العناية الالٰهية والا لما	ہی شمالی چوتھائی حصہ آبادی اور
فضل احد الربعين الشماليين	رہنے کے لائق ہوا اور دوسرا نہ ہوا
بها اى بالعمارة والسكنى دون	حالانکہ اُس کے سب حصوں کی وضع
الآخر مع تساوى ارتفاعهما	(پوزیشن) فلکیات کی نسبت سے
بالقياس الى السماويات.	برابر ہے،

(کتاب مذکور)

شارح نے اس عنایتِ الٰہی کے نظریہ کو بھی تسلیم نہیں کیا، اور کہا کہ ممکن ہے کہ عنایت نے دوسرے ربع شمالی میں بھی آبادی رکھی ہو،

لجواز ان يكون الربع الآخر	اس کا پورا امکان ہے کہ دوسرا چوتھائی
مسكونا معمورا ولم يصل	حصہ بھی معمور اور آباد ہو، اور وہاں کے
الينا خبرهم (کتاب مذکور)	رہنے والوں کا حال ہم کو معلوم نہ ہو،

اس بحث سے اندازہ ہوگا کہ اس پرانی دنیا کے علاوہ دوسری دنیا کا نظریہ مسلمانوں نے علمی استدلال کے طریقہ سے سمجھا تھا، اور یونانی نظریہ ربع مسکون کی کوئی طبعی اور فلسفیانہ

توجیہ اُن کی سمجھ میں نہیں آئی تھی نویں صدی ہجری کے وسط میں قاضی زادہ رومی نے محمود چغمینی المتوفی ۷۴۵ھ (۱۳۴۴ء) کی ملخص کی شرح جس کو اس نے رصدخانہ سمرقند کے بانی سلطان الغ بیگ کے نام سے لکھا ہے، کہا ہے:-

وسائر الارباع خراب ظاهراً	اور باقی تین چوتھائی زمین بظاہر
والا لوصل خبرهو الينا	غیر آباد ہے، کہ اگر غیر آباد نہ ہوتی تو
غالبا ويحتمل ان يكون بيننا	غالباً ان کا حال ہم تک پہنچتا
وبينهم بحار مفرقة وجبال	اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اور
شاهقة وبواد بعيدة تمنع	وہاں کے باشندوں کے درمیان بڑے
وصول الخبر الينا غير ان احد	سمندر، پہاڑ، اور دور دراز صحرا
اربعين الجنوبيين قد حكى فيه	ایسے ہوں جو ان کی خبر کو ہم تک
قليلا من العمارة،	پہنچنے نہ دیتے ہوں لیکن یہ بیان
(ص ۴۱ مطبوعہ ۱۳۱۲ھ لکھنؤ)	کیا گیا ہے کہ ایک جنوبی چوتھائی
	حصہ میں تھوڑی سی آبادی ہے،

اگر ایک تہا شمالی چوتھائی ہی آباد ہے، تو پھر یہ مسئلہ مشتبہ رہا کہ دو شمالی رُبعوں میں سے کون آباد ہے فوقانی یا تحتانی، تو چونکہ رُبع مسکون ہی کے مسئلہ کو مسلمان مشتبہ سمجھ گئے تھے، اس لئے وہ اُسکی سمت بتانے میں بھی پس و پیش کرتے تھے، اس لئے انھوں نے صحیح طور سے یہ کہا کہ نیچے اوپر کی بحث اس لئے فضول ہے کہ ہر ایک دوسرے کی نسبت سے نیچے اور اوپر ہے، تصریح کے شارح امام الدین لاہوری نے حاشیہ کی یہ عبارت نقل کی ہے،

ان فی تعیین هذا الربع تعسراً	اس چوتھائی زمین کی تعیین مشکل ہے،

بل تعذّر لان لو قیل هذا	بلکہ محال ہے کیونکہ اگر یہ کہا جائے
هُوَ الربع الفوقانی لصدق	کہ وہ فوقانی رُبع ہے، تو یہ
علی الآخر،	فوقانی ہونا تو دوسرے کو بھی
(ص ۵۵)	کہہ سکتے ہیں،

اسی کی شرح میں عصمت اللہ سہارنپوری نے کہا ہے،

لان کُلّ منهما الفوقانی بالنسبة	کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے اوپر
الی من علیه	کی نسبت سے فوقانی ہے.

اس کے بعد تصریح کی عبارت حسب تحریر ملا عصمت اللہ حسب ذیل ہے،

والحاصل انه لیس هُنا	حاصل یہ کہ یہاں کوئی علامت ایسی
علامة یمتاز احدهما عن	نہیں ہے جس سے ایک حصہ دوسرے
الآخر ولذلك تراهم یبهمون	سے ممتاز ہو سکے، اس لئے ہم دیکھتے
الکلام ویقولون للمعمور	ہیں کہ اہلِ ہیئت اس مقام پر
احد الربعین.	مشتبہ طریقے سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ
(باب ملا عصمت اللہ)	شمالی ربعوں میں سے ایک آباد ہے'

ملا عصمت اللہ اور امام الدین بعد کے لوگ ہیں لیکن انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ اگلوں کی نقل ہے.

ابن خلدون مغربی المتوفی ۸۰۸ھ نے مقدمہ میں رُبع مسکوں کے نظریہ کی تشریح کے بعد لکھا ہے:

"اور یہیں سے حکما نے یہ اخذ کیا ہے کہ خطِ استوا اور جو اس کے پیچھے ہے آبادی

خالی ہے، اور ان حکماء پر یہ اعتراض کیا گیا ہے، کہ یہ مقام تو مشاہدہ اور سیاحوں کے متواتر بیانات سے ثابت ہے، کہ آباد ہے تو پھر اس دعوی پر دلیل کیسے قائم ہوگی، (یعنی دعویٰ ہی غلط ہے۔)

پھر قدیم حکماء کی طرف سے یہ بات بنائی ہے۔

"بظاہر حکماء کا مقصد یہ نہیں ہے کہ خطِ استوا کے نیچے آبادی بالکل محال ہے جب کہ اُن کے استدلال نے اُن کو یہاں تک پہنچایا ہے، کہ وہاں گرمی کی شدت کے سبب سے پیدائش کا فساد قوی ہے، اور اس لئے آبادی اس میں محال ہے، یا بہت کم ممکن ہے اور وہ ایسا ہی ہے، کیونکہ خطِ استوار اور جو اس کے نیچے ہے، گو اس میں آبادی ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، مگر بہت کم ہے۔"

اس مسئلہ کو اس سے بہت پہلے ابن رشد المتوفی سنہ ۵۹۵ھ نے پیش کیا اور کہا کہ خطِ استوار کے دونوں طرف جب یکساں صورت ہے تو خطِ استوار کے جنوب میں کیوں آبادی نہ ہو، ابنِ رشد نے کہا ہے کہ خطِ استوا معتدل ہے اور اس کے جنوب میں جو زمین ہے وہ ویسی ہے جیسی اس کے شمال میں ہے، تو جس طرح خطِ استوار کے شمال میں آبادی ہے جنوب میں بھی ہوگی۔" (مقدمۂ ابنِ خلدون)

ابنِ خلدون اسی خیال کی مزید تشریح اور جواب دیتے ہوئے، کہتا ہے:-
لیکن یہ کہنا کہ خطِ استوار میں آبادی محال ہے، تو متواتر بیان اس کی تردید کرتا ہے۔ (مقدمہ ص ۴۳ مصر)

جو بات ابنِ رشد نے کہی وہی حسن بن احمد ہمدانی المتوفی سنہ ۳۳۴ھ (۹۴۵ء) نے جزیرۃ العرب میں کہی ہے۔

واما خلف خط الاستواء الى	لیکن خط استوار کے پیچھے جنوب کی اس
الجنوب فان طباعه تكون	کی طبعی کیفیت شمال کی طبعی کیفیت کے
على طباع شق الشمال سواء	مانند ہر چیز میں ہوگی لیکن صرف اسی
في جميع احواله الا قدر ما ذكرنا	قدر اختلاف ہوگا جس کو میں نے سرائر الحکمۃ
في كتاب سرائر الحكمة ما ذكرنا	میں لکھا ہے یعنی آفتاب کے نقطۂ اوج
اختلاف حالي الشمس في	اور نقطۂ حضیض میں اختلاف ہے جو
راس اوجها ونقطة حضيضها	اثر پیدا ہوتا ہے،

(ص ۵ لیڈن)

اس کے بعد لکھا ہے کہ بحر اعظم کی موج و طغیانی کی شدت کے سبب ادھر جنوبی سمت (یعنی جنوبی افریقیہ) میں سمندر کی طرف سے جانے کی کسی کو ہمت نہیں پڑتی،

بیرونی نے آفتاب کے نقطۂ اوج و حضیض کا جو فرق پیدا کیا تھا، نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ نے اس کو کمزور ثابت کیا، اور کہا

فمن البعيد ان يبلغ تاثيرها	یہ دور از قیاس ہے کہ آفتاب کی تاثیر
الى حد يصير احد الموضعين	اس حد تک پہونچ جائے کہ دو مقام
متساويين في الوضع مسكونا	جو وضع (پوزیشن) میں یکساں ہوں
والآخر غير مسكون،	ان میں سے ایک آباد ہو اور دوسرا
(تقويم البلدان ابو الفداء)	غیر آباد ہو،

(صفحہ ۳ پیرس)

ادھر علماء تو اس مناظرہ میں مصروف رہے کہ بالائی آبادی ہے یا نہیں یا عقلاً ہو سکتی ہے

یا نہیں، اور ادھر کم لکھے پڑھے سیّاح اور جہاز راں خطِ استوا کو پار کر کے افریقہ کی ہر سمت میں تیر گئے،

جو بی حصہ میں افریقہ کا جہاں تک تعلق ہے، عرب تاجر اور سیّاح اُس کے گوشہ گوشہ سے واقف ہو چکے تھے، جہاں جہاں موجودہ زمانہ میں اہلِ یورپ پہونچے، مسافرانِ عرب کے نشان قدم برابر پائے، عملی عرب سیّاح اور جہازراں خطِ استوا کو پار کر کے افریقہ کے ایک ایک کونے اور گوشے میں پہونچے، اور خطِ استوا سے نیچے راس الرّجال الصالح (گڈ ہوپ) تک سب چھان مارا چنانچہ ابو عبداللہ البکری کی صفۃ الافریقیہ والمغرب، ابن بطوطہ کے سفرنامہ کے آخری ابواب اور ابن خلدون کے مقدمہ اور تاریخ میں اُن کے حالات موجود ہیں لیکن اصلی باشندوں نے توحش اور جہالت اور حیوانیت کے سبب سے اُن کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی،

ابنِ خلدون جنوبی افریقہ کے بعض مقامات، سلا، کمرور، غانہ اور سلطنت مالی کا نام لے کر کہتا ہے،

"اور آج کے زمانہ میں یہ پوری سرزمین سوڈانی قوم کی مملکت میں شامل ہے، اور اُن کے ملک تک مراکش کے سوداگر جاتے ہیں .... اور اُن کے پیچھے جنوب میں کوئی قابلِ ذکر آبادی نہیں، ہاں کچھ آدم صورت انسان ہیں، جو انسانوں کے مقابلہ میں جانوروں سے زیادہ قریب ہیں، وہ صحراؤں اور غاروں میں رہتے ہیں اور گھاس اور غذا بن پکائے کھاتے ہیں، اور ان میں ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں، وہ انسانوں کے شمار میں نہیں،

(مقدمہ ص ۵۴ مصر)

مشرقی افریقہ تو عربوں کا وطن ہو گیا، زنجبار پر وہ قابض تھے، اور سواحل میں مدگاسکر

(قنبلو) کے مقابل تک اُن کا بحری گذرگاہ تھا، مغربی افریقہ گانا (غانہ) میں اُن کی نوآبادی تھی، شمالی افریقہ تو اُن کی عظیم الشان سلطنتوں کا مرکز ہے، اور آج تک وہ اس پر قابض ہیں۔ اور جنوبی افریقہ کے حیوان نما انسانوں کا حال ابھی پڑھ چکے لیکن انھوں نے محنت کر کے ان میں سے اکثر جانوروں کو انسان بنایا، اور کچھ کو اُن کے جانشین اہلِ فرنگ نے بعد کو انسان بنایا، اور باقی آج بھی جانور ہیں، الغرض

"افریقہ کی سمت میں عرب تاجر اور نوآباد پھیل گئے تھے، سکا گوا زولو، کفردریا (الکفرہ) میں وہ آباد تھے، اور اُن کے قدیم آثار موجود ہیں، ۱۹۰۳ء میں روڈیشیا شمالی ٹرنسوال میں ایک عرب کی قبر ملی ہے جس میں مرنے والے کا نام سلام اور تاریخ وفات ۹۵ھ لکھی ہے، اسی طرح اہلِ جرمنی نے چند سال ہوئے مشرقی افریقہ کے اندرونی علاقہ میں قدیم شہر بوما میں وانگا کے قریب قدیم عربی کتابیں پائے جن کو وہ برلن عجائب خانہ لے گئے،

"پرتگالیوں کی تاریخ میں ہے کہ جب اُن کے جہازات جنوبی مشرقی سواحل افریقہ گڈ ھوپ اور شمال کے درمیان سفر کرتے تھے، تو انھوں نے عربوں کو پایا، جن کے جہازات سے ساحل بھرا ہوا تھا، اور کفردریا کے ملک سے بہت سا سونا اپنے جہازوں میں لاد چکے تھے تاکہ وہ اپنے ملکوں کو لے جائیں[۵]؛

مغربی افریقہ میں نائیجریا کا وسیع خطہ عربوں کی نوآبادیوں کا مرکز تھا، اور سب سے بہاں بخصوصیت کے ساتھ ہم کو مغربی افریقہ کے ایک گوشہ سے جس کو عرب غانہ اور اہلِ یورپ

---

[۵] یہ دونوں اقتباس المقتطف مصر اگست ۱۹۱۵ء کے مضمون الرحلۃ الی افریقیۃ القدیمۃ سے ماخوذ ہیں،

گانا (Guinea) کہتے ہیں، بحث ہے، اور جو قدیم زمانہ سے سونے کی سرزمین ہے،
غانہ — اہلِ عرب اس سونے کی سرزمین تک بہت پہلے پہونچ چکے تھے، عربی جغرافیوں
میں اس کا نام بار بار آیا ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ ہر قوم میں اس ملک کا نام ہی سونا
ہوگیا ہے، عربی میں خالص سونے کو تبر کہتے ہیں، یہی تبر اس کا عربوں میں نام ہے، چنانچہ یاقوت
نے معجم البلدان میں غانہ کا حال غانہ سے زیادہ تبر میں لکھا ہے، یہ گانا یورپ میں جا کر گنی کی صورت
میں سونے کی اشرفی بن گئی،

گانا خطِ استوا کے جنوب میں مغربی افریقہ کے اس ساحل پر واقع ہے، جہاں سے جنوبی
امریکہ اور پرانی دنیا کا ایک طرح سے محاذ پڑتا ہے، اس لئے اس موقع پر اس کی خاص اہمیت ہے،

اہلِ عرب گانا کب پہونچے؟ اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں لیکن قیاس ہے کہ دوسری
صدی میں مصر اور نوبہ اور بجہ وغیرہ افریقی قبیلے یہاں کے سونے کا خراج مصر میں ادا کرتے
تھے، اور وہاں مسلمان عمال اور مزدور آباد ہو چکے تھے[1]، پانچویں صدی ہجری کے اندلسی جغرافیہ
نویس ابو عبید عبداللہ البکری المتوفی ۴۸۷ھ (۱۰۹۴ء) نے کتاب المسالک والممالک کے حصہ کتاب المغرب فی بلاد افریقیہ
والمغرب میں گانا کا، وہاں کے قبائل کا، اُن کے بادشاہ کا، اور اس کی سلطنت کا پورا حال
لکھا ہے، اور وہاں کے مسلمانوں کی سکونت اور آمد و رفت کی اطلاع دی ہے، یہ حالات مصنف
نے ۴۶۰ھ میں لکھے ہیں، شہر غانہ کے دو حصے تھے، ایک میں مسلمان رہتے تھے، جس میں بارہ مسجدیں
تھیں، ایک جامع مسجد تھی ان مسجدوں میں امام و مؤذن اور علماء و فقہاء سکونت پذیر تھے، دوسرے
میں بادشاہ اور اس کے اربابِ حکومت رہتے تھے، بادشاہی عمارت کے پاس بھی ایک مسجد بنی تھی
جس میں وہ لوگ فریضۂ نماز ادا کرتے تھے، جو بادشاہ کے پاس آتے تھے، ملک کے دوسرے حصے
میں بھی مسلمانوں کی آبادیاں تھیں، بادشاہ اور اس کے قبیلہ کے لوگ اُس وقت تک بت پرست

---

[1] طبری واقعات ۲۳۵ھ

تھے، لیکن مسلمانوں کی پوری عزت کرتے تھے، لیکن اسی زمانہ میں بادشاہ نے ایک مسلمان کی تبلیغ سے اسلام قبول کرلیا، وہاں ایک ایسی عرب قوم بھی آباد تھی، جو بنو امیہ کے زمانہ میں فوج کی حیثیت سے آئی تھی، اور وہیں رہ پڑی، بعد کو وہ اپنا مذہب بھی بھول گئی[۱]

اس بیان سے معلوم ہوا کہ عرب یہاں بنو امیہ ہی کے زمانہ میں یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر یا دوسری صدی ہجری کے شروع میں پہونچ چکے تھے،

چھٹی صدی ہجری میں غرناطہ کے ابو حامد اندلسی المتوفی ۵۹۵ھ نے جو اسپین سے لیکر چین تک سیاحت کرچکا تھا، اور بغداد میں اقامت گزین ہوگیا تھا، تحفۃ الالباب کے نام سے جغرافیہ اور عجائب عالم پر ایک کتاب لکھی ہے، اس میں وہ غانہ کے متعلق لکھتا ہے،

وبلاد ھو مہا یلی المغرب الاعلی المتصل بطنجۃ ممتدا علی بحر الظلمات[۲]	ان کا ملک مراکش کے اس حصہ سے جو طنجہ سے ملا ہے، اور بحر ظلمات (اٹلانٹک) کے سواحل پر پھیلا ہے، متصل ہے،

ابو حامد کا یہ بیان بہت مبہم ہے، مراکش شمال میں ہے، اور غانہ اس کے جنوب میں اور دونوں کے بیچ میں صحرائے افریقیہ ہے، لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ وہ اس سے واقف تھا،

بہرحال اس کے زمانہ میں ان اطراف کے پانچ قبیلے مسلمان ہوچکے تھے، جن میں ایک غانہ کا قبیلہ تھا،

---

[۱] کتاب المغرب فی صفۃ افریقیہ وبلاد المغرب صفحات ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۸، و ۱۷۹ مطبوعہ الجزائر ۱۹۱۱ء [۲] تحفۃ الالباب صفحات ۴۱ و ۴۲، پیرس،

اُن کے بادشاہوں میں سے پانچ قبیلے جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے مسلمان ہو گئے
ان میں سے قریب تر غانہ ہے جس کی ریگ میں خالص سونا پیدا ہوتا ہے، اور
اُن کے یہاں سونا بہت ہے۔"

(ص ۱۴۱ وص ۲۴۲ بربر)

اس کے بعد ادریسی مراکشی المتوفی ۵۶۰ھ نے سسلی میں بیٹھکر شاہ سسلی کے حکم سے جغرافیہ کی مشہور کتاب نزہتہ المشتاق فی اختراق الآفاق لکھی، اس میں غانہ کے حال میں جیسا کہ ابن خلدون نے نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ غانہ میں علوی سادات کی سلطنت ہے؛

"گنی میں جیسا کہ کہا گیا ہے، بنی صالح نام علویوں کی سلطنت اور حکومت ہے
زجار کی کتاب کے مصنف (ادریسی) نے کہا ہے کہ اس کے بانی کا نام صالح ابن
عبداللہ بن حسن بن حسین ہے۔"

ابن خلدون کہتا ہے کہ عبداللہ بن حسن کی اولاد میں صالح نام کوئی شخص معروف نہیں ہے، بہرحال ابن خلدون المتوفی ۸۰۸ھ کے زمانہ میں غانہ کا ملک سلطان مالی کے زیر حکومت تھا[1]،

مشہور سیاح ابن بطوطہ جو اسی زمانہ میں تھا، وہ اسی سلطان کے زمانہ میں غانہ پہونچا تھا، اس سلطان اور اُس کی مملکت اور قوم کے حالات اُس نے اپنے سفرنامہ کے خاتمہ میں بیان کئے ہیں، یہ لوگ دیندار مسلمان تھے، اور عربی زبان افریقہ کے دوسرے حصوں کی طرح یہاں بھی سرکاری و مذہبی دونوں حیثیتوں سے رواج پذیر تھی یہیں سے ابن بطوطہ سلطان مراکش کی دعوت پر تمام دنیا کا چکر لگا کر اپنے ملک میں واپس گیا ہے[2]؛

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۶ مصر، ذکر اقلیم اوّل [2] سفرنامہ ابن بطوطہ آخری باب،

ابو عبید بکری اندلسی، ابو حامد غرناطی، یاقوت رومی جغرافیہ کے ان تینوں مصنفوں کی کتابوں میں
زمانہ میں سونے کی بڑی بڑی داستانیں ہیں، کہ کس طرح عرب تاجر مراکش اور مغرب سے
اونٹوں پر لاد کر نمک اور دوسرے معمولی سامان لیجاتے ہیں، اور وہاں سے سونا بھر کر واپس لاتے
ہیں، اس داستان کو یہاں زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں، مگر اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ
آخری نتیجہ میں یہ بات کام آئے گی۔

شمالی روس اور بحر بزرگ

جنوب سے اب شمال کا رخ کیجئے، عرب چوتھی صدی کے شروع
میں خلیفہ مقتدر باللہ کی خلافت میں، انتہائی شمالی روس تک پہونچ چکے تھے، جہاں رات صرف
چار گھنٹے کی ہوتی ہے، وہاں کا بادشاہ مسلمان ہوگیا تھا، اور خلیفہ سے خواہش کی تھی کہ اس
کی اور اس کی قوم کی تعلیم کے لئے کچھ لوگ بھیجے جائیں، خلیفہ نے ابن فضلان کی سرکردگی میں
ایک وفد وہاں روانہ کیا، وہ آذربیجان ہو کر نہر آمل یعنی والگا طے کرکے انتہائی شمالی روس
کے قدیم شہر بلغار میں پہنچا اور کچھ روز رہ کر وہاں سے واپس آیا، اس پورے سفر کی روداد
اس وقت بھی مختصر طور سے معجم البلدان کے الفاظ بلغار اور روس میں درج ہے، آٹھویں صدی
میں ابن بطوطہ شمالی روس کے اس سرے پر پہونچا تھا جس کے آگے شمالی قطب کی برف پوش
زمین تھی، اور جہاں بقول ابن بطوطہ برف پر چلنے کے لئے کتوں کی گاڑیوں کی ضرورت تھی، اور
کتے بہت بیش قیمت تھے، اس وجہ سے ابن بطوطہ آگے نہ بڑھا[1]، یہ وہی سواری ہے جس سے
آجکل کے بہادر بھی قطب شمالی کی سرزمین کو طے کرتے ہیں۔

روس کے انتہائی [illegible] شیرازی نے کیا

[illegible] دریائے [illegible] بحر بزرگ ہے، اس کا ذکر بیرونی، نصیر الدین طوسی اور
[illegible] اور اس کا [illegible] بتایا ہے [illegible] بحر بزرگ ایشیا کی طرف آکر مجرائے کاہل

---

[1] سفرنامہ ابن بطوطہ۔

میں مِل جاتا ہے، اور شمال کی طرف اسی آبنائے بیرنگ کی پتلی سی لکیر شمالی امریکہ (کناڈا) اور پُرانی دنیا کے بیچ میں حائل ہے، مسلمانوں کا علمی قدم اس سمت میں اس پتلی لکیر تک آکر رُک گیا تھا، جہاں سے شمالی امریکہ منجمد برفستان کے پردہ میں چند قدم پر رہ گیا تھا،[1]

انتہائی آبادی مسلمانوں میں علمِ ہیئت اور ریاضی جغرافیہ کا علم زیادہ تر یونان سے آیا تھا، خصوصًا بطلیموس کی کتاب الجغرافیہ اور مجسطی پر انھوں نے اپنی معلومات کی بنیاد کھڑی کی، بطلیموس نے خطِ استوار کو جو افریقہ سے گذرتا تھا خشکی میں انتہائی آبادی قرار دیا، کیونکہ اس کے خیال میں گرمی کی شدت کی وجہ سے انسانی آبادی اس کے بعد ممکن نہیں تھی، اور اسی طرح طول میں انتہائی آبادی افریقہ کے پار بحرِ محیط کے چند جزائر کو قرار دیا تھا، جن کو اہلِ عرب جزائر خالدات کہتے ہیں، جس کا صحیح ترجمہ جزائر سعید یا مبارکہ ہے، جس کو بعض عرب اہلِ جغرافیہ اور اہلِ ہیئت نے اختیار کیا ہے، اور جو اصل میں لاطینی لفظ (Fortunate) کا معرب ہے، اسی یونانی لفظ کو البکری نے اپنے جغرافیہ میں قرطناتس کے نام سے لکھا ہے، اس سے مقصود جزائر کنیری (Canaria) ہیں،

عام طور سے مشرقی اہلِ ہیئت وجغرافیہ اُن کو مفقود اور پانی میں غرق سمجھتے ہیں، مگر مغربی جغرافیہ نویس اس سے پوری طرح واقف تھے، ابو عبید عبد اللہ بن عبد العزیز البکری اندلسی المتوفی ۴۸۷ھ ۱۰۹۴ء لکھتا ہے،

> اور بحرِ محیط میں طنجہ کے مقابل اور کوہ اٹلس کے سامنے وہ جزیرے ہیں جن کا نام قرطناتس یعنی ہمیشہ سرسبز رہنے والے (سعیدہ) جزائر سعادات (خالدات) ہیں،

---

[1] تقویم البلدان ابو الفداء ص ۳۵، و تذکرہ نصیر طوسی تفصیل کے لئے دیکھو میری کتاب عربوں کی جہازرانی، ص ۱۱۳، ۱۱۹،

ان کا یہ نام اس لئے پڑا کہ ان کی پہاڑیاں قسم قسم کے میووں اور خوشبودار پھولوں سے معمور ہیں، یہ میوے اور پھول لگائے بغیر خود بخود اُگتے ہیں، اُن کی زمینیں گھاس کی بجائے عطر پھولوں سے آباد ہیں، اور وہ بلاد بربر کے مغرب میں دریائے مذکور میں متفرق طور پر واقع ہیں[۱]،

دوسری طرف انتہائی آبادی جزیرۂ طولی کو بتاتے ہیں، جس کو برطانیہ کے اطراف میں اب عام طور پر آئسلینڈ کہا جاتا ہے،

زمین گول ہے اور جذب و کشش سے قائم ہے

اس مسئلہ سے بھی اہلِ عرب واقف تھے، کہ زمین گول ہے، اور جذب و کشش کے اصول پر قائم ہے کسی بیل کے سینگ یا ستون یا پہاڑ کی پشت پر یہ گیند رکھا ہوا نہیں ہے،

ابن خردازبہ المتوفی سنہ ۳۰۰ھ کہتا ہے:-

زمین کی شکل گول ہے جیسے گیند جو فضائے آسمانی میں اس طرح رکھا ہوا ہے جیسے انڈے کے اندر زردی، اور ہلکی ہوا (نسیم) زمین کے چاروں طرف ہے، اور وہ چاروں طرف سے کشش کر رہی ہے، آسمان تک اسی طرح مخلوقات کے اجسام زمین پر ہیں کہ وہی نسیم اُن کے بدنوں پر جو ہلکا پن ہے، اس کو کشش کرتی ہے، اور زمین اُس کے ثقل کو کھینچتی ہے، کیونکہ زمین مثل اس پتھر کے ہے، جس کو لوہا کھینچتا ہے، (یعنی مقناطیس[۲])

اس عبارت میں زمین کی گولائی اور جذب و کشش کے علاوہ جس حقیقت کو نسیم جیسی ہلکی پھلکی ہوا سے ادا کیا گیا ہے، آج آپ اس کو بے تکلف "ایتھر" کہتے ہیں، نویں صدی کے آخر کا عرب جہاز راں ابن ماجد مقناطیس کے بیان میں کہتا ہے،

---

[۱] المغرب فی ذکر بلاد افریقیہ للبکری ص ۱۰۹ الجیریا، [۲] کتاب المسالک والممالک ص ۴ لیڈن،

وقیل انّ السّبع السّمٰوٰت و الارض معلقات بمقناطیس[۱] — اور کہا گیا ہے کہ ساتوں آسمان اور زمین قدرت کے مقناطیس سے معلق ہیں

جذب وکشش کے مسئلہ کو اہلِ جغرافیہ کے علاوہ دوسرے حکمائے اسلام نے بھی بیان کیا ہے، مگر اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں،

زمین کو گول تو تمام حکمائے اسلام نے تسلیم کیا، مگر مجھے اس دعوی پر وہ استدلال پیش کرنا ہے، جو اہلِ جغرافیہ کے قلم سے نکلا ہے،

ابنِ رستہ (۲۷۰ھ) تیسری صدی ہجری میں تھا، وہ زمین کے گول ہونے پر ستاروں کے طلوع وغروب اور ظہور وخفا سے اس طرح محققانہ بحث کرتا ہے،

"تمام اہلِ علم نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ زمین اپنے تمام اجزاء کے ساتھ خشکی و تری کی گیند کی طرح ہے، اور دلیل یہ ہے کہ سورج چاند اور کل ستاروں کا طلوع وغروب زمین کے تمام کناروں میں ایک وقت نہیں ہوتا، بلکہ مشرقی مقامات میں اُن کا طلوع، مغربی مقامات سے پہلے ہوتا ہے، اور ان کا غروب مشرقی مقامات میں مغربی مقامات سے پہلے ہوتا ہے، اور یہ حوادثِ فلکی سے ظاہر جو آسمان میں ہوتے ہیں، تو ایک ہی حادثہ زمین کے تمام اطراف میں مختلف مقامات میں ہوتا ہے، جیسے چندر گرہن کا اگر ایسے دو مختلف شہروں میں اُن کو رصد کیا جائے جو ایک مشرق میں ہو، اور دوسرا مغرب میں، تو مثلاً اگر مشرقی چندر گرہن کا وقت رات کے تیسرے گھنٹہ میں ہو تو ...... (ابنِ رستہ ص ۱۲)

زمین کی گولائی پر آج کل جہازوں کے اولاً مستول پھر آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے پورا جہاز نظر آنے سے جو استدلال کیا جاتا ہے، اس سے بھی وہ واقف تھے، مسعودی لکھتا ہے، ا۔

---

[۱] کتاب الفوائد ص ۲ پیرس)

اور جہاز جب سمندر کے بیچ میں ہوگا تو وہ پہاڑ غائب ہو جائیں گے، اور نظر نہیں آئیں گے اور جب دریا میں سو فرسخ کے قریب رہ جائے گا، تو ذرہ سا پہاڑ کا سر نظر آئے گا، اور جیسے جیسے ساحل کے نزدیک ہوتے جائیں گے، پہاڑ بڑا ہوتا جائیگا اور یہ اس بات پر دلیل ہے، کہ سمندر کا پانی گول شکل پر ہے، اور یہی بحر روم میں حال ہے، یہ شام کے پہاڑ جو انطاکیہ اور لاذقیہ اور طرابلس اور جزیرہ سائپرس کے ساحل پر ہیں، کہ جہاز میں نگاہوں سے پوشیدہ رہتے ہیں اور ساحل کے قریب آتے ہوئے آہستہ آہستہ نظر آتے ہیں،

(مروج الذہب جلد ا ص ۱۹۵ پیرس)

ابو بکر ابن الفقیہ ہمدانی (سنہ ۲۹۰ھ) اپنے جغرافیہ کتاب البلدان میں لکھتا ہے:-

"کہتے ہیں کہ سمندر بھی گول ہے، اور دلیل اس کی یہ ہے کہ جب تم ساحل سے بیچ سمندر میں چلے جاؤ، تو ساحل کے پہاڑ اور درخت آہستہ آہستہ تمہاری نظر سے غائب ہونے لگیں گے، پھر جب تم بیچ سمندر سے ساحل کی طرف آؤ تو وہ آہستہ آہستہ پھر دکھائی دینے لگیں گے،

(ص ۱۵۴ - لیڈن)

یہ دلیل بعینہ وہی ہے جو آج بھی زمین کی گولائی پر عام طور سے پیش کی جاتی ہے،

زمین کے فوقانی اور تحتانی حصے اور رات اور دن

ہر چند کہ یہ مسئلہ عربی علم ہیئت میں آفتاب کے دور اور حرکت کے سلسلہ میں عام طور سے مذکور ہے لیکن زمین کے تحتانی اور فوقانی حصوں کی تخصیص کے ساتھ ذکر کرنے میں بے توجہی کی گئی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ مسلمان اس مسئلہ سے واقف نہ تھے۔ تیسری صدی ہجری کا مصنف ابن رستہ اپنی کتاب الاعلاق النفیسہ

کے مقدمہ میں شب و روز کے چوبیس گھنٹوں اور جاڑا گرمی میں روز و شب کے گھٹنے اور بڑھنے کا ذکر کر کے لکھتا ہے،

لان نصف الارض ابداً انھلا	کیونکہ نصف زمین میں ہمیشہ دن رہتا
مضئ ونصفھا الیل مظلم	ہے، اور دوسرے نصف میں اندھیری
ید وران علیھا،	رات اور یہ شب و روز اس زمین پر
(ص ۹ لیڈن)	گردش میں ہیں،

چوتھی صدی کے آغاز کا مصنف مسعودی مروج الذہب میں اس کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے،

"زمین کی آبادی کا آغاز جزائر خالدات سے شمار کرتے ہیں، جو مغربی بحر اوقیانوس میں واقع ہیں، یہ چھ آباد جزیرے ہیں، اور آبادی کی انتہا چین کی انتہائی آبادی پر، ان دونوں کے درمیان ۱۲ گھنٹوں کی مسافت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آفتاب جب چین کے انتہائی حصہ میں ڈوبے گا تو ان جزیروں میں جن کا ذکر ابھی ہوا، اور جو مغربی بحر اوقیانوس میں واقع ہیں، دن ہوگا، اور جب ان جزیروں میں رات ہوگی، تو اقصائے چین میں دن ہوگا، اور یہ زمین کا نصف دائرہ ہے۔ اور وہی آبادی کا طول ہے جس سے وہ واقف ہوئے ہیں،

(ج ۱ ص ۱۸۰ پیرس)

کرۂ ارض کے دوسری جانب آبادی

ربع مسکون کا نظریہ ٹوٹ جانے کے بعد کرۂ ارض کی دوسری جانب آبادی کا تخیل بہت قریب ہوگیا، یہ تخیل قدیم سے قدیم تیسری صدی ہجری کے عرب جغرافیہ نویسوں میں ملتا ہے،

ابن خردازبہ المتوفی ۳۰۰ھ اپنے جغرافیہ میں لکھتا ہے :-

الا ان العمارة فی کرة الارض	کرۂ زمین میں آبادی خطِ استوار
بعد خط الاستواء اربع و	کے بعد ۲۴ درجہ تک ہے، باقی کو
عشرون درجة ثم الباقی	بحرِ محیط نے ڈوبا دیا ہے، تو ہم زمین
قد غمرہ البحر الکبیر فنحن علی	کے شمالی رُبع پر آباد ہیں، اور جنوبی
الربع الشمالی من الارض و	رُبع گرمی کی شدت کے سبب سے
الربع الجنوبی خراب لشدة	ویران ہے، اور زمین کے دوسرے
الحر فیه والنصف الباقی	نصف میں جو ہمارے نیچے ہے کوئی
الذی تحتنا لا ساکن فیه	آباد نہیں،

(ص ۵ - لیڈن)

اس اقتباس کا آخری فقرہ قابلِ التفات ہے، کہ وہ زمین کی دوسری جانب کو کم از کم خشک اور آبادی کے قابل سمجھتا ہے، گو اس کی آبادی کا اس کو کوئی علم نہیں، اس کے بعد اسی کے ایک ہم عصر ابن رُستہ (۲۷۷ھ) کے قلم سے عجیب و غریب حقیقت تراوش ہوگئی ہے، وہ غلطی کے ساتھ اس قدر تسلیم کرتا ہے،

وان الناس نزلوا فی النصف	اور آدمی نصف شمالی میں آباد ہیں
الشمالی بین القبة و بنات النعش	قبہ اور بنات النعش کے بیچ میں، اور
وذالک مقسوم علی سبعة	وہ سات اقلیموں پر منقسم ہے، اور
اقالیم و باقی ذالک غیر مسکون	باقی حصہ غیر آباد ہے، اور نصف جنوبی
وینزل فی النصف الجنوبی من	میں جس کو خدا چاہے اپنی مخلوقات

مشاء اللّٰہ من الخلق، | سے آباد کرے،

(الاعلاق النفیسہ ابن رستہ ص۹ لیڈن)

ابن رستہ ربع شمالی کے بجائے نصف شمالی کی آبادی کا قائل ہے، اور جنوب کی نسبت مشتبہ ہو کر کہتا ہے "وہاں اپنی خلق میں سے جس کو چاہے بسائے"؛ یہ پیشینگوئی انکشافِ امریکہ سے پوری ہوئی،

بیرونی، نصیر طوسی، قطب الدین شیرازی اور اُن کے تلامذہ کے سوال و جواب اور رد و اعتراض سے لوگوں میں یہاں تک ہمت ہوئی کہ طوالع الانظار کے مشہور مصنف اور ابن فضل اللّٰہ العمری (مسالک الابصار فی ممالک الامصار کے مصنف) کے استاد ابو الثناء محمود بن ابی القاسم اصفہانی المتوفی ۷۴۹ھ ۱۳۴۸ء نے اس نظریہ کے پیش کرنے کی جراُت کی،

لا امنع ان یکون ما انکشف	میں اس کو ممکن سمجھتا ہوں کہ ہماری
عنہ الماءُ من الارض من	طرف زمین کا جو حصہ کھلا ہے، وہ
جھتنا منکشفاً من الجھة	دوسری طرف سے بھی کھلا ہو، اور
الأُخریٰ ولا امنع ان یکون	اُس کو بھی ممکن کہتا ہوں کہ اُس میں
بہ من الحیوان والنبات و	بھی وہی حیوان، نبات اور معدنیات
المعادن مثل ما عندنا او	ہوں جیسے ہمارے حصہ میں ہیں، یا
من انواع واجناس اُخریٰ	اور دوسرے قسم کے ہوں،

(مسالک الابصار جلد ا ص ۱۴۳ مصر)

اس سے زیادہ تصریح اور کیا ہوگی، اسی لئے شاید ابن فضل اللّٰہ نے ربع کے بجائے نصف ارض کو مکشوف قرار دیا،

والبحر محیط بنصف الارض	اور پانی نصف زمین کو چاروں
احاطة متصلة دائرة به	طرف سے کمر بند کی طرح گھیرے
کالمنطقة لا یظهر منها	ہوئے ہے، زمین کا آدھا ہی حصہ
الا نصفها وهو ما دار	کھلا ہے، اور یہ وہی ہے، جس پر
علیه الشمس فی قوس النهار	آفتاب دائرۃ النہار میں پھرتا ہے
مثل بیضة مغرقة فی ماء	اس کی مثال اس انڈے کی ہے
انکشف منها ما انکشف انغمر ما	جو پانی میں ڈوبا ہو، تو اس سے
انغمر،	کھل جاتا ہے جو کھل جاتا ہے اور ڈوب جاتا ہے
(مسالک الابصار ص ۳۰ جلد ۱)	جو ڈوب جاتا ہے،

لیکن اس سلسلہ میں صحیح بات وہ ہے، جو بیرونی نے اس سے تین سو برس پیشتر کہی تھی، کہ اس قسم کے امور استدلال نہیں، بلکہ مشاہدہ پر مبنی ہیں،

جعلوا العمارة فی احد الربعین	اس فن کے عالموں نے دو شمالی
الشمالیین لا ان ذالك موجب	ربعوں میں سے ایک ربع کو آباد
امر طبعی فمزاج الهواء واحد	مانا ہے، اس لئے نہیں کہ اس کا
لا یتباین ولکن امثاله من	کوئی طبعی سبب ہے، کیونکہ زمین کے
المعارف موکول الی الخبر	ہر طرف ہوا کا مزاج یکساں ہے
من جانب الثقة فکان الربع	لیکن بات یہ ہے کہ اس قسم کے
دون النصف هو ظاهر الامر	معلومات کسی ثقہ کی خبر اور اطلاع
والاولی بان یوخذ به الی	پر مبنی ہوتی ہیں، اس لئے آباد حصہ

ابن یرد خبرہ خبر طاری،

(تقویم البلدان ابو الفداء ص ۱۱)

چوتھائی ماننا بظاہر درست ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ اس نظریہ کو اس وقت تک مانا جائے، جب تک کسی نئی اطلاع سے اس کی تردید نہ ہو جائے،

ان علماء کو اپنے استدلال وجواب وسوال میں مصروف رہنے دیجئے، اور آیئے دوسری طرف ان جاہل جہاز رانوں کی کوششوں پر ایک نگاہ ڈالیں، جو اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر بحرِ ظلمات کی شناوری میں مصروف ہیں،

اندلس سے بحرِ ظلمات عرب کے بے آب ریگستان سے اسلامی فتوحات کا جو سیلاب چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں اٹھا تھا وہ ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں افریقہ ومغرب اقصیٰ اور اندلس کے صحراؤں اور میدانوں سے گذر کر بحرِ ظلمات کے ساحل پر آکر رکا، مگر بلند ہمت عرب کشور کشاؤں کی ہمت اب بھی اس فطری روک کے پاس آکر کم نہ ہوئی، مغرب اقصیٰ کے فاتح عقبہ نے بحرِ ظلمات کے پانی میں گھوڑا کھڑا کرکے کہا کہ

"خداوندا! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس کے بعد بھی تیرا کوئی ملک ہے تو میں ذوالقرنین کی طرح وہاں بھی تیری توحید کی دعوت لے کر جاتا،،

(المونس فی اخبار تونس ص ۲۰)

اندلس کا فاتح طارق فتح کرتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے، اس کا آقا موسیٰ اس کو روکتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ جب تک بحرِ محیط کی دیوار ہمارے قدم نہ روک لیگی ہم آگے بڑھتے جائیں گے،[۱]

۱؂ نفح الطیب ج ۱ ص ۱۱۳ مصر،

ماورائے بحرِ ظلمات سفر کا تخیل عربوں اور مغربی و افریقی مسلمانوں میں ذوالقرنین کے قصہ کے سلسلہ میں پیدا ہوا یہ کہانی اتنی پھیلی کہ علمِ ہیئت کی کتابوں تک میں درج ہے، کہتے ہیں کہ ذوالقرنین نے ملک مغرب میں پہونچ کر اپنا جہاز بحرِ ظلمات کی تحقیق حال کے لئے روانہ کیا، وہ اس پار کے ایک جہاز کو گرفتار کر کے لے آیا، جس میں ماورائے بحرِ ظلمات کے کچھ باشندے سوار تھے، ذوالقرنین نے ان سے ان کے ملک کا حال دریافت کیا، رصدگاہ مراغہ کا عالمِ ہیئت شارح جغمینی اس قصہ کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے:-

"یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان میں بڑے بڑے دریا اور اونچے اونچے پہاڑ اور صحاری حائل ہوں، جو ان کی خبر ہم تک نہیں آنے دیتے، ہاں دو جنوبی ربعوں میں سے ایک میں کچھ آبادی بیان کی جاتی ہے، اور وہ جو ذوالقرنین کے زمانہ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے، وہ بظاہر بے اصل معلوم ہوتا ہے"

(مقالۂ ثانیہ فی بیان الارض)

لیکن اس قسم کی کہانیوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی، چنانچہ اسپین و افریقہ کے سواحل میں مغرورین اور مغررین (فریب خوردہ) کے نام سے ایک جماعت ہی قائم ہو گئی، جو اپنے کو مصیبتوں میں ڈال کر اس بحرِ محیط کے سفر کے لئے روانہ ہوتی تھی، پھر وہ اس میں فنا ہو جاتی تھی یا کامیاب واپس آتی تھی،

تیسری صدی کے آخر اور چوتھی صدی ہجری کے شروع (نویں صدی عیسوی کے آخر اور دسویں صدی عیسوی کے شروع) میں مسعودی اپنی مروج الذہب میں اس قسم کے واقعات کے لئے اپنی دوسری تصانیف کا حوالہ دیتا ہے،

وَقَدْ اَتَیْنَا عَلٰی ذِکْرِھَا فِی کِتَابِنَا　　　　اور ہم نے اپنی کتاب اخبار الزمان میں

فی اخبار الزمان وفی اخبار من غرّر وخاطر بنفسه و من نجا منهم و من تلف و من شاهد و امنه و ما رأوا

اور ان لوگوں کے حالات میں ان واقعات کو بیان کیا ہے، جنہوں نے اپنے آپ کو فریب دیا اور اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈالا، اور اُن سے جو بچا اور جو ہلاک ہوا، اور انہوں نے جو دیکھا اور مشاہدہ کیا،

اس کے بعد کہتا ہے :-

واذا منهم رجل من اهل الاندلس يقال له خشخاش وكان من فتيان قرطبة و احداثهم فجمع جماعة من احداثها و ركب بهم مراكب استعدها فی هذا البحر المحيط فغاب فيه مدة ثم انثنى بغنائم واسعة و خبره مشهور عند اهل الاندلس

اور ان میں اندلس کے رہنے والوں میں سے ایک شخص تھا جس کو خشخاش کہہ کر پکارا جاتا تھا وہ قرطبہ کے نوجوانوں میں سے تھا، اُس نے قرطبہ کے اور نوجوانوں کی ایک جماعت بنائی، اور اُن کو لے کر ان کشتیوں پر سوار ہوا، جن کو اس نے بحرِ محیط میں اس غرض کے لئے تیار رکھا تھا وہ ایک زمانہ تک غائب رہا، پھر بہت سا مالِ غنیمت لیکر لوٹا۔ اس کا واقعہ اندلس والوں میں بہت مشہور ہے

(ج ۱ - ص ۱۵۰ - پیرس)

ادریسی المتوفی ۵۶۰ھ نزہۃ المشتاق میں اندلس کے جغرافیہ میں تین موقعوں

ان مغرورین یعنی فریب خوردہ جہازرانوں کا ذکر کیا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ امیر المسلمین علی بن یوسف ابن تاشفین کے امیرالبحر احمد بن عمر معروف بہ رقم الآذر (نقش بط) نے بحرِ ظلمات کے ایک جزیرہ پر فوج کشی کی تھی، مگر کامیابی کے پہلے ہی وہ مرگیا۔

ادریسی ایک موقع پر بحرِ ظلمات کے ذکر میں لکھتا ہے۔

"اس بحر ظلمات کے پیچھے جو کچھ ہے اس کو کوئی نہیں جانتا، اور نہ کسی آدمی کو صحیح واقفیت ہے، کیونکہ اُس کو عبور کرنا سخت مشکل ہے، اُس کی فضا میں بڑی تاریکی اور اس کی موجیں نہایت سخت اور اس کے خطرات بہت، اور اس کے جانور خطرناک اور اُس کی ہوائیں ہیجان انگیز ہیں، اس میں بہت سے جزیرے ہیں، کچھ آباد، کچھ سمندر کے اندر اور کوئی جہازراں اس کو عرض میں قطع نہیں کرتا اور نہ اُس میں گھستا ہے، البتہ اُس کے ساحل کے طول کے کنارے کنارے اس سے لگ کر چلتا ہے"[۵۲]

اب بحرِ ظلمات میں یہ کون سے جزیرے ہیں؟ کیا امریکن جزائر ویسٹ انڈیز نیو فاؤنڈ لینڈ، گرین لینڈ وغیرہ ہو سکتے ہیں،

لشبونہ (لسبن ساحل پرتگال) کے ذکر میں ادریسی ان فریب خوردہ جہازرانوں کا ایک دلچسپ قصہ سناتا ہے، کہتا ہے:

"اور اسی شہر لسبن میں فریب خوردہ لوگ اس نے بحرِ ظلمات میں سوار ہوئے تھے تاکہ پتہ لگائیں کہ اس میں کیا ہے، اور کہاں جاکر ختم ہوتا ہے، شہر لسبن میں ایک پھاٹک یا گلی (درب) ہے جس کا نام فریب کھانے والوں کا درب ہے، اور اُن کا قصہ یہ ہے کہ آٹھ آدمیوں نے جو آپس میں سب چچا کے بیٹے تھے، باربرداری کا م

---

[۵۱] نزہۃ المشتاق ص ۵۵ - ۱۶۵ - ۱۸۴، [۵۲] ایضاً ص ۱۶۵،

ایک جہاز بنایا، اور اس میں پانی اور توشہ آستار کھ لیا، جو مہینوں کے لئے کافی تھا، پھر اس جہاز میں سوار ہو کر ایک مناسب موسم میں روانہ ہوئے گیارہ دن کے بعد ایک ایسے پانی میں پہونچے جو سخت موجوں والا تھا، وہاں کی ہوائیں کدر تھیں، روشنی مانند تھی، انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب ہلاکت قریب ہے، تو اپنے بادبانوں کو دوسرے ہاتھ کی طرف پلٹ دیا، اور سمندر میں جنوب کی طرف چلتے رہے، اور بکریوں والے ایک جزیرہ میں پہونچ گئے، وہاں بے شمار بکریاں تھیں جن کو کوئی پکڑنے والا یا چرانے والا نہ تھا، وہ جزیرے میں اترے، وہاں چشمہ ملا، اور جنگلی انجیر، انھوں نے ان بکریوں میں سے کچھ کو ذبح کیا تو ان کا گوشت بہت ہی کڑوا نکلا جس کو وہ نہ کھا سکے، اور اُنکی کھالیں لے لیں، اور جنوب کی سمت میں ۱۲ دن وہ اور چلے، ان کو ایک جزیرہ ملا جہاں آبادی اور کھیتی تھی، تو وہ اس جزیرہ کو دیکھنے چلے، ابھی کچھ ہی دور چلے تھے، کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں نے اُن کو گھیر لیا، اور اُن کو پکڑ کر جہاز ایک ساحلی شہر کی طرف لے گئے، وہاں ایک گھر میں جا کر اُتارا، وہاں سُرخ رنگ (اشقر) کم لیکن سیدھے بال والے لمبے قد کے آدمی دیکھے اُن کی عورتوں میں عجیب خوبصورتی تھی تو وہ لوگ تین دن ایک گھر میں قید رہے، چوتھے دن اُن کے پاس ایک آدمی آیا، جو عربی میں باتیں کرتا تھا، اُس نے اُن کا حال دریافت کیا، اور پوچھا کیوں ائے اور کہاں سے آئے، اور تمہارا وطن کہاں ہے، انھون نے اپنا پورا حال بتایا، اُس نے اُن سے بھلائی کا وعدہ کیا، اور بتایا کہ وہ بادشاہ کا ترجمان ہے دوسرے دن اُن کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا، اُس نے اُن کا حال پوچھا تو وہی بتایا، جو کل ترجمان کو بتا چکے تھے، کہ وہ اس سمندر میں اس لئے گھسے تھے کہ دیکھیں اس میں کیا کیا عجائبات ہیں، اور اس کے حالات کیا ہیں، اور اس کی حد

دریافت کریں یہ سن کر بادشاہ ہنسا اور ترجمان کے ذریعہ سے ان کو بتایا کہ اس کے باپ نے اپنے غلاموں کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ سمندر کے عرض میں ایک مہینہ تک چلتے رہیں، مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اور وہ ناکام واپس آئے۔ پھر بادشاہ نے ترجمان سے کہا کہ ان سے بھلائی کا وعدہ کرے، اور بادشاہ کے ساتھ حسن ظن پیدا کرے، اس نے ایسا ہی کیا۔ پھر وہ اس قید خانہ میں لے آئے گئے، یہاں تک کہ وہ موسم آیا جب پچھوا ہوا چلتی ہے، تو ان کو ایک کشتی میں بٹھا کر اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر ایک مدت تک سمندر میں چلاتے رہے، ان کا گمان ہے کہ تین دن اور تین رات وہ چلے ہوں گے، یہاں تک کہ وہ ایک خشکی میں پہنچائے گئے، وہاں ان کی مشکیں کسی گئیں، اور ساحل پر چھوڑ دیئے گئے، یہاں تک کہ دن نکلا اور روشنی ہوئی، اور ہم بندھے ہونے کے سبب سے سخت تکلیف اور بدحالی میں تھے، پھر ہم نے لوگوں کی آوازیں سنیں، تو چیخے تو وہ لوگ پاس آئے اور مشکیں کھولیں اور ہمارا حال دریافت کیا، ہم نے بتایا، یہ لوگ بربر تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ تم جانتے ہو، کہ تمھارے وطن کا یہاں سے کتنا فاصلہ ہے، انھوں نے کہا نہیں، انھوں نے کہا ۲ مہینوں کی مسافت، یہ سن کر ان فریب خوردہ جہازرانوں میں سے ایک کی زبان سے وا اسفی (ہائے افسوس) نکل گیا، تو اس مقام کا نام اسفی پڑ گیا اور وہ مغرب اقصی کے بندرگاہ کا نام ہے[1]،

جزئی اغلاط اور دنوں کے اندازہ سے قطع نظر کرکے کیا ہم اس مقام کو جہاں تک فریب خوردہ جہازراں پہونچے تھے، شمالی امریکہ کا کوئی گوشہ سمجھیں، اور سرخ رنگ کے انسان وہی تو نہیں، جن کا نام غلطی سے ریڈ انڈنیس (لال ہندوستانی) رکھ دیا گیا ہے، جو وہاں کے

[1] نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق صفۃ افریقیۃ والاندلس ص ۴۔ الائیڈن،

اصلی باشندے ہیں،

ابنِ خلدون المتوفی ۸۰۸ھ آٹھویں صدی میں بحرِ محیط کے ایک سفر کا حال لکھتا ہے:
جس میں اہلِ فرنگ کے چند جہاز بحرِ محیط کے کسی جزیرہ میں اتفاقاً پہونچ گئے تھے، چونکہ بحرِ محیط
کے اندر یا انتہا پر جزائرِ خالدات کے علاوہ کوئی اور نام معلوم نہ تھا، اس لئے اُس کے اندر
کی ہر آبادی کو اور خشکی کو جزائرِ خالدات کہہ دیتے تھے، چنانچہ وہ مقدمہ میں کہتا ہے :-

بحرِ محیط میں بہت سے جزیرے ہیں جن میں تین بڑے اور مشہور ہیں، اور کہا جاتا ہے کہ
وہ آباد ہیں، اور ہم کو خبر معلوم ہوئی ہے کہ اس صدی (آٹھویں صدی ہجری چودھویں
صدی عیسوی) کے بیچ میں اہلِ فرنگ کے چند جہاز ادھر سے گذرے، اور انھوں نے
وہاں لوٹ مار کی، اور وہاں کے کچھ باشندوں کو پکڑ لائے، اور مراکش کے سواحل
پر اُن کو بیچا، اور وہاں سے وہ سلطان کے پاس پہونچے، جب ان لوگوں نے عربی سیکھ لی
تو انھوں نے اپنے جزیرہ کا حال بتایا کہ وہ کاشت کاری کے لئے زمین سینگ سے
کھودتے ہیں، ان کے یہاں لوہا نہیں ہے، جو کھاتے ہیں، اور ان کے مویشی بھیڑیں
ہیں، اور لڑائی میں پتھر کے ہتھیار استعمال کرتے ہیں، اور آفتاب کو پوجتے ہیں،

اس کے بعد ابن خلدون کہتا ہے، اور صحیح کہتا ہے.

ولا یوقف علی مکان ھذہ	ان جزیروں کا صحیح پتہ نہیں معلوم،
الجزائر الا بالعثور لا بالقصد	اتفاقاً وہ مل جاتے ہیں، اور بالارادہ
الیھا، (ص ۴۵)	نہیں ملتے،

اس کی وجہ یہ بتاتا ہے کہ جہاز ہوا کا رُخ جاننے اور ستاروں کی سمت معلوم کرنے اور
سواحل کے بحری نقشوں کی مدد سے چلتے ہیں،

وھذا اکلہ مفقود فی البحر المحیط، (صفحہ ۴۵)

اور یہ تمام مسلمان بحرِ محیط میں مفقود ہیں،

اسی لئے جہاز اس کے بیچ میں ہو کر نہیں چلتے، کیونکہ اگر سواحل کا منظر آنکھوں سے دور ہو جائے، تو واپس آنے کی راہ کا بہت کم پتہ چلتا ہے، ساتھ ہی اس سمندر کی فضا میں اور اس کے پانی کی سطح پر اتنے بخارات رہتے ہیں جو جہازوں کو چلنے نہیں دیتے، اور آفتاب کی روشنی پہونچ نہیں پاتی، اسی لئے اس میں راہ پانا، اور اس کا معلوم ہونا مشکل ہے؛

(مقدمہ ص ۴۵)

ان تمام قصوں کو ممکن ہے کہ دلچسپ کہانیوں ہی کی صورت میں تسلیم کیا جاتا لیکن آج کل امریکہ کے کولمبس کی دریافت کی جو تنقیدی تاریخیں لکھی جا رہی ہیں انھوں نے ان کہانیوں کو سنجیدہ تاریخ بنا دینے کی سند پیدا کر دی ہے،

نئی تحقیقات | امریکہ کے انکشاف کی جو تنقیدی تاریخیں وقتاً فوقتاً لکھی گئی ہیں، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ نئی اور پرانی دنیا میں کولمبس سے پہلے سے تعلقات قائم تھے؛ ان تعلقات کی تعمیر میں کون کون قوموں نے حصہ لیا، اس کی دریافت تاریخی اور اثری ذریعوں سے اب تک کی گئی تھی، لیکن ابھی حال میں ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر لیوونیر (Leo Wiener) کی ایک کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی ہے، اس کا نام "افریقہ اور امریکہ کی دریافت" ہے، اس میں نہایت واضح طور سے یہ ثابت کیا گیا ہے، کہ کولمبس امریکہ کا پہلا دریافت کرنے والا ہرگز نہیں، موصوف نے امریکہ میں پرانی آنے والی قوموں کی دریافت کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا ہے، انھوں نے امریکہ کے پرانے باشندوں کی اصلی زبان کی فیلالوجیکل تحقیقات کے ذریعہ

سے یہ پتہ لگایا ہے، کہ امریکہ کے باشندوں کی پرانی زبان وقتاً فوقتاً کن کن زبانوں سے مانوس و متاثر ہوتی رہی ہے، ڈینیر صاحب چھبیس انسانی زبانوں میں بآسانی گفت گو کرسکتے ہیں، اور امریکہ کی پرانی زبان کے بڑے ماہر ہیں، اس کتاب کا خلاصہ انگریزی رسالہ "ورلڈ ٹوڈے" فروری سنہ ۲۶ء میں چھپا تھا جس کا اعتراف المقتطف اگست سنہ ۲۶ء میں اور اردو ترجمہ معارف اگست سنہ ۱۹۲۷ء میں طبع ہوا،

ڈینیر کی تحقیقات کا حیرت انگیز نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امریکہ کی اصلی زبان میں انگریزی فرانسیسی، ہسپانی اور پرتگالی زبانوں سے بہت پہلے جس زبان کے الفاظ ہیں، وہ عربی زبان ہے، یہ الفاظ اُن کی تحقیق کے مطابق سنہ ۱۲۹۰ء کے قریب اس میں داخل ہیں، اور کولمبس نے امریکہ کی دریافت کا شور اس کے ٹھیک دو سو برس بعد مچایا ہے، ڈینیر نے کاغذی دستاویزوں سے ثابت کیا ہے، کہ کولمبس سے پہلے بحر اوقیانوس میں تجارتی جہازرانی ہوتی تھی، مگر تاجر و سوداگر بادشاہوں کے ڈر سے اپنی ان بحری مہموں کو چھپاتے تھے۔

کولمبس کے خود ذاتی بیانات بھی حقیقت کی پردہ دری کرتے ہیں۔ وہ امریکہ کے تیسرے سفر سے واپسی کے بعد بیان کرتا ہے، کہ اسے وہاں زنگی سوڈانی باشندوں سے سابقہ پڑا، بلکہ پہلے سفر کے بعد ہی وہ کہتا ہے، کہ وہاں کے اصلی باشندوں نے اسے گنی (یعنی وہی مغربی افریقہ کے طلائی سکے جس کو ایک خاص مقدار میں تانبہ ملا کر بناتے تھے) دکھائی "گوئنیس" اس وقت کی افریقہ کی زبان میں سونے کے ان ٹکڑوں کو کہتے تھے، جن کو شکل میں سونا ساحل گنی (غنا) سے یورپ میں لایا جاتا تھا، قدرتی طور پر سونے کے یہ ٹکڑے دیکھ کر کولمبس متحیر ہو گیا، کیونکہ وہ دراصل اسی سونے، ہاتھی دانت اور قیمتی سامان کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا، اس نے امریکہ کے باشندوں سے دریافت کیا، کہ انھوں نے ....

وہ سونا کہاں سے پایا، اس کے جواب میں انھوں نے کہا ہم نے یہ سونا کالے سوداگروں سے لیا ہے جو جنوب مشرق سے یہاں آئے تھے"، کولمبس کو گمان ہوا کہ وہ سونے کی اصلی کان بتانے سے گریز کرتے ہیں، تیسرے سفر میں اس نے پھر وہی سوال کیا، اور وہی جواب پایا، در آخر بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ پرانے امریکیوں کے جواب درست تھے، ابتدائی گوئنیس جو فرانسیسی اور پرتگالی گنی ساحل سے لاتے تھے، خالص سونے کے نہیں ہوتے تھے بلکہ غانہ والے اس میں اسی کے برابر تانبہ ملا دیتے تھے، جب کولمبس کی لائی ہوئی گوئنیس کا کیمیائی امتحان کیا گیا تو اس میں سونے اور تانبے کا وہی تناسب نکلا، جو غانہ (گنی) کے لائے ہوئے گوئنیس میں تھا،

یہ طلائی ٹکڑے دراصل افریقیہ ہی سے آئے تھے، ایسے ہی جو حبشی اس کو وہاں ملے وہ افریقہ ہی سے آئے ہوں گے، جہازوں کے کپتانوں کے ہر سفر سے پایا جاتا ہے کہ ان کے لئے غلامی حبشیوں کی موجودگی ضروری تھی، وہ بطور ترجمان استعمال کئے جاتے تھے، کولمبس بھی اُن میں سے چند کو پہلے سفر میں ساتھ لے گیا تھا، امریکہ جا کر اسے معلوم ہوا کہ ایسے حبشی وہاں پہلے سے موجود ہیں، یہی وہ لوگ تھے جن کو جنوب مشرق کے سیاہ سوداگر کہا گیا تھا؛ انہی کے ساتھ غانہ کے سکے امریکہ پہونچے تھے، اور انہی کے ساتھ عربی الفاظ، عربی پودے اور عربی تہذیب وہاں پہونچی،

یہ آثار قدیمہ کے ماہروں کا تنہا بیان تھا، اور اب زبانوں کے محقق بھی اُن کے ساتھ ہو گئے ہیں، اور دونوں کا متفقہ دعویٰ ہے کہ امریکہ میں عربی تہذیب کا اثر کولمبس سے بہت پہلے پایا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نئی دنیا افریقی عربی تمدن سے بہت حد تک متاثر ہو چکی تھی

امریکہ کی پرانی قوموں میں دو ممتاز نام ملتے ہیں، "ازتک" اور "مایہ" جو افریقیہ کی عربی تہذ نی حالتیں، معلوم نہیں اُن کی اصلیت کیا ہے، مگر یہ نام صحیح عربی ناموں کی تحریف معلوم

زدقی ہے، پہلا نام ازد ہے، اور دوسرا نام معاویہ ہے، ازد کی نسبت پہلے ہم لکھ چکے ہیں[۱] کہ یہ لوگ ابتدائے اسلام میں عمان سے افریقہ اور مڈگاسکر کے بحری جہاز راں تھے، اور بہادری سے اپنے جہاز بحر برابرہ میں چلایا کرتے تھے،

بہرحال رسالۂ مذکورہ نیز کی تحقیق کا خلاصہ آگے ان الفاظ میں دیتا ہے :-

" ازٹ اور مایہ کی تہذیبیں وسطی امریکہ میں افریقہ کی عربی تہذیب کی نقلیں تھیں، اور اُن کا زمانہ سنہ ۱۱۵۰ء سے سنہ ۱۲۰۰ء تک قرار دیا جاتا ہے"

ہم نے مغروریں کے سفر کا جو زمانہ لکھا ہے، وہ اسی کے قریب ہوتا ہے،

" عربی تہذیب نویں صدی عیسوی میں اپنے معراج پر تھی، اور سنہ ۱۱۰۰ء میں صحرائے اعظم کو عبور کرکے افریقہ کے مغربی منڈینگو (Minenigo) کا تجارتی صوبہ قائم کرچکی تھی، اس کے مقابل میں امریکہ کا صوبہ میچوکن[۲] (Michoacan) تھا، جو خلیج میکسیکو کے ساحل پر واقع تھا، عربی الفاظ کی آمیزش سب سے پہلے میچوکن میں پائی جاتی ہے، اور وہ الفاظ منڈینگو کی زبان میں ملتے ہیں، اور یہ امر خاص طور پر ذکر کے قابل ہے، کہ یہ الفاظ ایسے ہیں کہ جو ایک تجارتی کارندہ یا سیاح استعمال کرتا ہے" مثلاً جادو، اور مذہب اور نظام حکومت کے متعلق، یہ نتیجہ کہ منڈینگو اور میچوکن کے درمیان آمد و رفت بھی لابدی ہے، ہر طرح تازہ تحقیقات سے اس کی تائید ہوتی ہے؛ ازٹ اور مایہ کی تہذیبوں کا یک لخت انحطاط اس کا ایک اور ثبوت ہے، چونکہ یہ ایک طرح کی نوخیز تہذیبیں تھیں، جس وقت ان کا اپنے اصلی مرکز سے قطع تعلق ہوگیا، اُن میں تنزل آنا شروع ہوگیا، یہ امر کہ یہ تعلق صرف تجارتی تھا، اس بات سے ثابت ہوتا ہے، کہ عربی تہذیب کا اثر میچوکن میں داخل ہوکر صرف تجارتی راستوں کے آس پاس ہی

---

[۱] عربوں کی جہاز رانی ص ۷۶، [۲] میکسیکو میں ایک ریاست بحرالکاہل [illegible] ہے -

پایا جاتا ہے، اور یہ صرف خالص عربی کا اثر تھا"

اگر مسٹر وینیر کی ان لسانی تحقیقات کے نتائج درست ہیں، تو ہم نے اُن کی تصدیق کے لیے جو مقدمات گذشتہ صفحوں میں فراہم کیے ہیں، وہ بھی قابلِ قبول ہیں،

پرانے عربوں کی امریکہ میں آبادی

اس نظریہ کو سُن کر لوگوں کا بجا سوال تھا کہ اگر یہاں کولمبس سے پہلے عربوں کی آمد و رفت تھی، تو امریکہ میں اُن کے نشانات کیوں نہیں ملتے، اور اُن کی کسی نوآبادی کا پتہ یہاں کیوں نہیں لگتا، مگر خدا کی قدرت دیکھیے کہ عین اس وقت جب یہ سطریں زیرِ تحریر تھیں، امریکہ کے عربی اخبار "الہدی" نے ایک نیا انکشاف دنیا کے سامنے پیش کیا، جس کی صدائے بازگشت سے دنیا گونج گئی، اور خود ہندوستان کے اردو اخبارات نے اس کے اقتباسات دسمبر ۱۹۳۰ء میں شائع کیے، براعظم امریکہ میں وہاں کی مہذب ریاستوں اور متمدن ملکوں کے علاوہ بہت سے ایسے پہاڑی مقامات، جنگل اور گانوں ہیں، جہاں اس براعظم کے پُرانے باشندے آباد ہیں، اور جو اب تک اپنی وہی پرانی قبائلی زندگی بسر کر رہے ہیں، اور جہاں تک اب تک کسی یورپین سیاح کے قدم نہیں پہونچے ہیں، خصوصیت کے ساتھ یہ مقامات مکسیکو کے علاقہ میں زیادہ ہیں، اخبارات راوی ہیں[1]،

"ایک شامی عرب تاجر مکسیکو کے چاپاس اور ہٹاسلا کے صوبوں میں پھیری کر کے سوداگری کا مال بیچتا تھا، حال میں اتفاقاً اس کا گذر ایک کوہستانی علاقہ میں ہوا، جہاں آمد و رفت جاری نہیں تھی چلتے چلتے ایک جنگل میں پہونچا، وہاں ایک

---

[1] المقطم دسمبر ۱۹۲۰ء و المسار مورخہ ۲۷ر شعبان ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۶ر جنوری ۱۹۳۱ء و پیام کلکتہ مورخہ ۲۸ر دسمبر ۱۹۳۰ء،

قبیلہ دیکھا، رات ہو چکی تھی، سوداگر نے اپنی زبان میں ان جنگلی باشندوں سے شب بھر رہنے کی درخواست کی، اس کے جواب میں ایک شخص نے عربی میں کہا کہ ہم لوگ تمھاری بولی نہیں سمجھتے، عرب سوداگر اس جنگل میں عربی زبان سُن کر حیرت میں آگیا، اُس نے اُن سے عربی میں گفتگو کی، اور انھوں نے کہا کہ وہ صدیوں سے اس جنگل میں آباد ہیں، اور عربی کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں جانتے۔"

سوداگر مذکور کا بیان ہے کہ یہ قبیلہ اب تک اپنے عربی رسم و رواج پر قائم ہے،" [الف] ...لص عرب ہے، یہ خبر مکسیکو کی حکومت کو معلوم ہوئی، تو اس نے ایک کمیشن اس عرب قبیلہ کی تحقیقِ حال کے لئے روانہ کیا ہے۔

یہ قبیلہ چار سو برس سے زیادہ سے یہاں آباد ہے، اور دوسرے ہمسایہ قبیلوں سے الگ الگ زندگی بسر کرتا ہے۔

اس خبر سے عرب جغرافیہ نویسوں کے بیانات اندلس، اور پرتگال کے عرب "مغرورین" (غریب خوردہ جہاز رانوں) کی کہانیوں کی تصدیق ہوتی ہے،

اس سلسلہ کی اخیر خبر یہ ہے کہ لبنان کے عیسائی فاضل انطون یوسف بشارہ نے جنھوں نے مکسیکو میں سکونت اختیار کر لی ہے، مصر کے اخباروں میں پچھلے سال یہ اطلاع شائع کی ہے، الفتح مصر مورخہ ۳۰ رجمادی الاولیٰ ۱۳۵۴ھ ص ۲۴۶ میں چھپی ہے، کہ وہ مکسیکو میں اپنا این واقع ریو کرسی (مکسیکو) میں کھدائی کرا رہے تھے، کہ ان کو دو معدنی ٹکڑے ملے جو لمبس کے بعد عربی سکے ثابت ہوئے، اس دریافت کا وہاں کے علمی حلقوں میں ... چا ہے،

لمبس اور امریکہ	یہ تحقیق تو الگ رہی: مشہور یوں ہی ہے کہ کولمبس پہلا شخص ...

جس نے اس نئی دنیا کو پرانی دنیا سے ملایا مگر اُس نے جو کچھ پایا اتفاقیہ پایا کہ ع

آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے،

کولمبس ہندوستان اور چین کی تلاش میں تھا کہ امریکہ پہونچ گیا، کسی علمی

استدلال سے وہ اس نتیجہ پر نہیں پہونچا، اور بقول ایک اطالوی عالم ہیئت اور

مستشرق کرلونلینو کے کہ "کولمبس عربوں کی مقدار مسافت اور میل کے صحیح انداز

کے نہ جاننے کی مبارک غلطی سے امریکہ پہونچ گیا"۔ فاضل اطالوی عالم کی اصل عبارت

عربی کا ترجمہ یہ ہے:۔

"لاطینی کتابوں کے عربی ترجموں کے ذریعہ سے مامون نے ایک درجہ فلکی

کی پیمایش کا جو اندازہ نکالا تھا یعنی ۵۶ ۲/۳ میل، وہ یورپ میں بھی

مشہور ہوا۔ اور جس طرح یونانی اور سریانی کتابوں کے عربی ترجمہ کے

ذریعہ سے یونانی میل کی مقدار نہ جاننے سے اہلِ عرب نے غلطی کی اسی

طرح چودہویں صدی اور پندرہویں صدی میں عربی میل کی صحیح مقدار نہ

سمجھنے کے سبب سے اہلِ یورپ غلطیوں میں مبتلا ہوگئے، انہی میں کرسٹوفر

فرکولمبس امریکہ کا پتہ لگانے والا بھی تھا اُس نے ایک درجہ کے ۵۶ ۲/۳ عربی

میل کو لاطینی ۵۶ ۲/۳ سمجھ کر مغربی یورپ اور ایشیا کے مشرقی سواحل کی

مسافت اس سے بہت کم سمجھی جو حقیقت میں ہے، اگر یہ غلطی نہ ہوتی، تو کبھی

ممکن نہ تھا، کہ مغربی یورپ سے اوقیانوس میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں

بیٹھ کر چند مہینوں کی خوراک لے کر چین پہونچنے کا تخیل کرتا۔

آخر اس سفر سے رُک کر وہ اس غلطی کی بدولت امریکہ کے جدید

براعظم میں پہونچ گیا، جس نے ایک نئے انسانی دور ترقی کا آغاز کیا، یہ غلطی کیسی مُبارک تھی، جس نے دنیا کو عظیم الشان فوائد سے مالامال کردیا،[۱]

کولمبس اس وقت ظاہر ہوا جب اہلِ اسپین اندلسی عربوں سے آخری لڑائی لڑ رہے تھے، اور ان کو اپنے ملک سے نکال رہے تھے اس کا زمانہ اسپین اور پرتگال میں گذرا، ایک معمولی سیّاح سے جہازراں تک پہونچا، وہ ہیئت جغرافیہ اور سفرنامہ کی کتابیں پڑھا کرتا تھا، ایک اسپینی خاتون سے شادی کی، اس ذریعہ سے اسپین کے ایک عیسائی خانقاہ کے جغرافیہ داں راہب سے ملا، پھر اس کا پیشہ یہ ہوگیا کہ وہ جہازرانوں کے لئے بحری نقشے تیار کرکے فروخت کرتا تھا، اور بحری مسافروں اور جہازرانوں سے معلومات جمع کرتا تھا، مین اسی عربی اور اسپینی لڑائی کے زمانہ میں وہ ملکۂ اسپین سے نئے جزیرہ، اور نئے بحری راستوں کے لئے مدد کا طالب ہوا، اس زمانہ میں اسپین اور پرتگال کے عیسائی موروں (مسلمان عربوں) کو نہ صرف اسپین بلکہ تمام سواحل وجزائر سے نکالنے کے لئے ہر طرف بحری بیڑے بھیج رہے تھے، سواحل بحرِ محیط سے لیکر سواحل افریقہ سے یہاں تک کہ عرب اور ہندوستان کے سواحل تک سے عرب جہازرانوں کو لڑا لڑا کر نکال رہے تھے، اور اُن سے بحری نقشے حاصل کرتے تھے، وہ سونے کی کان والے افریقی ساحل تک بھی گیا تھا، جہاں افریقی اور زنگی ملّاح بکثرت پرتگالیوں کو ملتے تھے،

---

[۱] خطبات علم الفلک عند العرب ص ۲۹۳۔

بہرحال اس زمانہ میں یورپ اور خصوصاً اسپین اور پرتگال میں علم ہیئت، ہندسہ، جغرافیہ اور بحری سفر کے معلومات جو کچھ تھے، وہ عربی تصنیفات، یا اُن کے تراجم کے ذریعے تھے، جیسا کہ اس عہد کی تاریخوں میں مورخین نے بیان کیا ہے، اور اس طرح کولمبس اپنے نظریہ کی ترتیب و تکمیل میں تمام تر عربوں ہی کی تحقیقات سے مستفید ہوا،

(معارف مارچ و اپریل ۱۹۳۹ء)

اسلامی رصد خانے

رصد خانہ جس کو انگریزی میں (observatory) کہتے ہیں، نہایت قدیم چیز ہے، ایک خاص قسم کی بلند عمارت ہوتی ہے، جس میں حسب موقع سیکڑوں چھوٹے بڑے آلات نصب ہوتے ہیں، جن سے ستاروں کی گردش، حرکت، طلوع، غروب، مقام، مدتِ گردش، ستاروں کی باہمی نسبت وغیرہ دریافت ہوتی ہے، علم ہیئت (اسٹرانومی) کے تقریباً اکثر مسائل کی بنیاد انہی رصدوں کی تحقیقات و مشاہدات پر مبنی ہے، اس قسم کی چیزوں کی ابتدا دریافت کرنا، جس کی ابتدا تاریخ کی تاریکی میں گم ہو، ایک بے سود کوشش ہے، اس عام قاعدے کی رو سے کہ ہر شے بتدریج ترقی کرتی ہے، یہ خیال ہوتا ہے کہ پہلے رصد کے لئے آلات نہ ہوں گے، صرف آنکھوں سے روشن ستاروں کے حالات دریافت کئے گئے ہوں گے، رفتہ رفتہ کچھ آلات ایجاد ہوئے ہوں گے، ان میں بعض آلات ایسے ہوں گے جو بآسانی ہر جگہ منتقل نہیں ہو سکتے ہوں گے، اس لئے ان آلات کے لئے ایک خاص مکان بنایا گیا ہوگا، جس میں یہ آلات بحفاظت تمام رکھے جا سکیں؛ رفتہ رفتہ اُس نے ایک منتظم رصد خانہ کی حیثیت پیدا کر لی،

سب سے قدیم رصد خانہ جس کا تاریخ میں ذکر ہے، میتون کا رصد خانہ ہے، جو سنہ ۴۳۲ ق م

قبل حضرت مسیح قائم کیا گیا تھا، اسی رصد خانہ میں سب سے پہلے مدار صیفی کی تعیین کی گئی، اور اس آلہ کا استعمال ہوا، جس کو قائمہ (ہیلومیٹر) کہتے ہیں[۱]، اس کے بعد تیمور خارس، منالاؤس اور جس نے رصد خانے قائم کئے، لیکن مسلمانوں سے پہلے سب سے مشہور رصد خانہ اسکندریہ کا رصد خانہ ہے جس کا منتظم بطلیموس تھا، بطلیموس پہلا شخص ہے جس نے ایک منتظم رصد خانے کی بنیاد ڈالی، رصد کے بعض ضروری آلات ایجاد کئے، اور فیثاغورث کے خلاف زمین کو کائنات کا مرکز قرار دیا،

یورپ میں رصد خانے کی ابتدا پندرہویں صدی سے ہوتی ہے، ابتدائی رصد خانہ والتھورس کا ہے، جو نورمبرگ میں قائم کیا گیا تھا، یہ پہلا رصد خانہ ہے، جہاں گھڑی کا استعمال ہوا،

اس کے بعد مشہور عالم ہیئت ٹائیکو براہی نے ۱۵۷۶ء میں اورمبرگ (ڈنمارک) میں رصد خانہ قائم کیا، اور اس کے لئے بہت سے جدید آلات خود ایجاد کئے، اس کے بعد برابر رصد خانے قائم ہوتے رہے، جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، ہندوستان میں بھی اسلام سے پہلے بعض رصد خانوں کا پتہ چلتا ہو جن میں سب سے زیادہ مشہور راجہ بکرماجیت کا رصد خانہ ہے،

مسلمانوں میں رصد خانے کی بنیاد تیسری صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے، جب مامون اعظم سریر آرائے خلافت تھا، اسلامی رصد خانے کی تاریخ سے پہلے اسلامی آلات رصد کے متعلق ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں،

---

[۱] دائرۃ المعارف ج ۸ صفحہ ۲۳۳،

مسلمانوں نے آلاتِ رصد کا بنانا صابیوں سے سیکھا۔ صابیوں کا مشہور شہر حران اسلامی فتوحات میں شامل ہو چکا تھا، وہاں آلاتِ رصد کثرت سے بنتے تھے، عباسیہ کے زمانے میں علوم و فنون کے ساتھ آلات سازی کو بھی ترقی و اشاعت ہوئی، مامون نے جب رصد خانہ قائم کرنا چاہا تو ابن خلف مروزی نے ذات الحلق (رصد کا ایک مشہور آلہ) بنایا، جو چوتھی صدی تک بغداد کے بعض علماء کے پاس محفوظ تھا،[۱]

علامہ ابنِ ندیم نے جو چوتھی صدی میں تھے، اپنے زمانے تک کے ماہرین آلات کے یہ نام بتائے ہیں، ابن خلف مروزی الفزاری ابنِ خلف کا غلام علی بن عیسیٰ، علی بن عیسیٰ کے غلام احمد بن خلف اور محمد بن خلف، احمد بن اسحاق حرانی، ربیع بن فراس حرانی خفیف کے غلام قسطسطوس اور علی بن احمد، محمد بن سشدا والبلدی، علی بن سورہ حرانی نطلوس کے غلام شجاع اور عجلی، عجلیہ بنت عجلی، جابر بن سنان حرانی، سنان بن جابر حرانی فراس ابن حسن علی بن احمد کا غلام حامد بن علی، ابنِ نجبہ حسین البوقی۔

ان ناموں کی طویل فہرست سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں میں علمِ ہیئت کا عالمگیر شوق تھا جس میں عورت مرد، غلام آقا سب مساوی حصہ لیتے تھے، ابتدائی زمانہ میں نو تشاگر آلات رصد کے سب سے زیادہ مشہور صناع تھے، ابو حامد صاغانی المتوفی ۳۷۹ھ الاتِ رصد کے بنانے میں کمال رکھتا تھا۔

چوتھی صدی کے بعد سب سے بڑا ماہر آلات خازن مرزانی، المتوفی ۳۰۰ھ (؟)

[۱] کتاب الفہرست ص ۲۸۴ و ۲۸۵

خازن ایک مدت تک مصر اور اندلس میں رہا ہے، اور علم نور کی اُس نے تحقیق کی ہے، آلاتِ رصد کے بیان اور ساخت میں اوس نے ایک مستقل رسالہ کتاب آلات العجیبہ الرصدیہ لکھا ہے، تیرہوین صدی عیسوی میں ابنِ راجل بھی ایک مشہور آلات ساز گذرا ہے، اور اس کی تصنیف جو آلات سازی کے متعلق ہے ۱۸۳۵ء میں فرنچ میں ترجمہ ہوکر پیرس میں دو جلدوں میں چھپا ہے؛[1]

ابن النبدی جو ابتدائی گیارہوین صدی عیسوی میں تھا، ایک مشہور آلاتِ رصد بنانے والا تھا، مصر کے شاہی کتب خانے کی جب فہرست مرتب کی جانے لگی تو ابوالقاسم علی وزیر مصر کے حکم سے کتبِ ہئیت اور آلاتِ رصد کی فہرست اسی نے مرتب کی تھی، ابن النبدی ۱۰۴۰ء میں مصر میں موجود تھا،

خلیفہ مسترشد کے زمانہ میں بدیع اسطرلابی مشہور آلات ساز تھا جس نے آلات سازی کی بدولت بے شمار دولت جمع کی تھی ۵۳۴ھ میں اس نے وفات[2] پائی،

اندلس کے مسلمانون نے ہئیت میں جو ترقی کی اس کی بہت کم یادگار باقی ہے، اس لئے صرف اسی کا افسوس نہیں ہے، کہ اندلس کے مسلمان مٹا دیئے گئے، بلکہ سب سے زیادہ افسوس اس کا ہے کہ اُن کی تصنیفات اور ان کی یادگاریں بھی مٹا دی گئیں، اس لئے اندلس کے آلاتِ رصد اور رصدخانون کے متعلق بہت کم معلوم ہے،

گیارہوین صدی عیسوی کے اختتام پر زرقال اندلس کا ایک مشہور آلاتِ ہئیت

---

[1] اکتفاء القنوع ص ۲۴۹

[2] فوات الوفیات کتبی جلد ۲ ص ۳۹۰؛

بنانے والا تھا جس نے مامون شاہ طلیطلہ کے لئے ایک اسطرلاب بنایا تھا، اور اشبیلیہ میں ابن عباد کے نام سے آلات ہیئت کے متعلق ایک کتاب تالیف کی جس کا نام عبادیہ رکھا، علم ہیئت میں اس کی بہت سی جدید تحقیقات ہیں،

مسلمانوں کی بڑی بڑی جامع مسجدوں میں ایک عہدہ موقت کا ہوتا تھا جس پر بڑے بڑے ہیئت دان مامور کئے جاتے تھے، موقت کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ نماز کے صحیح وقت مؤذن کو بتایا کرتا تھا، غرناطہ کی جامع مسجد کا موقت ابن باظہ مثلی تھا، یہ آلات رصد ایسے مضبوط اور خوبصورت بناتا تھا کہ لوگ اُن کو بڑی بڑی قیمتوں میں خریدتے تھے، ابن باظہ نے آلات رصد سازی کا فن اپنے والد حسن سے سیکھا تھا جو اس فن میں نہایت استاد تھا[۵۱]

قسطنطنیہ میں شیخ غرس الدین احمد المتوفی ۹۷۱ھ علم ہیئت کے مشہور آلات ساز تھے، تمام آلات رصد خود اپنے ہاتھ سے بناتے تھے، اس زمانہ تک کے علماء کا ہاتھ ملوار سے آشنا تھا، سلطان مصر اور چراکسہ مصر میں جب جنگ ہوئی تو شیخ غرس الدین اس جنگ میں شریک تھے[۵۲]

ہندوستان میں علامہ تفضل حسین خان المتوفی ۱۲۱۵ھ اور اُن کے شاگرد دبیر الدولہ خواجہ فرید الدین المتوفی ۱۲۴۴ھ علم ہیئت آلات رصد میں نہایت کمال رکھتے تھے، دبیر الدولہ کے چھوٹے بیٹے نواب زین العابدین جر ثقیل اور رصد کے ہر قسم کے آلات کرہ، اصطرلاب، ذات الحلق، ذات الحلق، ربع مجیب، المزول وغیرہ اپنے

---

۵۱ الاحاطہ باخبار غرناطہ ص ۵ ۸ ؛ ۵۲ الشقائق النعمانیہ ج ۲ ص ۱۳۹

ہاتھ سے نہایت خوب بناتے تھے اور ان کا وہ کمرہ جس میں وہ آلات رکھتے تھے، ایک رصدخانہ معلوم ہوتا تھا[1]،

ان بزرگوں کے علاوہ نصیر طوسی، علی برجندی، ابن شاطر، تقی الدین، غیاث الدین جمشید، غلام حسین جونپوری وغیرہ آلات سازی میں نہایت کامل الفن استاد تھے جن کی گو اس وقت کوئی عملی یادگار موجود نہیں ہے، مگر تاریخ اور اُن کی تصنیفات خود اس کی شاہد ہیں، مسلمانانِ اندلس کے بنائے ہوئے بعض آلات اب تک بعینہ یورپ میں موجود ہیں انہیں میں سے ایک وہ کرہ ہے، جو ڈرلیسڈن کے عجائب خانہ میں سکسونیا (جرمنی) میں محفوظ ہے،

اسی سلسلہ میں ہم کو اُن آلاتِ رصد کا بھی تذکرہ کرنا چاہیے، جن کو خاص مسلمانوں نے ایجاد کیا ہے، اور وہ پہلے مستعمل نہ تھے، ہم اس قسم کے آلات کا حال ذیل کے بیان میں لکھتے ہیں، :-

لبنہ | یہ آلہ نصیر الدین طوسی المتوفی ۶۷۲ھ کی ایجاد ہے۔ اس سے میل کلی عرض البلد اور ستاروں کا بعد دریافت کیا جاتا ہے، سب سے پہلے مراغہ کی رصدگاہ میں اس کا استعمال ہوا، نمبر ایک کے نقشہ سے اس کی صورت ذہن نشین ہو جائے گی،

ذات الاوتار | اس آلے کے ذریعہ تحویل اعتدال اور تحویل لیل دریافت کی جاتی ہے، اس آلہ کے موجد علامہ تقی الدین شامی ہیں، جو سلطان مراد کے زمانہ میں موجود تھے سدرۃ المنتہیٰ الافکار، ہیئت اور آلاتِ رصد کے بیان میں، علامہ تقی الدین کی ایک لطیف تصنیف ہے،

---

[1] سیرت فریدیہ ص ۱۱، ۹۔ ۲۲، ۵۲، جامع بہادر خانی ص ۵۰۲۔

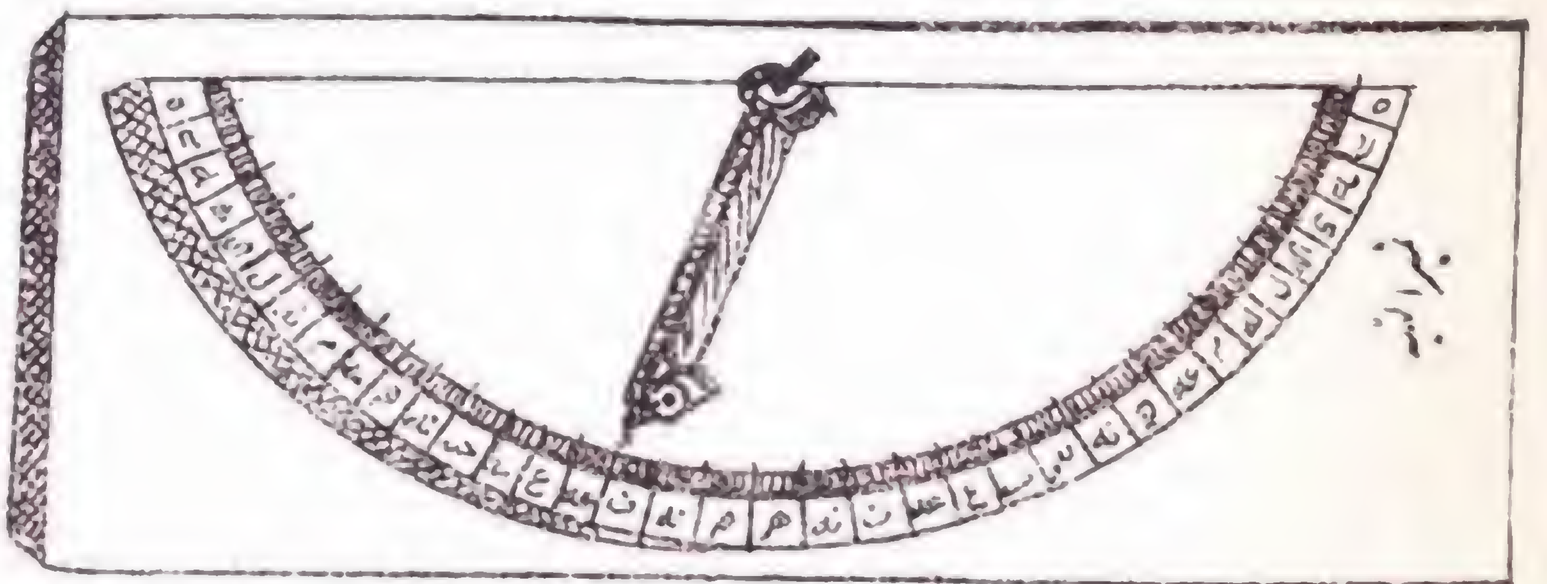
ذات السمت والارتفاع | یہ ایک نصف دائرہ کا حلقہ ہوتا ہے جس کا قطر ایک متوازیۃ السطوح اسطوانہ کی ایک سطح پر ہوتا ہے، اس آلہ سے سمت اور سمت کا ارتفاع ظاہر ہوتا ہے، علامہ تقی الدین نے سدرہ میں لکھا ہے، کہ یہ مسلمانوں کی ایجاد ہے،

مشبہ بالمناطق | یہ آلہ بہت سے مفرد آلات سے مرکب ہوتا ہے، اس سے دو ستاروں کے درمیان کا بعد دریافت ہوتا ہے، یہ آلہ بھی علامہ تقی کا نتیجۂ فکر ہے،

ربع تام | ربع تام ابن شاطر المتوفی ۷۷۷ھ کی ایجاد ہے، ابن شاطر دمشق میں موقت تھا، اُس نے اپنے رسالہ النفع العام میں جو آلۂ ربع تام کے بیان میں ہے، یہ لکھا ہے کہ

"چونکہ میرے نزدیک اکثر آلات رصد ناقص ہیں، اس لئے میں نے یہ آلہ بنایا ہے جو تمام آلوں سے زیادہ مکمل ہے، صرف ایک آلہ سے تمام اعمال رصدی کا ہر مقام پر استخراج ہو سکتا ہے"[1]

سدس فخری | ہر نجی حلقہ سے بنا ہوا ایک آلہ ہوتا ہے، جس سے میل کلی اور عرض بلد دریافت ہوتا ہے: یہ آلہ فخر الدولہ کے زمانہ میں ایجاد ہوا ہے، اسی مناسبت سے اس کو سدس فخری کہتے ہیں، نمبر ۲ کے نقشہ سے اس کی صورت ظاہر ہو گی،[2]



---

[1] کشف الظنون ج اص ۲، ۱۳۰ و ۱۳۷ میں ان آلات کا بیان دیکھو،

عصا یا اصطرلاب خطی | قدیم ہیئت کے لحاظ سے ہر ستارہ کی گردش دائرے کی شکل میں

تھی، اس لئے ستاروں کے مدار جاننے کے لئے ایک گول کرہ بنایا جاتا ہے، جس پر ستاروں کے مدار اور اُن کی حرکت سے جو دائرے وغیرہ پیدا ہوتے ہیں، منقوش رہتے ہیں، بطلیموس سے پہلے یہ مدارات و دوائر مجسم کروں میں بنتے تھے، بطلیموس نے اس مقصد کو اصطرلاب میں صرف چند سطحوں سے پورا کر دیا۔

اصطرلاب یونانی لفظ ہے، جس کے معنی میزان الشمس یا ترازوئے آفتاب کے ہیں، اصطر کے معنی ستارے کے ہیں، اسٹرانومی جس کے معنی علم ہیئت کے ہیں، اسی اصطر سے مشتق ہے، مسلمانوں میں اصطرلاب کا استعمال ماموں کے عہد سے شروع ہوا، سب سے پہلا اصطرلاب ابراہیم بن حبیب فرازی نے تیار کیا[1]، ہندوستان میں اصطرلاب کا رواج ہمایوں نے دیا، ہمایوں علم ہیئت میں نہایت ماہر تھا، اُس نے ایک خاص طرز کا اصطرلاب بنایا، جس کو اصطرلاب ہمایونی کہتے ہیں، چنانچہ ندوہ کے کتب خانہ میں جو ایک قدیم اصطرلاب ہے، اس پر یہ عبارت کندہ ہے :۔

"عمل ضیاء الدین محمد بن قائم محمد بن ملا عیسیٰ بن شیخ الہدا د اصطرلابی ہمایونی لاہوری فی سنہ ۱۰۵۶ھ"

بطلیموس سے لے کر پانچویں صدی ہجری تک کرہ اور اصطرلاب کا کام صرف جسم یا سطح ہی سے لیا جاتا تھا، پانچویں صدی کے آخر میں شیخ شرف الدین طوسی پیدا ہوئے، جو ہندسہ و ہیئت میں امام فن تھے، شیخ موصوف کو یہ خیال پیدا ہوا، کہ کرہ مجسم اور اصطرلاب سطحی کا کام ایک خط سے بھی لیا جا سکتا ہے، اور اس خیال کی بنا پر ایک آلہ ایجاد کیا جس کا

---

[1] ابن ندیم ص ۳۷۶:

نام عصایا اصطرلاب خطی رکھا، جس سے اصطرلاب سطحی کے تمام کام لئے جا سکتے تھے، جیسا کہ معلوم ہے، کہ ہر ایجاد پہلے نامکمل ہوتی ہے، اس عصا میں بھی بعض غلطیاں رہ گئی تھیں جن کی اصلاح شیخ کے شاگرد رشید علامہ کمال الدین المتوفی ۶۳۹ھ نے کی لیکن عملی صورت میں اس کا محقق طوسی نے استعمال کیا۔[۱]

ان مذکورۂ بالا بیانات سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ مسلمانوں نے آلات رصد کے بنانے میں کس حد تک کوشش کی، اور اس کی بڑی دلیل ان عظیم الشان رصد خانوں سے ملتی ہے، جو اسلامی ملکوں میں وقتاً وقتاً قائم ہوتے رہے، سب سے پہلا اسلامی رصد خانہ جیسا کہ عام طور سے معلوم ہے، رصد مامونی ہے۔

رصد مامونی بغداد

مامون جب تخت نشین ہوا، اور تمام دنیا کے اہل کمال سمٹ کر بغداد میں جمع ہو گئے، اور بطلیموس کی مجسطی کا ترجمہ ہوا، تو مامون نے اس رصد خانے کے بنانے کا حکم دیا، بغداد کے قریب ایک مقام شماسیہ ہے، وہاں کی زمین اس رصد خانہ کے لئے منتخب کی گئی، اور ۲۱۴ھ میں یہ رصد خانہ بن کر تیار ہوا۔ لیکن ۲۱۸ھ میں مامون کا انتقال ہو گیا، اس کا جانشین معتصم ایک سپاہی آدمی تھا، یہاں اس کی تحقیقات کا سلسلہ صرف چند سالوں تک جاری رہا، یحییٰ بن ابی منصور اس رصد خانے کا افسر تھا،[۲] جس کے ماتحت عباس بن سعید جوہری، سند بن علی، حبش بن عبد اللہ مروزی، عمر بن محمد مروزی وغیرہ کام کرتے تھے۔[۳] اس رصد خانے میں ان لوگوں نے جو تحقیقاتیں کیں وہ زیج مامونی کے نام سے چند کتابوں میں جمع کر دی گئی ہیں، ان میں سے چند مسائل یہ ہیں:۔

---

[۱] ابن خلکان ص ۵۰۵ جلد دوم [۲] مختصر الدول ابو الفرج ملطی ص ۲۴۸، [۳] ابن ندیم ص ۲۷۶، ۲۷۵، ۲۷۲،

(۱) معدل اور منطقۃ البروج کے تقاطع سے جو زاویہ پیدا ہوتا ہے اس کو اعوجاج منطقۃ البروج کہتے ہیں، اس رصد خانہ میں اعوجاج منطقۃ البروج ۲۳ درجہ ۳۳ دقیقہ اور ۲۵ ثانیہ دریافت کیا گیا تھا، جو موجودہ تحقیقات کے نہایت قریب ہے، موجودہ تحقیقات کے روسے یہ زاویہ ۲۳ درجہ ۲۷ دقیقہ ہے،

(۲) وہ دو نقطے جہاں معدل النہار اور منطقۃ البروج کا تقاطع ہوتا ہے، اُن کو نقطہ اعتدال کہتے ہیں، نقطہ اعتدال کی تحقیق سے شمسی سال کے دنوں کی تعداد تقریباً نہایت صحت کے ساتھ دریافت کی گئی،

(۳) نقطہ اعتدال کی نسبت اگرچہ فرض کیا گیا ہے کہ وہ اپنی ایک جگہ پر قائم رہتے ہیں، لیکن درحقیقت یہ ہر سال ۵۰ ثانیہ آگے بڑھ جاتے ہیں، اس حرکت کا نام استقبال اعتدالین ہے، اس رصد خانے میں استقبال اعتدالین بھی دریافت کیا گیا تھا،

(۴) آفتاب کے مقامات اوج اور مقدار میل اور خروج مرکز بھی یہیں تحقیق کی گئی،

(۵) ثوابت اور سیاروں کے بعض حالات بھی یہاں دریافت ہوئے،

رصد مامونی دمشق

تحقیقات رصدیہ کی تحقیق کے لئے عموماً مختلف مقامات پر چند رصد خانے بنائے جاتے ہیں، تاکہ اگر کل رصد خانوں کا کسی ایک تحقیق پر اتفاق ہو جائے، تو وہ مسئلہ نہایت صحیح تسلیم کر لیا جائے، بغداد کے رصد خانے کی تصحیح کے لئے دمشق میں کوہ قاسیون کے دامن میں بھی مامون نے ایک رصد خانہ بنوایا تھا، غالباً اس کا سنہ تعمیر بھی بغداد کے رصد خانے کے موافق ہوگا (مختصر الدول ملطی ص ۲۴۰)

رصد دینوری

علامہ ابوحنیفہ احمد بن داؤد دینوری تیسری صدی میں ادب، تاریخ، ہندسہ، جبر و مقابلہ اور ہیئت کے امام تھے، تاریخ میں الاخبار الطوال اُن کی مشہور تصنیف ہے، ہندسہ اور ادب میں بھی اُن کی بعض تصنیفات ہیں، سنہ ۲۳۵ھ میں ابوحنیفہ نے اصفہان میں ایک رصدخانہ قائم کیا، اس رصدخانہ میں ابوحنیفہ نے جو تحقیقات کی، اُس کو ایک زیچ (کتاب الرصد) کی صورت میں مرتب کر دیا، بعض مورخین نے لکھا ہے کہ ابوحنیفہ نے یہ زیچ رکن الدین دیلمی کے نام پر لکھی تھی، لیکن یہ بالکل غلط ہے، کیونکہ دیلمیوں کا خاندان چوتھی صدی میں سنہ ۳۲۰ھ کے بعد سے شروع ہوتا ہے، اور ابوحنیفہ کا انتقال اس سے چالیس برس پہلے سنہ ۲۸۱ھ میں ہو چکا تھا،

رصد بتّانی

محمد بن جابر بتانی المتوفی سنہ ۳۱۷ھ کا شمار دنیا کے ان بیس علمائے ہیئت میں ہے، جن کی نسبت یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ انھوں نے علم ہیئت کی سب سے زیادہ خدمت کی ہے، اس زمانہ میں رقہ اور انطاکیہ میں دو بڑے رصدخانے تھے، بتانی نے انہی دونوں رصدخانوں میں سنہ ۲۶۴ سے سنہ ۳۰۶ھ تک ۴۲ برس تک ستاروں کا مطالعہ کیا ہے، بتانی نے اپنے اکتشافات کو ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے،

یہ کتاب لاطینی میں ترجمہ ہو کر سنہ ۱۵۳۷ء میں نورمبرگ سے شائع ہو چکی ہے، ان رصدخانوں میں بتانی نے جو جدید اکتشافات کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں،

۱۔ بطلیموس نے جس طرح آفتاب کے نئے معلومات نکالے ہیں، اسی طرح بتانی نے

چاند کے لئے بھی معادلتین ثابت کئے،

۲- مدار کا جو نقطہ آفتاب سے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے اس کو نقطۃ الراس کہتے ہیں اور جو سب سے زیادہ دور ہوتا ہے اُس کو نقطۃ الذنب کہتے ہیں، تبانی نے جدید انکشاف یہ کیا کہ یہ نقطے ایک جگہ نہیں رہتے، بلکہ ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں،

۳- قیمہ مبادرۃ الاعتدالین کی اصلاح کی،

۴- دائرۂ معدل النہار پر دائرۃ البروج کی قیمت میل کی تصحیح کی،

۵- شمسی سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۲۴ منٹ کا قرار دیا ہے[1]

رصد بوزجانی

بوزجان ہرات اور نیشاپور کے درمیان ایک چھوٹا سا شہر ہے، محمد بن محمد بوزجانی وہیں کا رہنے والا تھا، اس کا نام ابوالوفا ہے، ہیئت میں یہ سب سے زیادہ مشہور ہے، ۳۲۸ھ میں پیدا ہوا، ۳۷۶ھ میں وفات پائی، بوزجانی کے رصد خانے کی نسبت ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کہاں قائم تھا، مگر یہ معلوم ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنے اور چند ساتھیوں کے ساتھ رصد خانے میں تحقیقات کرتا رہا ہے، جیسا کہ حاجی خلیفہ کی اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے،

[illegible]	زیج الشامل، شیخ ابوالوفا محمد بن احمد
[illegible]	بوزجانی کی تصنیف ہے ... جس کی
[illegible]	تصحیح شیخ موصوف نے اپنے اور چند
[illegible]	ساتھیوں کے ساتھ اپنے اُن مشاہدات

---

[1] [illegible]

صدرات منھو بعد رصد المامون،	تجربوں اور رصدوں سے کی ہے، جن کو رصد مامون کے بعد انھوں نے جاری کیا،
(جلد ۲ - ص ۱۵)	

بوزجانی کی اس زیچ کی شرح جس کی تصحیح ادس نے اپنے رصد خانے میں کی تھی، سید علاء الدین قوشی المتوفی سنہ ھ کی ہے، یہ شرح قلمی مصر کے کتب خانہ خدیویہ میں محفوظ ہے۔

بوزجانی کے اس رصد خانے میں بہت اچھے آلات رصد تھے، اس نے اوج ج منطقۃ البروج کو ایک ربع دائرہ کے ذریعہ سے دریافت کیا تھا جس کا صرف نصف قطر سات گز کا تھا، ماہتاب میں معادلۃ السرعہ جس کی وجہ سے ماہتاب کی حرکت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اسی رصد خانہ میں دریافت ہوا تھا،

رصد ابن اعلم

علی بن حسن جو ابن اعلم کے نام سے مشہور ہے، چوتھی صدی میں عضد الدولہ دیلمی کے دربار کا ایک نامور مہندس تھا، عضد الدولہ کے بعد صمصام الدولہ اس کے بیٹے نے ابن اعلم کی کچھ زیادہ قدر نہ کی، اس لئے دربار کی آمد و رفت چھوڑ دی تھی، سنہ ۳۷۲ھ میں حج سے واپس آتے ہوئے اس نے سفر آخرت کیا،

ابن اعلم کا رصد خانہ بغداد میں تھا: اس رصد خانہ کا زمانہ چوتھی صدی کا وسط ہونا چاہئے، لیکن کاتب چلپی نے سنہ ۲۵ھ لکھا ہے، جو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ معلوم ہے کہ ابن اعلم کو عضد الدولہ کے دربار سے تعلق تھا اور عضد الدولہ چوتھی صدی میں تھا، نیز ابو الفرج ملطی نے مختصر الدول میں ابن اعلم کا سنہ وفات سنہ ۳۷۱ھ لکھا ہے، اس سے ظاہر ہے کہ سنہ ۲۵ھ میں اگر ابن اعلم نے رصد خانہ قائم کیا تھا، تو ضروری ہے کہ اس کی پیدائش اس سے کم از کم پچیس

برس ادھر ہوئی ہوگی، اس بنا پر ابن اعلم کی عمر کم از کم ڈیڑھ سو برس ماننی پڑے گی، اس لئے ممکن ہے کہ طبع یا کتابت کی غلطی سے سنہ ۳۲۵ھ کے بجائے سنہ ۲۵۰ھ ہو گیا ہو؛

بطلیموس کی یہ تحقیق تھی کہ ثوابت فلک کے ایک درجہ کو سو شمسی سالوں میں طے کرتے ہیں۔[1] اور ابن اعلم کے نزدیک ۷۰ سالوں میں، اس نے مریخ کی تقویم سب سے صحیح اور بہتر بنائی تھی۔

رصد شرف الدولہ

اسلام میں دیالمہ کا خاندان نہ صرف جاہ و جلال کے لحاظ سے ممتاز ہے، بلکہ علمی حیثیت سے بھی اس کو خاص شہرت حاصل ہے؛ ابن اعلم، عبد الرحمن صوفی، احمد صاغانی، ویجن کوہی وغیرہ نے جو مشہور ماہرین ہیئت ہیں، دیالمہ ہی کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی، عضد الدولہ جو اس خاندان کا ہیرو تھا، وہ ہیئت میں عبد الرحمن صوفی کا شاگرد تھا، اور اس کو اس شاگردی پر فخر تھا، شرف الدولہ المتوفی سنہ ۳۷۹ھ نے شاہی محل کے باغ میں ایک رصد خانہ قائم کیا، جس میں اس نے ساتوں سیاروں کی ترصید کی، ویجن کوہی اس رصد خانے کا افسر تھا، اس کے سوا احمد صاغانی المتوفی سنہ ۳۷۹ھ، ابراہیم بن ہلال صابی المتوفی سنہ [illegible] بھی تحقیقات میں شریک تھے، احمد صاغانی المتوفی سنہ ۳۶۵ھ [illegible] [illegible] کی تصحیح کی۔

رصد حاکمی

حاکم بامر اللہ المتوفی سنہ [illegible] مصر کا خلیفہ [illegible]

---

[1] [illegible]

لحاظ سے تمام دنیا کے تاریخی سلاطین میں عجیب غریب بادشاہ ہے۔ حاکم بامر اللہ نے مصر میں جبل مقطم کی چوٹی پر ایک بہت بڑا رصد خانہ بنوایا تھا۔ اس رصد خانہ کا مہتمم ابن یونس مصری تھا۔ ابن یونس ہیئت و ہندسہ کا کامل الفن استاد تھا،

۳۹۹ھ میں اُس نے وفات پائی،

ابن یونس نے اس رصد خانے کے اکتشافات و تحقیقات کو الزیج الکبیر الحاکمی کے نام سے ایک کتاب میں جمع کر دیا ہے، یہ زیج اکثر ہیئت کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے، یہاں تک کہ کوشوکنگ[1] نے بھی ۱۲۸۰ھ میں اسے اپنی کتاب میں درج کیا ہے، یہ کتاب فرنچ ترجمہ کے ساتھ پروفیسر کوسال و تھاپر مقالہ کے زیر اہتمام پیرس میں ۱۸۰۴ء میں چھپ گئی ہے، ابن یونس نے آفتاب اور ماہتاب کے مشاہدات کثرت سے کئے ہیں۔ آفتاب و ماہتاب کی تقویم کے لئے ایک فرنچ زیج بھی لکھی ہے، جو التعدیل المحکم کے نام سے مشہور ہے۔ آفتاب و ماہتاب کے مشاہدات کی ایک جدول بھی تیار کی ہے۔ ان دونوں کتابوں کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہیں،[۴۲]

رصد ملک شاہی

جلال الدین ملک شاہ سلجوقی جس کے روشن کارنامے محتاج بیان نہیں ہیں، اس نے ۴۶۷ھ میں ملک کے ماہرین ہیئت کو جمع کر کے اصفہان میں ایک رصد خانہ بنانے کا حکم دیا، اس رصد خانہ پر ملک شاہ نے بے شمار روپیہ صرف کیا، حکیم عمر بن ابراہیم خیام، محمد بیہقی، ابو المظفر بن الاسفزاری اور میمون بن نجیب الواسطی وغیرہ اس رصد خانہ کے مہتمم تھے ۴۸۵ھ تک جو

---

[1] مشہور چینی ہیئت داں [illegible]

ملک شاہ کا سنہ وفات ہے، یہ رصدخانہ زندہ رہا، ۴۳۷ھ سے پہلے نوروز اس وقت ہوتا تھا، جب آفتاب نصف جوزت طے کر لیتا تھا، تصیحح سال کے لئے اسی سال نوروز اس دن قرار دیا گیا، جب آفتاب برج حمل میں آتا تھا[۱]، اس تغیر کی تمام جنتریوں نے اقتدار کی، اسی رصدخانہ میں خیام نے سنہ فارسی میں قاعدہ کبیسہ جاری کیا، جس سے سنہ فارسی دور شمسی کے مطابق ہو گیا، اس اصلاح شدہ سنہ کا نام جلال الدین کے انتساب سے سنہ جلالی پڑا،

اس اصلاح کی تفصیل یہ ہے کہ آفتاب کل فلک کو ۳۶۵ دن کچھ گھنٹے میں طے کرتا ہے، لیکن حساب کی آسانی کی غرض سے سال صرف ۳۶۵ دن کا قرار دے کر کسرات کو چھوڑ دیا جاتا ہے، چند سالوں میں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان سالوں کے بقیہ کسرات مل کر سال شمسی اور دور شمسی میں ایک تفاوت عظیم پیدا کر دیتے ہیں، اس تفاوت کے مٹانے کے لئے خیام نے یہ قاعدہ مقرر کیا کہ سال کا پہلا دن اس روز کو قرار دیا، جب آفتاب نصف النہار سے پہلے برج حمل میں آئے، اور سال کا ہر مہینہ تیس تیس روز کا کر کے ماہ اسفندار میں پانچ دن بڑھا دیئے جائیں اور ہر تیسرے یا چوتھے سال چھ دن بڑھا دیئے جائیں، اسی قاعدہ کو یورپ میں چھ سو برس کے بعد گرے گورے نے معلوم کیا، جس کی رو سے ہر چار برس کے بعد فروری میں ایک روز کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، پھر بھی گرے گورے کے قاعدۂ کبیسہ سے خیام کا قاعدۂ کبیسہ بدارج بہتر ہے کیونکہ دس ہزار برس میں گرے گورین قاعدہ کے حساب سے سنہ شمسی اور دور شمسی میں تین دن کا فرق پڑ جاتا ہے، اور خیام کے قاعدہ سے اسی مدت میں صرف دو روز کا تفاوت ہوتا ہے،

رصد بیرونی

ابوریحان محمد بن احمد بیرونی پانچویں صدی کا مشہور عالم ہیئت اس رصدخانہ کا بانی

---

[۱] ابن اثیر ج ۱۰ ص ۳۰، ۵، اصفہانی اور محمد بیہقی کا نام تاریخ الحکماء شہرزوری سے لیا گیا ہے،

تھا، ابوریحان سنہ ۳۶۲ھ میں پیدا ہوا تھا، اور سنہ ۴۳۰ھ یا سنہ ۴۴۰ھ میں وفات پائی: ابن سینا اور بیرونی ہمعصر تھے، ان دونوں میں جو تحریری مناظرات اور مراسلات ہوئے ہیں، ان کا کچھ حصہ اب تک برٹش میوزیم میں محفوظ ہے، گو بیرونی کی کوئی کتاب ہیئت و نجوم کے بیان سے خالی نہیں، لیکن اس فن میں اس کی سب سے مشہور کتاب قانون مسعودی ہے جو ۴۲۱ھ میں سلطان مسعود سلطان محمود غزنوی کے بیٹے کے نام سے لکھی گئی ہے، یہ کتاب سنہ ۱۸۸۸ء میں پروفیسر سخاؤ کے اہتمام سے لیپزگ میں چھپ گئی ہے، پروفیسر سخاؤ نے قانون کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا اور یہ ترجمہ بھی سنہ ۱۸۷۹ء میں لندن سے شائع ہو چکا ہے۔

بیرونی نے کتاب الہند میں جو اُس نے ہندوستان میں رہ کر خاص ہندوستان کے علوم و فنون پر لکھی ہے، ہندوؤں کے نجوم و ہیئت پر مفصل بحث کی ہے، الآثار الباقیہ، کتاب الارشاد، الجماہر فی الجواہر، الجوانب الطبیعیہ، مقالید الہیئت وغیرہ اس کی بقیہ تصنیفات ہیں، جن میں اُس نے ہیئت و نجوم جغرافیہ، تاریخ اور فلسفہ کو نہایت تحقیق سے لکھا ہے۔[1]

بیرونی کے رصد خانہ کے متعلق مزید حالات نہیں معلوم، کاتب چلپی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ "بیرونی نے ایک رصد خانہ قائم کیا تھا" بیرونی کو سلاطین غزنہ کے دربار سے تعلق تھا اور سلاطین غزنہ میں سلطان مسعود کو علم ہیئت سے ایک خاص شغف تھا[2]، اس لئے ممکن ہے، کہ غزنہ و ہرات کے نواح میں کہیں رصد خانہ ہو، بیرونی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے دنیا کے بڑے بڑے شہروں کے طول بلد کی جدولیں تیار کیں۔

۱؎ اکتفاء القنوع ص ۲۴۴؛

۲؎ تاریخ الحکماء شہرزوری ذکر بیرونی۔

رصد علاء الدولہ

چوتھی صدی کی ابتدا میں جب طوائف الملوکی شروع ہو چکی تھی، علاؤ الدولہ کاکویہ اصفہان کا بادشاہ تھا، اسی زمانہ میں شیخ ابن سینا شمس الدولہ شاہ ہمدانی سے بخیدہ ہوکر اصفہان چلا آیا، اور علاء الدولہ کے اصرار سے عہدۂ وزارت قبول کرلیا، علاء الدولہ سیف وقلم دونوں کا مالک تھا، ہفتہ میں ایک دن شب جمعہ کو ایک علمی دربار منعقد کرتا تھا، جس میں علماء دارباب علم علمی مباحث پر گفتگو کرتے تھے، شیخ اس مجلس کی شمع محفل تھا،

ان ہی مجالس میں ایک مرتبہ موجودہ تقویموں میں جو نقائص تھے، ان کا ذکر آیا، علاء الدولہ نے شیخ سے تعمیر رصد خانہ کی درخواست کی، اور اس کے جملہ ضروری سامان و آلات کے لئے خزانہ سے روپیہ دلوایا، اور علامہ ابو عبید جو شیخ کے تلامذۂ رشید میں تھے، اس کے مہتمم مقرر ہوئے، شیخ نے اس رصد خانہ میں آٹھ برس تک رصد کی، اور تقویم میں قدما کی بہت سی غلطیاں نکالیں، شمس، عطارد اور زہرہ کے افلاک کی ترتیب میں اختلاف تھا، شیخ نے آفتاب کے چہرہ پر دو سیاہ تل کی طرح زہرہ اور عطارد کا مشاہدہ کیا، جس سے حسب ذیل باتیں ثابت ہوئی ہیں،

۱۔ زہرہ اور عطارد آفتاب سے نیچے ہیں،

۲۔ زہرہ اور عطارد میں بذاتہ روشنی نہیں ہے، ورنہ سیاہ نظر نہ آتے،

۳۔ چاند کی طرح زہرہ اور عطارد بھی ہلال بدر، اور محاق ہوتے ہیں، کیونکہ

لے تاریخ الحکمار شہرزوری، ذکر ابن سینا

یہ سیاہی بتدریج پیدا ہوتی ہوگی،

شیخ کے علمی تذکروں کے لئے ایک دفتر چاہئے، اس لئے ہم صرف شہرزوری کی اس عبارت پر اکتفا کرتے ہیں،

واوردو الشیخ فی الھیئۃ اشیأ لم یسبق الیھا،	شیخ نے علم ہیئت میں بہت سے ایسے مسائل ایجاد کئے، جو قدما کو معلوم نہ تھے،

رصد کوشیار

کوشیار بن لبان پانچویں صدی کے وسط میں تھا، ۴۵۹ھ میں اوس نے رصد کی، اپنی تحقیقات رصدی کو اُس نے دو کتابوں میں جمع کر دیا تھا، پہلی کتاب "زیج کوشیار" کے نام سے مشہور ہے، اصل کتاب عربی زبان میں تھی، محمد ابن ابی طالب تبریزی نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، کوشیار کی دوسری تصنیف "زیج الجامع والبالغ" ہے، جس میں اُس نے افلاک و کواکب کے حرکات کو ہندسہ و حساب کی مدد سے ثابت کیا ہے،

کوشیار کے متعلق کوئی مزید حال نہیں معلوم، واقعات بالا کا تذکرہ کاتب چلپی نے "زیج" کے بیان میں کیا ہے، ابن خلکان نے ایک موقع پر کوشیار کا نام اس طرح لیا ہے، "کوشیار بن لبان بن باشہری الجیلی مصنف زیج"[۱]

رصد ابن زرقال

ابن زرقال اندلس کا مشہور مہندس تھا، اس کا زمانہ تحقیق ۴۲۹ھ (۱۰۳۸ء) ہے،

---

[۱] شرح چغمینی، صفحہ ۱۱۳، ابن خلکان جلد ۲ ص ۲۸۱

مامون شاہ طلیطلہ کے لیئے اُس نے ایک اصطرلاب مامونیہ کے نام سے بنایا تھا، طلیطلہ سے یہ معتمد بن عباد شاہ اشبیلیہ کے دربار میں چلا آیا، اور یہاں "العبادیہ" کے نام سے ایک جدید آلہ اُس نے بنایا تھا[1]،

ابن زرقال نے علم رصد کی بے انتہا خدمت کی، عرض آفتاب کے نقطۂ اوج دریافت کرنے کے لیئے چار سو دو مشاہدات کیئے، زرقال ہمیشہ اپنے بنائے ہوئے آلات رصد استعمال کرتا تھا، معدل النہار کے سالانہ استقبال کا پچاس ثانیہ ہونا پہلے اسی نے دریافت کیا تھا جو تحقیقات حال کے بالکل مطابق ہے،

ابن زرقال کا رصدخانہ غالباً طلیطلہ میں واقع تھا،

رصد مامونی مصر

افضل شہنشاہ بن امیر الجیوش المتوفی ۵۱۵ھ خلیفہ فاطمی آمر باحکام اللہ کا وزیر تھا، اسلامی سلطنتوں میں قاعدہ تھا کہ سلطنت کی طرف سے بہت سے علمائے ہیئت اس کام کے لیئے مقرر رہتے تھے کہ وہ ابتدائے سال میں نہایت صحت کے ساتھ پورے سال کی تقویم (جنتری) تیار کرتے تھے، ۵۰۰ھ کے آنے پر افضل شہنشاہ کے پاس تقریباً سو تقویمیں پیش کی گئیں، لیکن مصر کی تقویموں اور شام سے جو تقویمیں بن کر آئی تھیں ان میں سخت اختلاف تھا، جسکی اصل وجہ یہ تھی کہ شامی تقویمیں بغداد کی رصد مامونی کے مطابق تیار کی گئی تھیں، اور مصر کی تقویموں کی بنا رصد حاکمی پر تھی، اس بنا پر افضل کو ایک جدید رصد خانہ کی تعمیر کی ضرورت محسوس ہوئی،

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۷،

اس رصد خانہ کا مہتمم ابو سعید بن قرقہ متولی سلاح خانجات وضاعات قرار پایا، جو رصد سازی میں نہایت کمال رکھتا تھا، ۵۱۳ھ سے اس رصد خانہ کی تعمیر شروع ہوئی، مسجد قبلۃ الکبیر جس کی تعمیر میں نوے ہزار روپیہ صرف ہو چکے تھے، رصد خانہ کے لئے تجویز کی گئی اور آلات رصد بنا کر یہاں نصب کئے گئے، یہاں جو .... تیار کیا گیا تھا، اس کا قطر دس ہاتھ اور دور تیس ہاتھ کا تھا، پرکار بھی نہایت خوبصورت بنا تھا، اکثر آلات رصد بہت اچھے تھے، لیکن بدقسمتی سے ۵۱۵ھ میں افضل قتل کیا گیا، اور رصد خانہ کا کام ناتمام رہ گیا، افضل کے بعد مامون بطائحی وزیر مصر ہوا، اس نے رصد خانہ کا کام پھر جاری کیا، رصد خانہ قریب قریب تیار ہو گیا تھا اور آفتاب اور بعض سیاروں کا مشاہدہ بھی کیا گیا تھا، کہ ۵۱۹ھ میں مامون وفات پا گیا، اور رصد خانہ کا کام بالکل بند ہو گیا، اس رصد خانہ کے مشہور مہندس، منجم، اور صناع یہ تھے، شیخ ابو جعفر بن حزانی، قاضی ابن ابی العیش، خطیب ابو الحسن علی شیخ ابو النجا ساعاتی، ابو محمد عبدالکریم صقلی مہندس، ابن حلبی، ابن الہیثمی، ابو نصر ابن ذباب قلعی،[1]

رصد مسترشد باللہ

مسترشد باللہ عباسی کے زمانہ حکومت میں جو ۵۲۹ھ ہجری میں تمام ہوتا ہے، ایک رصد خانہ بغداد میں تیار ہوا تھا، اس رصد خانہ کی تعمیر ۵۲۴ھ میں شروع ہوئی تھی، سلاطین سلجوقی کے شاہی محل میں یہ رصد خانہ واقع تھا، مدینۃ العزلا ...

---

[1] مقریزی ج ۱ ص ۱۲۶،

المتوفی سنہ ۵۳۴ھ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس کا مہتمم تھا، اسطرلابی ایک باکمال مہندس تھا، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ رصدخانہ بہت کچھ بہتر ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ اتمام کو نہ پہنچا،[1]

رصد نہاد شروانی

فریدالدین ابوالحسن علی بن عبدالکریم شروانی جو نہاد کے نام سے زیادہ مشہور ہیں، یہ رصدگاہ اُن کی طرف منسوب ہے، علامہ شروانی حکمائے متاخرین میں ایک مشہور فاضل تھے، علم ہیئت میں اُن کو خاص مہارت تھی، رصد و مشاہدۂ کواکب میں مدت دراز تک مصروف رہتے ہیں، آلۂ ذات الشعبتین کے ذریعہ سے تیس برس تک صرف تاروں کی حرکت کا مطالعہ کیا، اور اپنے مشاہدات و تحقیقات کی بنا پر بہت سی زیچیں تصنیف کیں جن میں سے پانچ کے نام یہ ہیں، المغنی، المحکم، المستوفی، المعدول، العلائی، علامہ شروانی کا زمانہ ترصید سنہ ۵۲۱ھ یزدگردی ہے، جو سنہ ہجری کے قریب قریب ہے، کیونکہ سنہ ہجری اور سنہ یزدگردی میں صرف ۳۴۲۵ دن کا فرق ہے،

علامہ کی مصنفہ زیچیں اس پایہ کی ہیں، کہ متاخرین نے اُن کو اپنی تصنیفات کا ماخذ قرار دیا، محمد بن ابی بکر فارسی نے ملک مظفر یوسف بن عمر شاہ یمن کے نام سے جو زیچ لکھی اس کی تحقیقات کا سرمایہ علامہ شروانی کی تصنیفات ہیں،

رصد مراغہ

اس رصدخانہ کا ظاہری بانی گو ہلاکو ہے، لیکن درحقیقت یہ رصدخانہ طوسی کا کارنامہ ہے

---

[1] ابن اثیر جلد ۱۰ ص ۲۵۴،

اور اس رصدخانہ کی تمامتر تحقیقات علمائے اسلام کی دماغی محنت کے نتائج ہیں، بعض مورخین نے آخر وقت میں ہلاکو کا مسلمان ہونا بھی لکھا ہے، اس لئے اسلامی رصدخانوں کے دربار میں رصد مراغہ کو بھی جگہ ملنی چاہئے۔

تحقیقاتِ علمی جن اسلامی رصدخانوں کی ممنون احسان ہے، اُن میں مراغہ کا رصدخانہ خاص وقعت رکھتا ہے، چونکہ مراغہ کا وسیع میدان اس رصدخانہ کے لئے انتخاب کیا گیا تھا، اس لئے یہ رصد مراغہ کے نام سے مشہور ہے، علامہ طوسی زیچ ایلخانی کے دیباچہ میں لکھتے ہیں، کہ اس رصدخانہ کی تعمیر اس شان سے شروع ہوئی، کہ دور دور سے علماء بلائے گئے، موید الدین عرضی دمشق سے، نجم الدین دبیران قزوین سے، فخرالدین مراغی موصل سے، فخرالدین اخلاطی تفلیس سے آئے، جمادی الاولیٰ ۶۵۷ھ سے اس کی تعمیر شروع ہوئی، اور چند سال تک کام جاری رہا۔ بغداد، شام، موصل، اور خراسان کی غارت شدہ کتابوں سے رصدخانہ سجایا گیا، تاتاری فتوحات کا مورخ وصاف اس رصدخانہ کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے،

"چونکہ ہلاکو از فتوحات فارغ شد، طوسی برائے بنائے رصدے تحریک کرد، ہلاکو حکم داد، ہرچند کہ کافی مصارف باشد از خزانہ دادہ شود، بحکم فرمان موید الدین از دمشق و فخرالدین اخلاطی از تفلیس احضار کردہ، در مراغہ از طرف شمالی بر سر پشتۂ مرتفع رصدخانہ بنا فرمود، در کمال آراستگی در ۶۵۷ھ تحریر حلّ ...... و تماثیل و تشکلات افلاک، و تدویرات، و حوامل، و دوائر متوہمہ، و معرفت استوا و نقاد یم منقورہ، و منازل اوج مرتب، و بروج دوازدہ گانہ بر بیاتے ساختہ شد کہ ہر روز عند الطلوع پر تو نیر اعظم از ثقبہ بالائے بر سطح عتبہ می افتاد و درج و دقائق

حرکت آفتاب وکیفیت ارتفاع در فصول اربعہ در ساعات از انجا معلوم می شد
وشکل کرۂ زمین وجزائر وبحار وااقالیم سبع وطول ایام وعرض وارتفاع قطب شمالی
وصورت ودر ضبع اسامی بلدان چناں روشن نمانند، کہ گوئی کتابیست در ممالک
ومسالک وزیج خانی (طوسی) بنام بادشاہ تصنیف کردہ چند جدول وبکات
حسابے کہ در دیگر زیجات متقدمین چوں کوشیار وعلائی وشاہی وغیرہ، نبود افزود"
محقق طوسی، موید الدین عرضی اور فخر الدین وغیرہ علمائے اسلام نے اسمار رصد خانہ
میں جو تحقیقاتیں کیں، اُن میں سے چند مسائل یہ ہیں،
۱- ابنِ اعلم کی اس تحقیق کی تائید کی، کہ ثوابت ستر شمسی سالوں میں ایک درجہ طے
کرتے ہیں، (شرح چغمنی ص ۲۳)
۲- شمسی سال ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۹ منٹ کا ہوتا ہے، (برجندی ص ۱۸۹)
۳- قمری مہینہ،

رصد ابن الحماد

علامہ ابو العباس احمد بن اسحاق تمیمی، جو ابنِ کماد کے نام سے زیادہ مشہور ہیں،
ٹونس کے ایک باکمال مہندس تھے، کاتب چلپی نے لکھا ہے کہ انھوں نے بھی ترصید کی تھی،
ابن کماد نے ابن اکم اشبیلی کی زیج کی اصلاح کی ہے، اس اصلاح میں صرف ۷۰۹ ہجری تک
کی تقدیم کا تذکرہ کیا ہے، جس سے بظاہر قیاس ہوتا ہے کہ ابن کماد کا زمانہ ساتویں
صدی کا اخیر تھا،

رصد ابن شاطر

علی ابن ابراہیم جو تاریخ میں ابن شاطر کے نام سے مشہور ہے مسلمان علمائے ہیئت میں ایک خاص امتیاز رکھتا تھا، دمشق اس کا وطن تھا ۷۷۷ھ میں وفات پائی،

ابن شاطر کا رصد خانہ شام (کسی خاص شہر کا نام معلوم نہیں) میں واقع تھا، ابن شاطر کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے بطلیموس کی غلامی سے آزاد ہو کر علمی تحقیقات کی، اور علم ہیئت کے قواعد و اصول خود ایجاد کئے، جس میں بطلیموس کے اغلاط کی تصحیح کی، ستاروں کی تحقیق مقامات کے لئے ایک خاص کتاب لکھی، ابن شاطر نے اپنے رصد خانہ سے جو زیج تیار کی، وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ بڑے بڑے علماء نے اس کو اپنی تصنیفات کا ماخذ قرار دیا۔

رصد تقی الدینؒ

علامہ تقی الدین بن معروف شامی علمائے ہیئت میں ایک باکمال و منفرد تھے، جن کا ذکر اس مضمون میں اس سے پہلے بھی آچکا ہے، علامہ موصوف کو حکومت عثمانیہ کے دربار سے تعلق تھا، سعد الدین آفندی سلطان مراد کے خاص ارکانِ دولت میں تھا، علامہ تقی الدین نے سدرۃ المنتہی الافکار جو ان کی ایک ممتاز تصنیف ہے، اسی کے نام سے لکھی ہے اور ان کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنا رصد خانہ بھی سعد الدین آفندی کے حکم سے قائم کیا تھا۔

رصد شمس الدین

شمس الدین محمد بن خواجہ واکنوی مسلمان علمائے ہیئت میں ایک خاص وقعت کا حامل ہے

چالیس برس تک اس نے رصد خانہ میں ترصید کی، اور بہت سے اصلاح کردہ آلات سے اُس نے اپنی تحقیقات میں کام لیا، اپنے رصد خانہ کے متعلق فارسی زبان میں ایک مختصر زیج بھی لکھی، شمس الدین کا زمانہ ترصید معلوم نہیں لیکن اس نے اپنی تصنیفات میں محقق طوسی کی زیج کا تذکرہ کیا ہے، جس سے اتنا یقینی ثابت ہوتا ہے کہ ساتویں صدی سے پہلے نہ تھا،

رصد الغ بیگ

مسلمانوں میں علم ہیئت کی عام ترقی کی، اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ سلاطین اسلام تک اس فن میں کمال رکھتے تھے، الغ بیگ شاہرخ مرزا کا بیٹا، اور تیمور کا پوتا تھا سمرقند اس کی حکومت کا پایۂ تخت تھا، الغ بیگ فن ہیئت میں قاضی زادہ رومی کا شاگرد تھا ۸۲۳ھ میں جس رصد خانہ کی بنیاد الغ بیگ نے سمرقند میں ڈالی تھی، اسلامی رصد خانوں میں وہ سب سے زیادہ کامیاب رصد خانہ تھا، اس رصد خانہ کے مہتمم مولانا غیاث الدین جمشید مقرر کئے گئے تھے لیکن افسوس ہے کہ رصد خانہ ان کی سرپرستی میں زیادہ نہ رہ سکا، اور انھوں نے وفات پائی، مولانا غیاث الدین کے بعد قاضی زادہ نے اس کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لیا لیکن یہ آفتاب بھی رصد خانہ کے اہتمام سے پہلے غروب ہوگیا، آخر میں علی ابن محمد قوشجی کے ذریعہ یہ رصد خانہ انجام کو پہنچا[1]،

الغ بیگ جو بادشاہ وقت ہونے کے ساتھ علم ہیئت کا خود ایک بڑا ماہر استاد تھا

---

[1] [illegible]

اس لئے اس رصدخانہ کے آلات بہت بہتر اور کثیر التعداد تھے، اس رصدخانہ کے ربع دائرہ کی نسبت مشہور ہے کہ اس قدر بلند تھا کہ اس کا نصف قطر قسطنطنیہ کی جامع اباصوفیا کے برابر تھا، اس رصدخانہ کی برباد شدہ عمارت بابر کے زمانہ تک باقی تھی، بابر تزک میں سمرقند کی عمارات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے،

"در سمرقند یک عمارت دیگر در دامنۂ پشتۂ کوہک رصداست کہ آلۂ زیج نوشتن است، سہ اسانہ است، الغ بیگ میرزا بایں رصد زیج گورگانی را نوشتہ کہ در عالم حالا ایں زیج معمول است، بہ زیج دیگر عمل نہ کنند، ازیں پیشتر زیج ایلخانی معمول بود کہ خواجہ نصیر در زمان ہلاکو در مراغہ رصد بستہ نوشتہ بود"

بابر کی شہادت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے، کہ مرزا الغ بیگ نے اس رصدخانہ میں جو زیج تیار کی تھی، وہ اس قدر صحیح اور مکمل تھی، جس نے محقق نصیر طوسی کی زیج کو منسوخ کردیا، مرزا الغ بیگ کی زیج کی ایک قلمی شرح میری نظر سے گذری ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے، کہ الغ بیگ کی یہ تصنیف اسلامی ہیئت کا بہترین مجموعہ ہے، اس رصد کی بعض تحقیقات یہ ہیں،

(۱) قمری مہینہ کی مقدار زمانہ ۲۹ درجہ، ۳۱ دقیقہ، ۵۰ ثانیہ، ۴ ثالثہ، ۴۰ رابعہ، ۳۰ خامسہ ہے، (بہادر خانی ص ۵۸۵)

(۲) مدار کی غایت تعدیل ۲۳ درجہ، ۲۶ دقیقہ، ۳۰ ثانیہ ہے،

(بہادر خانی ص ۵۹۶)

(۳) میل کلی جو بازبالاقتطاب لاربعہ کی ایک قوس کا نام ہے، ۲۳ درجہ ۳۰ دقیقہ،
۱۷ ثانیہ ہے، (تصریح ص ۲۳)

(۴) منجمان فارس دنیا کی ابتداے آبادی کو جزائر خالدات سے اور منجمان ہند گنگ دز سے شروع کرتے تھے، لیکن الغ بیگ نے قرار دیا، کہ چونکہ زمین کرہ ہے، اسلیے ابتداے آبادی ہر جگہ فرض کی جاسکتی ہے، (بہادر خانی ص ۶۶۸)

رصد فیروز شاہی

فیروز شاہ بہمنی درحقیقت دکن کا مامون عظم یا الغ بیگ تھا، جو تیغ و قلم دونوں کا مالک تھا، ایک طرف تو وہ تخت شاہی کو جلوے دے رہا تھا، اور دوسری طرف مسند نشین تدریس تھا، جس طرح اُس کو حکومت کے لحاظ سے خاندان بہمنی میں ہونے کا فخر تھا، اسی طرح علمی حیثیت سے اس کو یہ فخر بھی حاصل تھا، کہ وہ علامہ تفتازانی کے سلسلۂ تلمذ میں داخل تھا، گو فیروز شاہ کو اکثر علوم میں کمال حاصل تھا، لیکن فلسفہ اور اصول فقہ سے اس کو خاص مناسبت تھی؛ ہفتہ میں شنبہ، دوشنبہ، چہارشنبہ، تین دن طلبہ کو درس دیتا تھا، ریاضیات میں زاہدی شرح تذکرہ، علم کلام میں شرح مقاصد، فن بلاغت میں مطول پڑھاتا تھا، فضل اللہ انجو شاگرد علامہ تفتازانی کا شاگرد تھا،

دولت آباد دکن میں فیروز شاہ نے ایک رصد خانہ کی تعمیر کی ابتدا کی تھی، حکیم علی حسن سید محمد کازرونی، اور دیگر علماء کے اہتمام و مشورہ سے یہ رصد خانہ انجام پا رہا تھا، کہ حکیم علی حسن

کا انتقال ہوگیا، اور یہ رصدخانہ ناتمام رہ گیا،[1]

رصد شاہجہانی

تیموری خاندان کا بانی دوم ہمایوں ہندوستان کا ایک امن پسند شاہنشاہ تھا، اور جس رتبہ کا وہ شہنشاہ تھا، اسی رتبہ کا استاد ہیئت بھی تھا، دور دور سے لوگ اُس سے فنِ ہیئت سیکھنے کو آتے تھے، نورالدین سیقدری اس سے ہیئت سیکھنے کو ہندوستان آئے تھے، اور ہمایوں خود علامہ الیاس اردبیلی کا شاگرد تھا،

فنِ ہیئت سے اس کو ایک خاص شغف تھا، اور اسی شوق میں جان بھی دی، ایک مرتبہ اپنے کتب خانہ کی چھت پر شام کو طلوعِ مریخ کا مشاہدہ کرنے گیا تھا، کہ چھت سے اُترتے وقت زینہ سے گر گیا، جس کی چوٹ سے جانبر نہ ہوسکا،

ہمایوں نے کرۂ ارض و کرات عناصر و افلاک مع کواکب مختلف ...... رنگ سے رنگ کر مجسم صورت میں بنائے تھے، جس میں اصولِ تنجیم کے لحاظ سے ہر کمرہ ایک خاص رنگ کا تھا، ہفتہ کے ہر روز میں وہ ایک ایک کمرہ میں نشست کرتا تھا، اور اُس دن وہ اُس کے مصاحبین اسی کمرے کے رنگ کے کپڑے پہن کر آتے تھے ہمایوں نے اصطرلاب کی بھی اصلاح کی تھی، شاہجہاں ہمایوں کی نسل سے تھا، اور فنِ تعمیر میں اس کو خاص مہارت تھی، اس لئے ناممکن ہے کہ کسی رصدخانہ کی تعمیر کا

---

[1] روضۃ الاولیاء آزاد بلگرامی ص ۳۲،

اس کو خیال نہ ہو،

شاہجہان نے علامہ محمود جونپوری کو ایک رصد خانہ قائم کرنے کا حکم دیا تھا، علامہ نے اس کے لئے ایک قطعۂ زمین کا بھی انتخاب کیا تھا، لیکن کثرتِ مصارف کی بنا پر تمام نہ ہو سکا،[۱]

رصد محمد شاہی

تیموری سلاطین میں محمد شاہ اخیر شخص ہے جس میں کوئی قوت نہ تھی، مگر اس میں بھی یہ ذوق تھا کہ اس کے حکم سے راجہ سوائی سنگھ والی جے پور نے ۱۱۲۶ھ دہلی میں رصد خانہ بنوایا تھا،[۲] یہ سب سے پہلا مشرقی رصد خانہ ہے جس نے مغربی تحقیقات کی تائید کی، مرزا خیراللہ مہندس اور صدہا علماء اس رصد خانہ کے مہتمم تحقیقات تھے، اس رصد خانہ میں جو جدید تحقیقاتیں ہوئیں، وہ حسب ذیل ہیں،

۱- قمری مہینہ کی مقدار زمانہ ۲۹ درجہ ۳۹ دقیقہ، ۵ ثانیہ، ۴ ثالثہ، ۲۴ رابعہ، ۳۴ خامسہ ہے،

۲- زہرہ اور عطارد میں نور بالذات نہیں ہے، بلکہ وہ آفتاب سے نور کا استفادہ کرتے ہیں اور ان میں ہلال و بدر و محاق ہوتا ہے، (مگر ہم یہ پہلے لکھ آئے ہیں کہ ابن سینا کی بھی یہی تحقیق ہے)

۳- زحل کروی نہیں ہے، بلکہ اہلیلجی ہے،

۴- مشتری کے گرد چار چاند ہیں،

۱؎ تجلی نور تاریخ جونپور ۲؎ زیج محمد شاہی، مقدمہ

۵۔ ہم جنکو ثوابت کہتے ہیں اُن میں بعض سیارات بھی ہیں،

۶۔ آفتاب کے داغ (جن کا سب سے پہلے ابن رشد قائل ہوا تھا) وہ حرکت وضعی کرتے ہیں،

۷۔ شمس اور کل حوالی کا مدار خارج المرکز بیضوی ہے[1]،

ان رصد خانوں کے علاوہ اور بعض رصد خانے ہیں، جن کے حالات سے بجز نام کے ہم کو واقفیت نہیں ہے، اس لئے ہم نے اُن کو قلم انداز کردیا ہے، آیندہ معلومات نے اگر امداد کی تو ان کے حالات بھی ہدیۂ ناظرین ہوں گے[2]،....

---

[1] ان تمام تحقیقات کے لئے جامع بہادر خانی ص ۹ ، ۵ و ۲۸۲ و ۸۶۵ دیکھنا چاہئے،

[2] اس تمام مضمون میں جس رصد کے متعلق حوالہ درج نہ ہو اس کے لئے کشف الظنون لفظ رصد اور لفظ زیچ دیکھو،

(الندوہ مارچ و مئی ۱۹۰۹ء)

کتُبؔ خانۂ اسکنْدریہ

منجملہ اُن افسوسناک غلطیوں کے، جو تاریخ اسلام کی نسبت یورپ نے کی ہیں، اور منجملہ اُن غلط الزامات کے جو یورپ نے مسلمانوں پر قائم کئے ہیں، ایک یہ ہے کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کا عظیم الشان بطلیموسی کتب خانہ برباد کردیا، جس کی کتابوں سے چھ مہینے تک مصر کے تمام حمام گرم رہے، یورپ کو ان مقدمات سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ صحابہؓ نہایت وحشی تھے، علم کے سخت ترین دشمن تھے، جن کی نگاہ میں علوم و فنون کی قدر ہیمہ آتش سے زیادہ نہ تھی، (معاذ اللہ)

اس جھوٹ اور مفتریانہ حکایت کی پردہ دری، اصول روایت کے رو سے حضرۃ الاستاذ نے ایک مدت پہلے ایک رسالہ کی صورت میں کردی ہے، جو اردو، انگریزی اور عربی تینوں زبانوں میں شائع ہو چکا ہے، اس رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس فرضی قصہ کے مسلمان راوی صرف عبد اللطیف بغدادی، مقریزی اور حاجی خلیفہ تنہا کرجاتے ہیں، ان میں سے مقریزی کی روایت کا یہ حال ہے کہ وہ حرف بحرف عبد اللطیف بغدادی سے منقول ہے، حاجی خلیفہ نے اولاً تو کتب خانہ اسکندریہ کا مطلق نام تک بھی نہیں لیا،

بلکہ عام کتب خانہ کا لفظ لکھا ہے، ثانیاً وہ خود اُس کو ضعیف روایت سمجھتا ہے، جیسا کہ اس کے لفظ "یُروی" یعنی "بیان کیا جاتا ہے" سے سمجھا جاتا ہے، عبد اللطیف ۶۲۹ھ نے مصر میں اپنے چشم دید واقعات کو ایک رسالہ کی صورت میں جمع کیا ہے، اس نے اس رسالہ میں کتب خانۂ اسکندریہ کے جلانے کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی ہے، لیکن وہ بھی اس روایت کو ایک عامیانہ روایت سمجھتا ہے، جیسا کہ اوس کے لفظ یذ کو یعنی بیان کیا جاتا ہے" سے مفہوم ہوتا ہے، نیز اوس نے اس روایت کے تحت میں اور ضمنی باتیں بھی ذکر کی ہیں، وہ بھی کتب خانۂ اسکندریہ کی طرح بازاری گپیں ہیں،

اس امر کی سب سے بڑی دلیل کہ مسلمانوں نے اس کتب خانہ کو نہیں جلایا ہے، یہ ہے کہ کتب مغازی و فتوح مصر جن میں ایک ایک جزئی امر کا ذکر ہے، اس واقعہ کے متعلق ایک حرف بھی مذکور نہیں، حضرۃ الاستاذ نے اس تفصیل کے بعد ان تمام روایات کا سر چشمہ ابو الفرج ملطی کو قرار دیا ہے، جو ایک متعصب عیسائی پادری تھا، ابو الفرج نے سریانی میں ایک مبسوط تاریخ لکھی تھی، اور خود اُس نے اس کا عربی زبان میں ترجمہ کیا تھا، جو مختصر الدول کے نام سے مشہور ہے، اسی مختصر الدول میں سب سے پہلے ذکر آیا ہے کہ کتب خانۂ اسکندریہ کو مسلمانوں نے جلایا، لیکن اصل سریانی میں اس کا مطلق ذکر نہیں ہے؛

مصر میں جرجی زیدان ایک عیسائی مورخ ہے، اور عرب کے مشہور رسالہ الہلال کا اڈیٹر ہے، اُس نے چند جلدوں میں تمدن اسلامی کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، تین سال ہوئے کہ میں نے اردو اور عربی زبان میں جرجی زیدان اور اس کی تمدن اسلامی

کی اصلی حقیقت کھولی تھی، اور اُس کے مکائد تدلیسات اور ابلہ فریبی کو ظاہر کیا تھا، آج ہم پھر کتب خانۂ اسکندریہ کے سلسلۂ سخن میں اس کی تمدن اسلامی کا ذکر کرتے ہیں،

جرجی زیدان نے تمدن اسلامی کی تیسری جلد عربوں کے علوم و فنون کی تاریخ مین لکھی ہے، جس میں اُس نے نہایت ناکمل طور سے علوم اسلامیہ کے ماخذ، ابتدا اور اُن کی ترقیوں کا ذکر کیا ہے، اس جلد کا نصف سے زائد حصہ حضرۃ الاستاذ کے مضمون "تراجم" سے ماخوذ ہے، جو رسائل شبلی کے ضمن میں چھپ چکا ہے، یہ جلد اردو زبان میں "علوم عرب" کے نام سے چھپی ہے، جس میں مترجم نے نہایت مبالغہ کے ساتھ علامہ جرجی زیدان کے اس علمی احسان کا تمام دنیاے اسلام کی طرف سے شکریہ ادا کیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہم اس احسان نما ظلم کے اداے شکر کے لئے تیار نہیں ہیں،

اس تیسری جلد میں جرجی زیدان نے کتب خانہ اسکندریہ کا ایک عنوان قائم ہے، جس میں حضرۃ الاستاذ کے چند دلائل کی تردید کر کے اپنی آخری تحقیق کا یہ نتیجہ پیش کیا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ کو مسلمانوں نے ہی جلایا ہے، اور اس واقعہ کا اول راوی عیسائی ابو الفرج نہیں ہے، بلکہ مسلمان جلال الدین قفطی ہے،

اس سے پہلے کہ ہم اصل مسئلہ کی تحقیق کریں، یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ کی اصلی ماہیت کیا ہے، اسکندریہ جو اب مصر کا ایک آباد شہر ہے بطلیموسیوں کا دار السلطنت تھا، جو مصر میں اسکندر کے جانشین تھے، اس خاندان کا پہلا بادشاہ بطلیموس سوطر تھا، جو علم دوست بادشاہ تھا، اس نے ۲۸۵ قم میں وفات پائی، اسی کے حکم سے اسکندریہ میں ایک کتب خانہ کی بنیاد ڈالی گئی تھی، جس میں یونانی کتابوں کے علاوہ ان کتابوں کے تراجم کا بھی ذخیرہ تھا، جو اسکندر ایرانی کے حملۂ فارس کے وقت یونانیوں کے ہاتھ لگی تھیں،

سوطر کے جانشینوں میں بطلیموس فلا دلف (۲۴۷ قم) نے اس کتب خانہ کا حد سے زیادہ اہتمام کیا، اس کے بعد دیگر شاہان بطلیموس بھی اس میں برابر اضافہ کرتے رہے، اسلامی مورخین کے بیان کے مطابق پینتالیس ہزار اکیسویں کتابوں سے یہ کتب خانہ معمور تھا،[۵۱] یورپین تاریخوں کی شہادت کی بنا پر یہ کتب خانہ، لاکھ کتابوں کا خزانہ تھا، اس کی پہلی مرتبہ بربادی جولیس سیزر کے ہاتھ سے ہوئی، سیزر نے جب اسکندریہ کا محاصرہ کیا، تو اس کتب خانہ کا بہت بڑا حصہ جل گیا، لیکن شاہ پرگامیسس نے کلیوپیٹرا کو جو مصر کی آخری بطلیموسی شاہزادی تھی، اپنا کتب خانہ اسکندریہ کے کتب خانہ کے لئے دیدیا، اس طرح سے دوبارہ یہ کتب خانہ آباد ہوا، یہ کتب خانہ سیراپیس میں رکھا گیا، تھا، جو بت پرست مصری، قوم کا ہیکل تھا، ۳۹۱ھ میں عیسائی بادشاہ تھوڈوسیس کے حکم سے تھیافلیس نے جو اسکندریہ کا ایک متعصب پٹریارک تھا، اس ہیکل کو ڈھاکر کنیسہ بنا دیا، جس کے ساتھ یہ کتب خانہ بھی برباد کر دیا گیا،[۵۲]

اسکندریہ کے کتب خانہ کی بربادی کی یہ حقیقت ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے فتح مصر سے کتنی مدت پہلے یہ کتب خانہ ہمارے متعصب معترضوں کے ہم مذہبوں کے ہاتھوں برباد ہو چکا تھا، لیکن ان معترضوں کو اپنے دامن کا یہ سیاہ داغ عہد ظلمت میں تو نظر نہیں آیا، اب بتدریج روشنی میں نظر آنے لگا ہے، اور چاہتے ہیں کہ یہ داغ اُن کے دامن سے مٹ جائے، مگر نہیں مٹ رہا ہے، ہمارے معترضوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ جس قدر یہ روشنی بڑھتی جائیگی اس قسم کے سیکڑوں سے داغ اُن کو اپنے دامن پر نظر آتے جائیں گے،

انہی معترضوں کی صف میں ہمارا دوست جرجی زیدان بھی ہے، وہ اپنے دعوی کے ثبوت میں حسب ذیل دلائل رکھتا ہے،

---

۵۱ تقوطی مطبوعہ مصر ص ۲۳۲، ۵۲ چیمبرس انسائیکلوپیڈیا لفظ اسکندریہ،

۱۔ ابتدائے اسلام میں مسلمان سوائے قرآن کے تمام کتابوں کو مٹا دینا چاہتے تھے۔ صفحہ
اس بات کے خواہشمند تھے کہ دنیا کی تمام کتابیں مٹا دی جائیں: صرف قرآن کافی ہے۔

۲۔ اس واقعہ کا اول راوی عیسائی ابوالفرج ہنیں مسلمان تفطی ہے، بلکہ ابوالفرج کی
عبارت بعینہٖ تفطی سے ماخوذ ہے؛

۳۔ تفطی ابوالفرج ملطی اور بغدادی نے اس واقعہ کو مسلمانوں کی طرف منسوب کیا ہے؛

۴۔ تاریخ اسلام میں کتب خانہ اسکندریہ کے علاوہ فارس کے کتب خانوں کے برباد
کردینے کا بھی ذکر ہے، جیسا کہ ابن خلدون اور حاجی خلیفہ میں مذکور ہے؛ اس سے ظاہر
ہوتا ہے کہ مسلمانوں ہی نے اسکندریہ کا کتب خانہ بھی جلایا ہوگا؛

۵۔ مسلمانوں نے اپنے ہی فرقوں کے کتب خانے جلائے، جیسا کہ گبن صاحب نے رومن امپائر
جلد سوم میں لکھا ہے کہ سلطان محمود نے ۴۲۰ھ میں جب رے کو فتح کیا تو باطنیوں کو قتل
کر ڈالا، معتزلہ کو جلاوطن کر دیا، اور فلسفہ کی کتابیں جلا دیں؛

۶۔ مسلمانوں کو کتابوں کے برباد کرنے کا ایسا شوق تھا کہ وہ خود اپنی کتابیں آپ
برباد کردیتے تھے، جیسا کہ احمد ابن ابی الحواری، سفیان ثوری اور ابو عمر کی نسبت مشہور ہے؛

ان دلائل مستندہ کے بعد جرجی زیدان یہ عجیب وغریب نتیجہ نکالتا ہے کہ

"ابتدائے اسلام میں عربوں کے علوم قدیمہ کی جس قدر کتابیں دستیاب ہوئیں
انھوں نے ان سب کو برباد کر دیا"؛

پہلا دعویٰ کہ صحابہ قرآن کے سوا تمام دنیا کی کتابیں مٹا دینا چاہتے تھے، جرجی
زیدان کے نزدیک ایسا بدیہی تھا کہ اس کے لئے اس نے کسی دلیل کے پیش کرنے کی تکلیف
گوارہ ہنیں کی؛

اس کے ثبوت میں وہ کتب خانہ اسکندریہ کو پیش کرے گا، یا کتب خانہ فارس کا نام لے گا، جو کتب خانہ اسکندریہ کی طرح ایک بے بنیاد واقعہ ہے، اس کا ذکر آٹھ نو سو برس کے بعد عربی تاریخوں میں صرف مقدمہ ابن خلدون اور حاجی خلیفہ کی ایک ضمنی بحث میں آ گیا ہے، اگر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا قرآن مجید کے ساتھ شغف جو فضائل علم کے بیان سے پُر ہے، کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا باعث ہو، تو پھر رومی اور شامی عیسائیوں کا انجیل کے ساتھ شغف جس میں علم کی فضیلت کی نسبت ایک حرف بھی مذکور نہیں، کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا کتنا بڑا سبب ہو سکتا ہے،

دوسرا دعویٰ اگر صحیح بھی ہو کہ اس واقعہ کا اول راوی عیسائی ابو الفرج نہیں ہے، تو اس انکار سے اصل واقعہ کے ثبوت پر کیا اثر پڑا، اصلی جواب اس کا آگے آتا ہے،

جرجی زیدان کہتا ہے کہ "جمال الدین قفطی، ابو الفرج ملطی اور عبد اللطیف بغدادی نے اس واقعہ کو مسلمانوں کی طرف منسوب کیا ہے، ان تین ناموں پر ایک نام ہم اور بڑھاتے ہیں، مقریزی نے بھی اس روایت کو لیا ہے، لیکن سب سے پہلے جاننا چاہئے کہ کس زمانہ کے لوگ تھے،

۱۔ عبد اللطیف بغدادی ولادت سنہ ۵۵۷ھ وفات سنہ ۶۲۹ھ مصنف کتاب افادہ،

۲۔ قاضی اکرم جمال الدین قفطی ولادت سنہ ۵۶۸ھ وفات سنہ ۶۴۶ھ مصنف اخبار الحکماء،

۳۔ ابو الفرج بن العبری ملطی ولادت سنہ ۶۲۳ھ وفات سنہ ۶۸۵ھ مصنف مختصر الدول،

۴۔ تقی الدین مقریزی، ولادت سنہ ۷۶۶ھ وفات سنہ ۸۴۵ھ مصنف خطط مصر،

ان میں سب سے پہلا شخص بغدادی ہے اور آخری شخص مقریزی ہے، بغدادی کی وفات سنہ ۶۲۹ھ میں ہوئی، اور مقریزی نے سنہ ۸۴۵ھ میں وفات پائی ہے، اس سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ ساتویں صدی کی روایت ہے، اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رکھو کہ

اس چھ سو برس کے اثنا میں سیکڑوں اسلامی اور غیر اسلامی تاریخیں تصنیف ہوئیں لیکن کسی نے اس واقعہ کی نسبت مسلمانوں کی طرف نہیں کی، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس جرم کا مسلمانوں کی طرف انتساب کسی صحیح ماخذ پر مبنی نہیں ہے۔

مقریزی کی شہادت بھی کوئی نئی شہادت نہیں ہے، بلکہ وہ بعینہٖ بغدادی کی عبارت کی نقل ہے، اور دونوں نے اس واقعہ کو "بیان کیا جاتا ہے" کے مجہول صیغہ کے ساتھ نقل کیا ہے[۱]، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بغدادی اور مقریزی اس واقعہ کو محقق نہیں سمجھتے۔

اب قفطی اور ابوالفرج رہ جاتے ہیں، یہ دونوں ہم عصر تھے، ابوالفرج ۲۱ برس کے سن میں بسبب مقررہ ہو، قفطی کی وفات کے وقت اس کی عمر ۲۳ برس کی تھی، اس واقعہ کے متعلق دونوں کی عبارت بعینہٖ ایک ہے، ممکن ہو کہ مختصر الدول ابوالفرج کی ابتدائی اور اخبار الحکما قفطی کی آخری تصنیف ہو، اور موخر الذکر کا ماخذ اول الذکر ہو، اس بنا پر ابوالفرج کا عربی ترجمہ مشرق میں اس واقعہ کا مشتہر قرار پائیگا، اور لاطینی ترجمہ مغرب میں، اس سے یہ عجیب راز بھی منکشف ہوتا ہے کہ تاریخ الحکما للقفطی میں یہ واقعہ عیسائیت کی راہ سے آیا ہے،

یحیی نحوی کا فتح اسکندریہ کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس آنا، یحیی کا حضرت عمرو بن العاصؓ سے کتب خانہ کے جلانے کی اجازت طلب کرنا، حضرت عمرو بن العاصؓ کا حضرت عمرؓ کو اس واقعہ کی اطلاع دینا، حضرت عمرؓ کا کتبخانہ کے جلانے کا حکم دینا، حضرت عمرو بن العاصؓ کا کتابوں کو حماموں میں تقسیم کرنا، اور ان کا چھ مہینے تک جلتے رہنا، یہ تمام تفصیل قفطی اور ابوالفرج کی تاریخوں کے سوا اور کہیں مذکور نہیں، اور عجیب تر یہ ہے کہ ان دونوں کی عبارتیں حرف بحرف ایک ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک اصل ہے، اور دوسری نقل، اگر ابوالفرج کو قفطی کا ماخذ تسلیم کر لیا جائے، تو مسئلہ طے ہو جاتا ہے کہ ابوالفرج

[۱] مقریزی جلد اول ص ۱۴۹،

ایک متعصب عیسائی مورخ ہو وہی اس قصہ کا موجد ہو، اور قفطی اس کا ناقل ہو، اگر ابو الفرج
ماخذ قفطی کی تاریخ ہے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ قفطی نے اس واقعہ کو کہاں سے لیا تو
اُس وقت حل ہو جاتا ہے جب ہم ابن ندیم کی کتاب الفہرست[۱] میں کتب خانہ اسکندریہ
کا ذکر پاتے ہیں، اور اسی کو قفطی نے اپنی تاریخ میں لفظ بلفظ نقل کر دیا ہے، ابن ندیم نے
آگے چل کر تصریح کی ہے، کہ یہ اسحاق راہب کی تاریخ سے ماخوذ ہے، اس سے ظاہر ہوتا
ہے کہ قفطی نے کتب خانہ اسکندریہ کے دوسرے تفصیلی واقعات جن میں مسلمانوں کے ہاتھ سے
اُس کی بربادی کا واقعہ بھی شامل ہے، اسحاق راہب کی کتاب سے لیا ہے، اگر یہ صحیح ہو
تو سمجھنا چاہئے کہ مسلمانوں میں یہ روایت عیسائیت کی راہ سے آئی ہے، اس حالت میں
گو اس قصہ کا موجد عیسائی بشپ (ابو الفرج ملطی) نہیں قرار پاتا، مگر عیسائی راہب (اسحاق)
تو قرار پاتا ہے، جو مذہبًا عیسائی بشپ کا بھائی ہے،

جرجی زیدان اگرچہ تسلیم کرتا ہے کہ کتب خانہ اسکندریہ کے واقعہ کیلئے قفطی کا ماخذ اسحاق
راہب کی تاریخ ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی کہتا ہو کہ اس کے جلانے کی روایت قفطی نے کسی
اسلامی تاریخ سے لی ہو گی، لکھتا ہے:-

> اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتبخانہ کے حالات تو اوس نے (قفطی نے) اسحاق راہب
> کی تاریخ سے نقل کئے ہیں، لیکن اس کے جلانے کا واقعہ کسی اور کتاب سے لیا ہوگا

یہ ایک عجیب ادعا ہے جب نصف واقعہ اسحاق کی کتاب سے ماخوذ ہے، تو اس کا
زیادہ امکان ہو کہ دوسرے واقعات بھی اُس نے اسی کتاب سے لئے ہوں،
ایک اور امر جس کی وجہ سے قفطی کی شہادت ضعیف ہو جاتی ہے، یہ ہے کہ یحییٰ نحوی اور
کتب خانہ اسکندریہ کے جو حالات قفطی نے لکھے ہیں، وہ ابن ندیم کے صفحہ ۲۵۴ سے تقریبًا

---

[۱] فہرست ابن ندیم ص ۲۳۹، ۲۴۰،

حرف بحرف ملتے جلتے ہیں، لیکن جہاں سے کتب خانہ کے جلانے کی حکایت شروع ہوتی ہے، اس کا ایک حرف بھی ابن ندیم میں نہیں ملتا۔

چوتھے نمبر میں جرجی زیدان یہ عجیب دلیل پیش کرتا ہے کہ مسلمانوں نے فارس[۱] کا کتب خانہ جلادیا، جب وہ اپنے ہی فرقوں کے کتب خانے جلادیا کرتے تھے، تو یقیناً انھوں نے اسکندریہ کا کتب خانہ بھی جلادیا ہوگا، اگر یہ دلیل صحیح ہے تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ رومیوں نے ارشمیدس کی کتابیں جو سمندر والوں پر بار ہوتی تھیں جلادیں[۲] جولیس سیزر رومی نے اسکندریہ کا شاہی کتب خانہ جلادیا، اس لئے کہ یورپ کی یہ عظیم الشان حکومت علم کی سخت دشمن تھی، خود افلاطون نے سقراط کے پاس جاتے وقت اپنی ادبی تصنیفات جلادیں، ابراہیم نصرانی کی موت کے وقت اسکے عیسائی اعزہ نے اسکی منطق و فلسفہ کی تصنیفات جلادیں[۳] ہسپانیہ کے عیسائیوں نے جب میکسیکو پر حملہ کیا، تو انبار در انبار کتابیں جلادیں، عیسائی پادری مارکوئی میڈا نے پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں سلیمنکا میں علوم مشرقیہ کی چھ ہزار کتابوں میں آگ لگادی، اسپین کے ایک متعصب پادری زنیمز نے غرناطہ میں عربی زبان کے دس ہزار قلمی نسخوں کا ڈھیر لگا کر آگ لگادی، طرابلس الشام میں جب انگریزوں نے صلیبی جنگ میں فتح پائی، تو وہاں کے کتب خانہ کو جس میں تقریباً تین لاکھ کتابیں تھیں، نہایت وحشیانہ طور پر برباد کردیا، عیسائیوں نے فتح اندلس کے موقع پر ایک نہیں متعدد کتب خانے برباد کردیئے، فرفوریس کی تصنیفات کے تمام نسخے شہنشاہ تھوڈوسیس نے جلوادیئے، (یہ تھوڈوسیس وہی ہے، جو تاریخی تحقیقات کے رو سے کتب خانۂ اسکندریہ کی بربادی کا باعث ہے) اس بنا پر زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ عیسائیوں ہی نے اسکندریہ کا کتب خانہ بھی جلایا ہوگا،

اس سے مسلمانوں کی براءت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ فتوح و مغازی کی سیکڑوں

۱؎ اس پر تنقید آئندہ ہوگی ۲؎ قفطی ص ۱۴۱ ۳؎ ایضاً ص ۴۹۔

کتابوں میں سے ایک میں بھی اس واقعہ کا ذکر نہیں ہے لیکن جرجی زیدان نہایت بے باکی کے ساتھ اس کا رد کرتا ہے کہ فتوح و مغازی کے مصنفوں نے اپنی کتابوں میں اس واقعہ کا ذکر ضرور کیا ہوگا لیکن جب مسلمانوں میں تمدن آیا اور وہ تحصیل علم میں مشغول ہوئے اور ان کو کتابوں کی قدر معلوم ہوئی تو انھوں نے خلیفہ دوم کے عہد تک اس واقعہ کو دور از عقل سمجھ کر حذف کر دیا ،

جرجی زیدان مسلمان مورخین پر ایک نیا الزام قائم کرتا ہے حالانکہ اُن کے متعلق تمام دنیا کا اتفاق ہے کہ ثقاہت وصحت روایت میں دنیا کی کوئی قوم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی ، کیا یہ قرینِ عقل ہے کہ مختلف ملکوں کے مسلمان مورخین اپنی کتابوں سے کسی واقعہ کے حذف کرنے پر اتفاق کر لیں گے ، غالبًا ہمارا دوست یہ سمجھتا ہے کہ جس طرح انجیل کی آیات کی تحریف کے لئے عیسائی علماء کی مجلس منعقد ہوتی تھی ، اسی طرح کتبخانہ اسکندریہ کے واقعہ کی تحریف کے لئے دنیا کی کسی گوشہ میں ان مسلمان مورخین کی بھی کوئی مجلس منعقد ہوئی ہوگی لیکن ہم اپنے دوست کو بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ اس داغ سے پاک ہے ،

مسلمان اس سے بڑت کے لئے یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ ابو الفرج کی عربی تاریخ درحقیقت اُس کی سریانی تاریخ کا ترجمہ اور خلاصہ ہے اور اس سریانی تاریخ میں اس واقعہ کا مطلق ذکر نہیں ، جو ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ واقعہ اس کی عربی تاریخ میں کسی نے بعد میں بڑھا دیا ہے ، جرجی زیدان اس کا بھی رد کرتا ہے ، اور کہتا ہے کہ یہ غلط ہے کہ اس کی عربی تاریخ اس کی سریانی تاریخ کا ترجمہ اور خلاصہ ہے لیکن ہم حیران ہیں کہ اس امر میں ہم جرجی زیدان کو غلط گو سمجھیں یا اس کے استاد فانڈیک

کے لائق فرزند اڈورڈ امرکی کو جو اپنی فہرست میں صاف صاف لکھتا ہے کہ ابوالفرج نے پہلے اس کتاب کو سُریانی زبان میں لکھا، اور پھر اس کو کسی قدر اختصار کے ساتھ عربی میں منتقل کیا،[1]

یہ ہیں جرجی زیدان کے وہ دلائل جن کی بنا پر وہ مسلمانوں کو علم کا دشمن قرار دیتا ہے،

اب ایک اور رُخ کی طرف ہم ناظرین کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں، کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کے واقعہ کے سلسلہ میں جن موافق اور مخالف اشخاص نے قلم اٹھایا ہے انھوں نے ایک استدلال کی طرف توجہ نہیں کی، ہم اوپر لکھ آئے ہیں، جن عربی مورخین مثلاً قفطی ابوالفرج ملطی وغیرہ نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، وہ سب کے سب آخری چھٹی صدی یا ابتدائی ساتویں صدی کے مورخین ہیں، بغدادی اور قفطی صلاح الدین کے دربار سے متعلق تھے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس واقعہ کو بڑی شہرت حاصل تھی، اور یہ وہ زمانہ ہے جب تمام دنیا کے مسیحی صلیبی جنگ کے جوش سے بھرے ہوئے مسلمانوں کے خلاف سیکڑوں افترائات مشہور کر رکھے تھے، ہو سکتا ہے، ان ہی بازاری گپوں کو ایک دو مورخوں نے اپنی کتابوں میں بھی جگہ دے دی ہو،

اب تک جو بحث تھی، وہ اس بات کی تھی کہ اسلامی تاریخیں اس واقعہ کے بیان سے خاموش ہیں، اب ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ محققینِ یورپ جو اکثر عیسائی ہوں گے، اس واقعہ کے بارہ میں کیا خیال رکھتے ہیں،

اور سب سے پہلے اس واقعہ کی تردید مشہور مورخ گبن مصنف تاریخ رومۃ الکبریٰ نے کی، وہ ابوالفرج کی روایت نقل کرنے کے بعد لکھتا ہے:-

---

[1] اکتفاء القنوع، ص ۷۸،

"میں اس واقعہ کی اصلیت اور اس کے نتائج دونوں کے انکار کی طرف بہت زیادہ مائل ہوں[۵]، واقعہ بلاشبہ عجیب ہے، مورخ (ابوالفرج) خود کہتا ہے "پڑھو اور تعجب کرو" اور ایک اجنبی (ابوالفرج) کی شہادت جو اس نے چھٹی صدی کے اختتام پر میڈیا کے حدود میں لکھی ہے، نہایت ہی کمزور ہو جاتی ہے، جب کہ اس کے قبل کے دو مورخ اس واقعہ کے متعلق خاموش ہیں، یہ دونوں مورخ عیسائی ہیں، اور مصر کے باشندے ہیں، ان میں سے پہلا پادری یوٹیچیس ہے جس نے فتح اسکندریہ کا حال مفصل طور پر لکھا ہے، نیز عمر کے یہ سخت احکام، اسلام کے صحیح اور سچے اصول کے خلاف معلوم ہوتے ہیں، وہ صاف کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کی مذہبی کتابیں جو جنگ میں دستیاب ہوئی ہیں، جلائی نہ جائیں، نیز ناپاک سائنس: تاریخ، شاعری، طب، اور فلسفہ کی کتابوں کو بھی مسلمان اپنے کام میں جائز طریقہ سے لا سکتے ہیں،

۲ - موسیو رینان فرانسیسی نے "اسلام اور علم" پر جو مشہور لکچر دیا تھا، اور جو ۱۸۸۳ء میں پیرس میں چھپ چکا ہے، اس میں موسیو موصوف نے کتب خانہ اسکندریہ کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے،

" اگرچہ کہا جاتا ہے کہ عمرو بن عاص نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلا دیا، لیکن یہ کذب صریح ہے، کتب خانہ مذکور اس مدتوں پہلے جل چکا تھا،

---

[۵] تاریخ رومن امپائر فتح اسکندریہ ص ۹۱۲، طبع جدید،

۲۔ مشہور علمی مورخ ڈریپر لکھتا ہے :۔

"اس کتب خانہ کی آدھی کتابیں تو جولیس سیزر نے جلا دی تھیں، اور باقی اسکندریہ کے پادریوں نے اپنے اہتمام میں ضائع کرا دیں .... اگر بالفرض یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اس وحشیانہ بربادی کے بعد بھی یہ عظیم الشان کتب خانہ بچ رہا، تو ہزار سال کی فرسودگی، اور شاید تصرف بیجا کے اثر کا مقابلہ کرنے کے بعد اس کی تعداد کتب بہت کم رہ گئی ہوگی، اس کے علاوہ .... ایک ادنی درجہ کا غریب نحوی (یحیی) اس محتشم بالشان کتب خانہ کے قائم رکھنے اور جلانے کے مصارف کا کیونکر متکفل ہو سکتا تھا جس پہ بطلیموسیوں کے شاہانہ محاصل کا ایک بیش قرار حصہ صرف ہوا کرتا تھا، کتب خانہ کے جلنے کی جو مدت (چھ مہینے) بتائی گئی ہے، اس سے کتابوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا، جھلی کے کاغذ سے زیادہ برے ایندھن کا ہونا ممکن نہیں، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ سکندریہ کے حمامیوں نے دوسرا ایندھن چھوڑ کر چرمی اوراق جلانے پسند کئے ہوں، جن کی آنچ جیسی تیز ہو سکتی ہے، وہ تو ظاہر ہے، البتہ چراندکے ہر جگہ پھیل جانے میں شک نہ تھا،[۱] یہی محقق دوسری جگہ لکھتا ہے، :۔

"اس طرح وہ عظیم الشان اور قدیم کتب خانہ جس کو تاجداران سلسلۂ بطلیموسیہ نے جمع کیا تھا، اور جو سیزر کی آتش زنی سے بچ رہا تھا، اس جاہل (تھافیلیس) اور متعصب پادری کے ہاتھوں سے برباد ہو گیا (ص ۵۷)

---

[۱] معرکۂ مذہب و سائنس ڈریپر، ترجمہ مولانا ظفر علی خاں ص ۱۴۹-۱۴۷،

جرمن عالم مسٹر کریل نے بھی اورنٹیل کانفرنس منعقدہ ۱۸۷۸ء میں ایک خاص مضمون میں پرزور دلائل کے ساتھ اس واقعہ کی تردید کی ہے[1]،

۵۔ ڈاکٹر گستاولی بان مصنف تمدن عرب لکھتا ہے،

"کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام عمر پر لگایا جاتا ہے، اس کی نسبت میں اسی قدر کہوں گا کہ اس قسم کا وحشیانہ فعل عربوں کے اوضاع واطوار کے اس قدر خلاف تھا کہ تعجب ہوتا ہے کہ اس قسم کی مہمل کہانی رائج رہے، اور قبول کی جائے، ہمارے زمانہ میں اس واقعہ کی تردید ایسے عمدہ طور پر ہوگئی ہے کہ اس سے زیادہ بحث کی ضرورت نہیں، نہایت آسانی کے ساتھ اور بہت ہی صاف اور صریح حوالوں کے ذریعہ سے ثابت ہوسکتا ہے کہ عربوں سے بہت پہلے خود عیسائیوں نے اسکندریہ کے بت پرستوں کے کتب خانہ کو اسی اہتمام کے ساتھ برباد کردیا تھا جس اہتمام کے ساتھ انھوں نے اُن کی مورتیں توڑ ڈالی تھیں: اور اسی وجہ سے عربوں کے زمانہ میں کتابیں باقی ہی نہ تھیں، جو جلائی جاتیں،

ڈاکٹر لیبان اسی باب میں ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں، :-

"اس وقت عیسائی شہنشاہ تھوڈ وسیس نے نہ کہ حضرت عمرؓ نے جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں، بت پرستوں کی تمام عبادتگاہوں کو، اور دیوتاؤں کی مورتوں اور کتابوں کو نیست ونابود کردیا[2]،

---

[1] مضمون کتب خانہ اسکندریہ مندرجہ رسائل شبلی مطبوعہ،

[2] تمدن عرب لیبان مترجمہ شمس العلما، سید علی بلگرامی ص ۲۰۳ – ۱۰۲،

۶۔ موسیو سیدیو اپنی مشہور تصنیف تاریخ عرب میں لکھتے ہیں:۔

"بعض مورخین نے لکھا ہے کہ "عمرو بن عاص رضؓ نے حضرت عمرؓ سے مشورہ کیا کہ شہر ایبن کا مشہور کتب خانہ جو اسکندریہ میں ہے، اس کو کیا کیا جائے، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر اس کے جلانے کا حکم دے دیا، کہ اگر یہ کتابیں قرآن کے مخالف ہیں تو مضر ہیں، اور اگر موافق ہیں تو ہم کو ان کی ضرورت نہیں" لیکن یہ روایت صحت سے دور ہے، کیونکہ یہ ایک وحشیانہ فعل ہے، جو اطمینان اور سکون کی حالت میں صادر ہوا، (یعنی فتنہ، فتح کے مٹ جانے کے بعد جیسا کہ اس واقعہ کے راویوں نے بیان کیا ہے) علاوہ اس کے یہ قول کہ قرآن کے موافق ہونے پر وہ کتابیں بے فائدہ ہیں" بالکل ایک احمقانہ قول ہے، جس کی نسبت اس مشہور خلیفہ کی طرف نہیں کی جاسکتی، جس کی دانائی کو تمام دنیا کی قوموں نے تسلیم کر لیا ہے، اسی لئے اس واقعہ کو اس کے معاصر مورخین میں سے کسی نے بیان نہیں کیا، اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ان کتابوں کے جلانے کا حکم حضرت عمرؓ نے دیا تھا تو ان کی مقدار بہت کم ہو گی، کیونکہ بہت بڑا حصہ شہنشاہ تھوڈسیس کے عہد میں سنہ ۳۹۰ھ میں جل چکا تھا[1]،

۷۔ مولفین چیمبرس انسائیکلوپیڈیا لکھتے ہیں:۔

"جب جولیس سیزر نے شہر اسکندریہ کا محاصرہ کیا تو کتب خانہ کا بہت بڑا حصہ جل گیا، لیکن شاہ برگاسیس نے ملکہ کلوپیٹرا کو اپنا کتب خانہ دے کر کتبخانہ اسکندریہ کو پھر اپنی پہلی صورت پر آباد کر دیا، یہ کتب خانہ تھیوڈسیس اعظم

---

[1] تاریخ عرب سیدیو مترجمہ علی مبارک پاشا مصر ص ۸۱۔

کے زمانہ تک رہا، جب اس شہنشاہ نے تمام ملک میں بُت پرستوں کے عبادت خانوں کے منہدم کر دینے کا حکم دیا، تو اُن کے ساتھ سراپیس کا ہیکل بھی جہاں یہ کتب خانہ تھا، منہدم کر دیا گیا، اور ۳۹۱ء میں کتب خانہ میں آگ لگا دی۔ یہ کتب خانہ عربوں نے نہیں جلایا، جیسا کہ ان پر جھوٹ الزام لگایا جاتا ہے، مگر یہ قصہ نہایت بیہودہ طور سے مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔[۱]

۸۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے محققین بھی اس واقعہ کو قصہ اور کہانی سے زیادہ وقعت نہیں دیتے، فتح اسکندریہ کے ذکر کے بعد وہ ظرافت کے پیرایہ میں کہتے ہیں،

"یہ کہانی ابو الفرج کی زبانی بیان کی گئی ہے، کہ ..... عمرو بن عاص نے حضرت عمرؓ کے حکم سے سراپیم کے کتب خانہ کو برباد کر دیا، اور ان کو پبلک حماموں میں جو بہت کثرت سے اسکندریہ میں موجود تھے، تقسیم کر دیا، ان کتابوں کی چھ مہینہ تک یہ خدمت تھی کہ وہ آگ کے لئے رسد تیار رکھیں"۔[۲]

۹۔ جارج وائٹ اور جیمس اہلویلر اپنی تصنیف "جرائم اہلِ یورپ" میں لکھتے ہیں:۔

"اہلِ یورپ (روم) نے بت پرستوں کو پامال کر دیا، اور ان کی سخت خونریزی کی، شہنشاہ تھیوڈوسیس نے بت پرستوں کے بت وغیرہ توڑ دیے، اسکندریہ کا بشپ بھڑک اٹھا، اور اپنے پیروں کو لے کر سراپیس کے ہیکل میں آیا، اس کو برباد کر دیا، اور جب بت پرستوں کے تمام معابد برباد کر چکا، تو کتب خانہ میں گیا، اور تمام کتابیں جلا دیں، یہاں تک کہ تمام الماریاں خالی ہو گئیں، اور کسی کو وہاں سکے بعد حسرت و افسوس کے سوا اور کچھ نظر نہیں آیا، جس شخص نے اس کتب خانہ

---

[۱] چیمبرس انسائیکلو پیڈیا، جلد اول ص ۱۳۱ [۲] برٹانیکا انسائیکلو پیڈیا، جلد اول ص ۵۹۲

جلایا، وہ پیٹر یارک تھیافلس ہے، جس نے شہنشاہ تھیوڈوسیس کے حکم سے اسکندریہ میں مسلمانوں کے داخل ہونے سے بہت پہلے برباد کر دیا تھا، اور یہ معلوم ہو کہ مذہب اسلام میں کتابوں کا جلانا ممنوع ہے،

۱۰- ڈیلون: اپنی تصنیف "خرافات اہل یورپ" میں لکھتا ہے:-

" وہ دونوں کتب خانے جن کو بطلیموسیوں نے اسکندریہ میں قائم کیا تھا، سیزر کی فوج کے ہاتھ سے جو اُس نے اسکندریہ کا محاصرہ کیا تھا، جل گئے" لیکن اس جرم کی مکافات میں وہ کتب خانہ جس کو یومینیز شاہ پرگامیس نے قائم کیا تھا، مارک انٹونی کی وساطت سے ملکہ کلیوپیٹرا کو ہدیۃً دیا گیا، لیکن زمانہ جہالت نے فیصلہ کر دیا تھا کہ عظیم الشان کتب خانہ چند صدی بھی باقی رہے، پیٹر یارک تھیافلس نے اُن کو جلا دیا،

(۱۱) جان مبارک اپنی تصنیف "دعوا ہائے کاذبہ" میں کہتا ہے:-

" اہل یورپ نے کتب خانہ اسکندریہ کو جلایا، اور مسلمانوں ہی نے علم یورپ میں پہونچایا،

(۱۲) مسٹر ہسلی اسٹیفونس اپنی تصنیف "خیال اور مذہب" میں لکھتے ہیں:-

"کتب خانہ اسکندریہ جاہلوں کے ہاتھ سے برباد ہو گیا، اور اس مہتم بالشان کتب خانہ کی بربادی سے علم برباد ہو گیا، اور یورپ جہالت کی تاریکیوں میں اُس وقت تک بھٹکتا رہا۔ جب تک مسلمانوں نے اپنے علوم وفنون کی روشنی سے اس کو منور نہیں کیا،

(۱۳) بٹنس اپنی انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے،

"جولیس سیزر نے جب شہر اسکندریہ فتح کیا، تو پہلا کتب خانہ جل گیا، اور وہ دوسرا کتب خانہ جو اس کے بعد قائم کیا گیا تھا، باقی رہ گیا، اس کتب خانہ میں ان کتابوں کا بھی اضافہ ہوا، جو مارک انتونی کی وساطت سے ملکہ کلیوپیٹرا کو ہدیتہً دی گئی تھیں، جس سے یہ کتب خانہ پہلے برباد شدہ کتب خانہ سے بڑا ہوگیا، اور سنہ ۳۹۰ء تک قائم رہا۔ جب کہ اہل یورپ نے بت پرستوں پر مظالم کئے، اور ان کے ہیکل منہدم کر دیئے، جن میں سراپیس کا ہیکل بھی تھا، تو کتب خانہ کو جلا دیا"

۱۴۔ جارج اپنی تصنیف "تریاق خرافات" میں دو جگہ لکھتا ہے :۔

"خبر ہے کتب خانہ اسکندریہ کیا ہوا؟ جواب دو کہ یورپ کی وحشی قوموں نے اس کو تھیوڈوسیس کے حکم سے سنہ ۳۹۰ء میں جلا دیا، یہ خاموش کتابیں زبان حال سے اس الزام کی تکذیب کر رہی ہیں، جو رومیہ میں گڑھا گیا کہ مسلمانوں نے عمر کے حکم سے اس کو جلا دیا، عمر کی طرف یہ جھوٹا انتساب بالکل بہتان اور افترا ہے۔"

۱۵۔ جارج وایٹ اور جمیس اہو یلرا اپنی تصنیف "جبر امم اہل یورپ" میں ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں :۔

"تھیوڈوسیس نے فرفوریس کی تمام علمی کتابیں جلا دیں، اور ان تمام کتابوں کے برباد کر دینے کا حکم دیا، جو مذہب کے مخالف ہوں، (پھر کہتا ہے)، اور جس نے کتب خانہ اسکندریہ جلایا وہ تھیافلیس ہے، نہ مسلمان، کیونکہ مذہب اسلام میں کتابوں کا جلانا ممنوع ہے، علاوہ بریں تمام قدیم مؤرخین جو اسلام کے ابتدائی

عہد میں تھے، انھوں نے کتب خانہ اسکندریہ کا مطلق ذکر نہیں کیا ہے،

باوجود اس کے انھوں نے نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں کو بیان کیا ہے،

۱۶ - بشپ جوزف اپنی کتاب تاریخ شام میں عام روایت کے بیان کرنے کے بعد ان الفاظ میں اپنی تحقیق ظاہر کرتا ہے[۱]،

اُس قصہ کو بہت سے عیسائی اور بعض مسلمان مورخین نے روایت کی ہے لیکن محققین اس کو صحیح نہیں سمجھتے۔"

۱۷ - اس سلسلہ کی سب سے مقدم اور سب سے بڑی شہادت، اسپین کے مورخ اور وسنس کی عینی شہادت ہے جس کا زمانہ پانچویں صدی عیسوی کا ہے شہنشاہ تھیوڈوسیس کے حکم سے تھیا فلیس جب کتب خانہ کو برباد کر چکا تھا اس کے بیس برس کے بعد اور وسنس نے کتب خانہ کی عمارت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، وہ بیان کرتا ہے کہ "میں نے اس وقت کتب خانہ میں صرف خالی الماریاں دیکھی تھیں، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے مدتوں پہلے یہ علمی یادگار ہیں خود عیسائیوں کے تعصب مذہبی کی نذر ہو چکی تھیں

ان شہادتوں کے بعد جو خود اہل یورپ کی زبانوں سے نکلی ہیں، اس امر میں کچھ شبہ نہیں رہتا کہ مسلمان اس الزام سے بالکل بری ہیں، جو بعض کوتاہ نظر متعصب اہل یورپ ان پر لگانا چاہتے ہیں، حضرۃ الاستاذ نے اپنے مضمون کے خاتمہ پر لکھا تھا کہ امید ہے کہ وہ دن بھی آئے، جب زیادہ غور و تحقیق کے بعد تمام یورپ متفق ہو کر علانیہ کہدے کہ

ع ہم الزام اُن کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

لیکن ہم کہتے ہیں کہ اب وہ زمانہ آ گیا جب زیادہ غور و تحقیق کے بعد تمام یورپ متفق

---

[۱] نمبر ۹ سے لے کر ۱۶ نمبر تک کے حوالوں کے لئے دیکھئے، رسالۃ المقتبس، ج ۴ ص ۵، ۶، ۷،

ہو کر ملانیہ کہہ اٹھا،

ع ہم الزام اُن کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

(الندوہ اگست ۱۹۱۰ء)

(۲)

کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق نفیاً اور اثباتاً ہر پہلو سے اس قدر بحثیں ہو چکی ہیں کہ بظاہر اب کوئی نیا پہلو بحث کا نظر نہیں آتا لیکن ایک انگریز اہل قلم نے اس مسئلہ کے ایک ایسے پہلو پر قلم اٹھایا ہے جس کی طرف کسی مخالف یا موافق کی نظر اب تک نہیں اٹھی ہے، کتب خانہ اسکندریہ کی جو داستان تصنیف ہوئی ہے۔ اس کے ہیرو کا نام یحییٰ نحوی ہے، یحییٰ نحوی ہی حضرت عمرو بن العاصؓ کی خدمت میں آتا ہے، وہی ان سے کتب خانہ کی تاریخ بیان کرتا ہے،

حضرت عمرو بن العاصؓ، حضرت عمرؓ بن خطاب سے اس کتب خانہ کے بارے میں حکم چاہتے ہیں، حضرت عمرؓ اس کے جلا دینے کا حکم دیدیتے ہیں؛ اور اسکندریہ کا یہ قدیم اور نایاب کتب خانہ اسکندریہ کے حماموں میں چھ مہینے تک آگ سلگانے کے کام میں آتا ہے۔ اب تک اس قصہ کی تردید و تکذیب میں جن یورپین اور مسلمان مورخین نے جو دلائل قائم کئے ہیں، اُن سب میں یہ مسلّم تھا کہ یحییٰ نحوی اس عہد میں موجود تھا، اور وہی اس قصہ کا ہیرو قرار پاتا ہے، لیکن مسٹر بٹلر نے اپنی تصنیف "فتح مصر" میں جہاں

اسکندریہ کا ذکر کیا ہے وہاں کتب خانۂ اسکندریہ کے متعلق ثابت کیا ہے کہ عربوں کی فتح سے پہلے یہ کتب خانہ برباد ہو چکا تھا، اور سب سے بڑی دلیل یہ قائم کی ہے کہ اس روایت کے (جس میں عربوں کے ہاتھ سے کتب خانہ کا برباد ہونا بیان کیا گیا ہے) وضعی اور جعلی ہونے پر سب سے زیادہ قطعی شہادت یہ ہے کہ اس روایت کا ہیرو یعنی یحییٰ نحوی کا اس عہد میں وجود تاریخی اسناد کے بالکل مخالف ہے۔ اگر وہ اس عہد میں موجود ہوتا تو اس کی عمر ۱۳۰ برس سے بہت زیادہ تسلیم کرنی پڑے گی،

مسٹر بٹلر نے ۲۵ جون ۱۹۱۱ء کے ٹائمز میں اس مضمون کی خوب دھجی اڑائی ہے، لکھا ہے کہ

"نہایت تعجب کی بات ہے کہ لوگ پھر اس واقعہ کو از سر نو دہرا رہے ہیں، کہ عمر نے اسکندریہ کا کتب خانہ جلا دیا۔ اور عجیب تر بات یہ ہے کہ اس قسم کے مضامین ٹائمز جیسے وقیع اخبار میں شائع ہوں، میں سمجھتا ہوں کہ مضمون نگار نے اس مسئلہ پر علمی اور تاریخی پہلوؤں سے غور نہیں کیا ہے، اور اگر کرتا تو اس کو معلوم ہو جاتا کہ جن چیزوں کو وہ جدید دلائل سمجھ رہا ہے وہ اس موضوع کی پیش پا افتادہ باتیں ہیں، جن پر اس مسئلہ کی تحقیق میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا،

میں نے اپنی تصنیف "فتح مصر" میں اس بحث کے متعلق ایک خاص باب قائم کیا ہے۔ جس میں واضح دلائل سے حسب ذیل نتائج منتج کئے گئے ہیں،

۱۔ کتب خانۂ اسکندریہ کے جلانے کا واقعہ فتح مصر کے پانچسو برس کے بعد یورپی تصنیفات میں شائع کیا گیا ہے، اس کی اشاعت کرنے والے عبداللطیف بغدادی جمال الدین قفطی، ابو الفدا، اور مقریزی ہیں، اور اس میں بھی شک نہیں کہ ابوالفرج نے اپنی روایت عبداللطیف سے حاصل کی ہے، یہ تحقیق کوئی جدید نہیں ہے، بلکہ پہلے سے مشہور، معروف، اور متداول ہے،

۲۔ اس واقعہ کے متعلقات جو بیان ہوتے ہیں،

۳۔ اس واقعہ کا ہیرو یوحنا (یحیٰی) فیلیونوس ہے، اور عربوں کے مصر فتح کرنے سے پہلے مرچکا تھا،

۴۔ اسکندریہ میں دو مہتم بالشان کتب خانے تھے، ایک عجائب خانہ کا کتبخانہ اور دوسرا سیراپیم کا کتب خانہ، اس واقعہ میں جس کتب خانہ کا نام لیا جاتا ہے وہ انہی دونوں کتب خانوں میں سے کوئی ایک ہوگا، لیکن پہلا کتب خانہ جولیس سیزر کے معرکہ میں مسلمانوں کے فتح مصر سے چار سو برس پہلے برباد ہوچکا تھا، دوسرے کتب خانہ کے متعلق تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ یا تو ۳۹۱ء میں وہ دوسری جگہ منتقل ہوگیا تھا، یا اسی سنہ میں وہ تلف ہوگیا، اس بنا پر ۶۴۲ء میں یعنی مسلمانوں کے مصر فتح کرنے کے وقت اسکندریہ میں کسی کتب خانہ کا وجود نہ تھا، پانچویں، چھٹی، اور ساتویں صدی کی تصنیفات میں اسکندریہ کے کسی کتب خانہ کا ذکر نہیں ہے،

(۵) اگر کتب خانہ فتح اسکندریہ کے وقت وہاں موجود تھا، تو اس کو اس زمانۂ صلح میں جو اسکندریہ کو مسلمانوں کے سپرد کردینے سے پہلے رومیوں

کو ازروے معاہدہ دوسری جگہ منتقل کرنا آسان تھا، کیونکہ معاہدہ کی ایک دفعہ یہ تھی کہ بیش قیمت چیزیں، رومی اپنے ساتھ لیجا سکتے ہیں، دریا کا راستہ اس زمانہ میں بالکل کھلا ہوا تھا،

۷- اگر بالفرض یہ کتب خانہ دوسری جگہ منتقل ہوتا، یا برباد کر دیا جاتا، تو اُس زمانہ کا مشہور مورخ نیکیو اس واقعہ کے ذکر سے خاموش نہ رہتا،

ان وجوہ کی بنا پر اڈیٹر الہلال نے کوئی ایسی بات نہیں کہی، جو نئی ہو، بلکہ یہ وہی پرانی اور پیری بات ہے، اور مضمون نگار نے آپ کے اخبار کے کالموں میں اپنی جہالت کے ثبوت کے علاوہ کوئی تاریخی دلیل نہیں پیش کی، جس سے واقعہ کا ثبوت ہو،

مسٹر بٹلر کی تحقیقات جہاں تک پہنچی ہے، اُن میں یحیٰی نحوی کے زمانہ وجود کے علاوہ اور تمام باتیں اس سے پہلے بدلائل بار بار ثابت کی جا چکی ہیں، ہم مسٹر بٹلر کے اُن دلائل سے واقف نہیں ہیں، جن سے انھوں نے زمانہ فتح مصر میں یحیٰی کے موجود نہ رہنے پر استدلال کیا ہے، یحیٰی کا جن عربی تصنیفات میں ذکر ہے، وہ سب ایک ایک کرکے نظر کے سامنے تھیں، اور متعدد بار پڑھی بھی جا چکی تھیں، لیکن کبھی یحیٰی کے زمانہ وجود کی تحقیق کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوا، لیکن مسٹر بٹلر کے مضمون کے بعد ابن الندیم کی الفہرست میں وہ عبارت بغور پڑھی جو یحیٰی کے متعلق ہے، تو معلوم ہوا کہ چوتھی صدی کے مورخ ابن الندیم کو بھی عربوں کے فتح مصر کے وقت یحیٰی کے وجود پر اعتراض تھا،

(الندوہ دسمبر ۱۹۱۱ء)

اسلامی ہندوستان کا عہد آخر اور علوم جدید

مسلمانوں کے ذوق طلب اور لیلائے علم کے ساتھ اُن کے عشق کی داستان سیکڑوں بار دہرائی جا چکی ہے، دمشق، بغداد، مصر اور اسپین میں جو کچھ ہوا، اُس کا ایک ایک حرف بھی سنایا جا چکا ہے۔ ابتدائی صدیوں میں ایران و مصر و یونان کے علوم و فنون کے جو تراجم عربی زبان میں منتقل کیے گیے، وہ بھی نظر کے سامنے ہیں۔ لیکن منکرین کی زبانوں پر ہمارے دعوے کے ثبوت کے لیے ابتک "ھل من مزید" کی صدا بلند ہے۔

دنیا کی تمام قوموں کو اپنے اپنے عروج و ترقی کے زمانوں میں اس قسم کے کارناموں کے انجام دینے کا دعوی ہے، اور بجا دعوی ہے، لیکن یہ شرف مسلمانوں ہی کو حاصل ہے کہ اُن کا یہ شوق علاوہ دلولۂ علمی اور جذبات فطری کے درحقیقت اُن کی قومیت کے شیرازہ بند اور ان کے وجود کے مکون اعظم کے اشارۂ فرمان کا ایک طرب انگیز منظر تھا۔ داعی اسلام علیہ السلام نے کہا،

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن	حکمت کی بات ایک مومن کی گم شدہ
حیث وجدھا فھو احق بھا	دولت ہے۔ جہاں پائے وہ اسکا مستحق ہے

ہم نے عرب سے نکل کر، جب مصر و شام میں قدم رکھا، سریانیوں، قبطیوں، اور رومیوں اور یونانیوں کے پاس یہ دولت نظر آئی۔ ہم بڑھے اور بڑھ کر، اپنی دولت

ان سے چھین لی، عراق وفارس کی طرف گذر ہوا، تو کسریٰ کے خزانوں میں بھی کچھ گم شدہ جواہر ریزے نظر آئے، ان کو بھی اٹھا کر جیب و آستین میں رکھ لیا، ہندوستان کی طرف قدم بڑھا، تو پنڈتوں کی پوتھیاں نظر آئیں، ان بوڑھے پراتموں نے ہر چند چاہا کہ ان ملیچھ لٹیروں کو ایسی گراں بہا دولت نہ دی جائے، لیکن ہم نے کبھی سمجھا بجھا کر، کبھی پھسلا بہلا کر کچھ پتر کچھ پتّے لے ہی لیے،

اب ہمارے انحطاط کا زمانہ تھا، قویٰ میں اضمحلال اور دورۂ خون میں سکون آچلا تھا، ایک ہزار برس کی جد و جہد اور سعی و محنت سے ہم تھک کر چور ہوگئے تھے کہ نوجوان سرمایہ داروں کا سامنا ہوگیا، جن کی رگ رگ میں آغاز شباب کی لہر تھی، جن کے بند بند میں شہزوروں کی قوت تھی، ان کے ساز و سامان و متاع پر نگاہ پڑی تو نیا اور اپنے سے بہتر اور گرانقدر قیمت پایا، اس قصہ پر تین صدی سے زیادہ گذرنے کو آئی، لوگوں نے یہ داستان فراموش کردی ہوگی، لیکن ہم کو یاد ہے کہ بایں ہمہ پیری و ناتوانی، اگر ہم ان سے کچھ چھین نہ سکے تو نوچ کھسوٹ میں کچھ مال اُن سے ضرور ہاتھ آیا، یہ یورپ کی نوخیز قومیں تھیں، جن کا تانتا ہندوستان کے سواحل پر سولھویں صدی سے لگنا شروع ہوگیا تھا، اندرونِ ہندوستان میں اہل یورپ کی آمد، سترہویں صدی کا واقعہ ہے، شہنشاہ اکبر ان دنوں فرمان روا تھا، ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے انجیل بالکل نئی چیز تھی، اکبر کے حکم سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، ہندوستان میں یوروپین زبانوں کی تاریخ تراجم کا یہ سب سے پہلا صفحہ تھا، خانخاناں جو دربار اکبری کا ہفت زبان بلبل تھا، اس کو فرنگی زبان سیکھنے کا فرمان ملا، عبد الباقی خان مآثر رحیمی میں لکھتا ہے:-

چوں اکثر بنادر ہندوستان در تصرف مسیحیہ است . . . و مکاتبات و مراسلات
در میانہ سلاطین افرنجیہ و خوانین ہندوستان بسیار واقع می شود، بادشاہ
ظل اللہ اکبر شاہ این سپہ سالار (عبد الرحیم خانخاناں) را بہ فراگرفتن زبان
عیسوی و بہم رسانیدن سواد و خط این قوم فرمان داد، بہ اندک اختلاط
و صحبتے کہ با خاصانِ آں قوم کہ در پائے تخت بادشاہی بودند و تجار و تردّد
ایشاں نمود بہ دستور متبع آن خط و زبان آں قوم کرد کہ بے شائبہ ریا بہتر
از آں قوم می داند۔

جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد میں اہل یورپ کا علمی حیثیت سے کوئی
پایہ نہ تھا، ہندوستان میں اُن کی شہرت اور ناموری کا ذریعہ صرف تین چیزیں تھیں،
جہازرانی و تجارت اور جراحی، انقلاباتِ روزگار سے صرف تیس چالیس سال میں
ہندوستان کی زمین و آسمان بدل گئی، تمام ممالک میں سیاسی اضطرابات پیدا
ہوگئے، نادرشاہ اور احمد شاہ نے پنجاب سے دلی تک اور مرہٹوں نے دکن سے
پنجاب تک ایک خاک سی اڑادی تھی، ابھی یہ شعلے فرو بھی نہ ہونے پائے تھے کہ
سکھوں نے سر اٹھایا، بادشاہ گردی نے تیموریوں کی فرماں روائی کا رہا سہا ساکھ
بھی اٹھا دیا تھا، صوبہ داریوں نے بڑھ بڑھ کر بادشاہیوں کا دعوی کیا، ان تمام
شورشوں، ان تمام ہنگاموں اور ان تمام فتنوں کے باوجود جب ذرہ بھی فراغ
خاطر نصیب ہوا، نئے استادوں سے سیکھنے میں ہندوستان نے تامل نہ کیا، بحری،
فوجی اور انتظامی حیثیت سے جس حد تک تعلیم حاصل کی گئی تھی، وہ لاہور، میسور،
حیدرآباد اور پونہ کی گذشتہ سیاسی تاریخ میں مدفون ہے اور اس سے ہم کو اس وقت بحث نہیں،

اس مضمون میں ہم کو صرف علمی حیثیت کا مرقع کھینچنا ہے،

اس سلسلہ میں علاً سب سے پہلا کام سنہ ۱۱۲۶ھ میں دلی میں جدید طرز پر ایک رصد خانہ کا قیام ہے، محمد شاہ کے حکم اور راجہ سوائی سنگھ والیِ جے پور کے اہتمام سے یہ رصد خانہ قائم ہوا تھا، اس رصد خانہ کی تعمیر پر بیس[20] لاکھ صرف ہوئے تھے،

مرزا خیر اللہ مہندس اور دیگر علماے ہند و ایران کے علاوہ متعدد یورپین ماہرین علم ہیئت، اس کی تعمیر و تنظیم میں شریک تھے۔ بہت سے آلات اس میں یورپ سے منگوا کر نصب کیے گئے تھے۔

مشرق کا یہ سب سے پہلا رصد خانہ تھا، جس نے یورپ کی جدید تحقیقات کی تصدیق کی، اس رصد خانہ کی تحقیقات کا مجموعہ زیچ محمد شاہی کے نام سے فارسی میں موجود ہے، اور رامپور کی اور نیشنل لائبریری میں ہماری نظر سے گذری،

"مسلمان اور ہیئت" کے عنوان سے الندوہ میں ہم نے جو مضمون لکھا تھا، اس میں اس رصد خانہ کی چند تحقیقات کی تفصیل کی ہے، یہاں جامع بہادر خانی کی اس عبادت کو پیش کرتے ہیں:

"در رصد محمد شاہی ہم در ارصاد فرنگ ثابت شدہ است کہ زہرہ و عطارد نیز اکتساب نور از شمس می کنند و حوالی احتراق آنہا را ہلالیت عارض می شود (صفحہ ۰)

جدید ہیئت کے مطابق بعض سیارات کے گرد چاندوں کا گردش کرنا، زحل کا ہلیلجی الشکل ہونا، آفتاب کے چہرہ پر داغ ہونا، بعض ثوابت کا حقیقت میں سیارہ ہونا بھی، اس رصد خانہ سے ثابت ہوا،

علم ہیئت اور ہندسہ کے آلات شروع شروع ہندوستان میں یورپ سے آئے تھے، بعض علمائے ہند نے جب ان کو دیکھا تو بنہایت پسند کیا، سر سید کے نانا خواجہ فرید جو اکبر ثانی شاہ دہلی کے وزیر تھے انھوں نے "فوائد الافکار فی اعمال الفرجار" فن پرکار سازی پر فارسی میں ایک رسالہ لکھا ہے، اس کے دیباچہ میں آلۂ پرکار کی واقفیت کی نہایت دلچسپ تاریخ بیان کی ہے، لکھتے ہیں۔

کتب ریاضی کے کسی حاشیہ میں میری نظر سے گذرا تھا کہ آلات ریاضی میں سے ایک آلہ تھا، جس کو پرکار متناسبہ کہتے ہیں، اس سے اکثر اعمال نجومی اور بعض اشکال ہندسی اور مسائل حسابی آسانی سے حل ہو جاتے تھے، مگر چونکہ وہ آلہ مفقود ہے اس لیے اب اس کا علم اور عمل بھی باقی نہیں رہا،

اس کے سوا میں نے اپنے بعض اساتذہ سے بھی ایسا ہی سنا تھا، اس لیے اوس آلہ کے دیکھنے کا مجھے کمال اشتیاق تھا، جس ریاضی دان سے ذکر کرتا وہ لاعلمی بیان کرتا، اور اکثر کہتے تھے، کہ اس معمولی پرکار کے سوا جو دائرہ کھینچنے اور خطوط کے ناپنے میں استعمال ہوتا ہے، اور کوئی پرکار نہیں، جب ۱۲۱۹ھ میں میرا لکھنؤ جانا ہوا، وہاں جنرل مارٹین اور مسٹر گور اوسلی سے ملاقات ہوئی، . . . . ان کے پاس میں نے لوہے اور پیتل کا بنا ہوا ایک عجیب آلہ دیکھا، میں نے اس کا حال پوچھا، انھوں نے کہا یہ پرکار تقسیم ہے، اس سے خطوط، دوائر، سطوح اور اجسام مختلفہ کی تقسیم آسانی سے ہو جاتی ہے؛

یہ آلہ جنرل مارٹین کا تھا، میں نے ان سے مستعار لے لیا، اور مجھے یقین ہو گیا کہ

پرکار متناسبہ یہی ہے، چونکہ مسٹر گوراوسلی نے اس آلہ سے چاروں مذکورۂ بالا عمل میرے سامنے کیے تھے۔ مجھے خیال ہوا کہ دیکھیں اس سے کوئی عمل نجومی بھی استخراج ہوتا ہے یا نہیں، آخر جب اُس سے کوئی عمل نہ ہوسکا، تو میں نے سمجھا کہ یہ پرکار متناسبہ نہیں ہے، اگرچند روز غور کرنے کے بعد میں نے اسی اصول کے مطابق اس کے بنانے کا طریقہ ذہن نشین کرکے ویسا ہی ایک پرکار چاندی کا تیار کیا

مسٹر گوراوسلی نے اس کو مجھ سے لیکر نواب سعادت علی خاں کی خدمت میں پیش کیا، اور نہایت تعجب ظاہر کیا، کہ اکثر لوگ اس پرکار کے عمل سے بھی واقف نہیں ہیں، چہ جائے کہ ایسا پرکار خود بنالیتا کہ ولایت میں بھی ہر شخص نہیں بنا سکتا، سر گوراوسلی نے کہا کہ مجھکو صرف اس قدر معلوم ہے کہ پرکاروں کے گنج میں ایک آلہ ایسا بھی ہے، جس سے یہ پرکار تیار ہوتا ہے۔ مگر میں یہ نہیں جانتا کہ کس طرح تیار ہوتا ہے، تم نے بغیر آلہ کے یہ پرکار کیونکر بنالیا؟

چونکہ میں نے کبھی گنج پرکار دیکھا نہ تھا، میں نے اس کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا، سر گوراوسلی نے اپنے بکس میں سے گنج نکال کر وہ آلہ مجھکو دکھایا، اس پر بہت سے ہندسے اور خطوط کندہ تھے، مینے ان کا حال پوچھا، انھوں نے دو تین عمل کرکے دکھائے، اور کہا کہ میں اس سے زیادہ نہیں جانتا، لیکن میں نے سنا ہے کہ اس سے بہت سے اعمال ہندسی اور حسابی اور اکثر اعمال نجومی ہوسکتے ہیں، مگر میں بلکہ ہندسوں کے سوا کوئی انگریز نہیں جانتا، وہ گنج چونکہ نہایت عمدہ اور نفیس تھا، گو میرا جی بہت للچایا، مگر مستغنا

مانگنا مناسب نہ جانا،

اس کے بعد میں نے کئی پرکار تقسیم پیتل کے تیار کرکے اور انگریزی ہندسوں کے بجائے فارسی ہندسہ کندہ کرکے اپنے دوستوں کو دیئے، چند روز کے بعد جب میرا کلکتہ جانا ہوا، وہاں جاکر میں نے ایک گنج پرکار خریدا، جس میں وہ آلہ مطلوبہ بھی تھا، میں نے نہایت کوشش اور فکر و غور سے اس کے اعمال دریافت کئے، اور عمل استخراج ظل اور اکثر اعمال ہندسی اور نجومی نکالے، اور مجھکو یقین ہوگیا کہ پرکار متناسبہ جو کبھی عرب و عجم میں مروج تھا، وہ یہی ہے، اور اب یورپ کے سوا کہیں رواج نہیں رہا،

یہ ایک ضمنی اور سرسری واقعہ تھا، لیکن کس قدر سرتاپا عبرت اور حسرت تھا خواجہ نے اس جملہ معترضہ کے بعد پرکار کے فوائد و اعمال پر فارسی میں رسالہ لکھا جسکا قلمی نسخہ علی گڑھ کی کالج لائبریری میں موجود ہے،

اسی زمانہ کے قریب یعنی ۱۲۵۳ھ میں دلی میں جدید علوم کے واقف کار دو اور بزرگوار بھی تھے، میر امان دہلوی اور غلام محی الدین دہلوی، دونوں حیدرآباد میں رہتے تھے، اور انگریزی زبان سے کتابوں کے اردو فارسی میں ترجمے کرتے تھے دلی جب مٹی تو اس خمیر سے دو اور گھروندے تیار ہوئے، لکھنؤ اور حیدرآباد، ان کے علاوہ انگریزوں کی نوخیز حکومت کا مرکز کلکتہ تھا، ان میں سے ہر مقام میں اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ کام انجام پایا ہے،

لکھنؤ لکھنؤ کا سایۂ اقبال اگرچہ دیرپا نہ تھا، تاہم جب تک بھی رہا، بڑے بڑے ارباب فن اور اصحاب کمال کا مرجع رہا، حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر

علماء ہی سرافراز تھے، اور انگریزوں سے برابری کے دعوی کے ساتھ ملتے تھے، اس لئے ان کی صحبت سے متاثر ہونے کا موقع ان کو زیادہ ملتا تھا، بادشاہ اودھ کی طرف سے لندن میں ایک سفیر رہتا تھا، یہ بھی گروہ علماء ہی سے منتخب ہوتا تھا، مولوی محمد اسمٰعیل اور مولوی محمد حسین ابتک اسی بناپر لندنی کہلاتے ہیں، مولوی محمد اسمٰعیل لندنی کا ہیئت میں ایک رسالہ ہے، ندوہ کے کتب خانہ میں موجود ہے، اس میں امریکہ کا ذکر اور یورپ کے علمی اکتشافات کا تذکرہ ہے،

مولوی محمد حسین کا ایک عربی خط ہے، اور خط کیا درحقیقت رسالہ ہے، یہ رسالہ ہے یہ رسالہ نہایت خوشخط ندوہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس رسالہ میں اپنے ایک دوست کے سامنے یورپ کے عجائبات کا نہایت عمدہ نقشہ کھینچا ہے، پہلے یورپ کا جغرافیہ لکھا ہے، پھر وہاں کی علمی ذوق وشوق کی کیفیت، مطابع کے فوائد اور منافع لکھے ہیں، تصنیفات کی کثرت دکھائی ہے، بتایا ہے کہ مشرقی زبانوں کے ساتھ بھی ان کو کس قدر اعتنا ہے، پھر اون کے علوم وفنون پر ایک مختصر ریویو کیا ہے، بعض مصنفین کا تذکرہ کیا ہے، جارج سیل کے ترجمۂ قرآن پر حیرت ظاہر کی ہے، بتایا ہے کہ الہیات کو انھوں نے بیہودہ اور بیکار سمجھ کر علم سے خارج کردیا ہے، اور منطق بقدر کفایت سیکھتے ہیں، اس کے بعد ان کے بعض اختراعات کا تذکرہ ہے، اور آخر میں جدید علم ہیئت میں یورپ کے اکتشافات کی تفصیل ہے،

یہ رسالہ مجھے اس قدر پسند آیا تھا کہ اس کی اصل عربی مع اردو ترجمہ کے مشہور عربی رسالہ البیان ۱۳۳۱ھ میں جو کبھی میری اڈیٹری میں لکھنؤ سے شائع ہوتا تھا، چھپوادی تھی، اور ناظرین نے اس کو بڑے شوق سے پڑھا تھا،

اس زمانہ کے مشاہیر علماء میں لکھنؤ میں تفضل حسین خان تھے، جو علامہ کے خطاب سے مخاطب تھے۔ علامۂ ممدوح کو یورپ کی متعدد مردہ اور زندہ زبانوں پر عبور تھا، علمِ ہیئت میں اس عہد میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، چونکہ بڑے بڑے مناصب پر ہمیشہ ممتاز رہے، اس لیے عقلائے فرنگ سے شب و روز کی صحبتیں رہتی تھیں، جدید علوم کی طرف شوق و توجہ پیدا ہونے کا یہی سبب ہے۔

نصیر الدین حیدر کے عہد میں مولوی عبد الرب، کمال الدین حیدر، اور مفتی اسمٰعیل بن وجیہ مراد آبادی نہایت مشہور ماہر فن تھے، لکھنؤ میں جو یورپین علماء تھے، اُن سے صحبت رہتی تھی، ۱۲۴۷ھ میں نصیر الدین حیدر کا عہد اور مہدی علی خان کی وزارت تھی، کہ لکھنؤ میں ایک رصد خانہ کے قیام کا خواب دیکھا گیا، ہربرٹ نام ایک انگریز عالم ۱۶۰۰ ماہوار پر اس کا مہتمم قرار پایا، خورشید منزل کے پاس جنرل مکلاؤڈ کی بنائی ہوئی ایک کوٹھی تھی، اس مقصد کے لیے اسی مقام کا انتخاب ہوا، رصد خانہ ابھی زیرِ تعمیر ہی تھا، کہ ہربرٹ کا انتقال ہو گیا، جب محمد علی شاہ کا زمانہ آیا تو نئے سرے سے اس کام کا خیال آیا، بادشاہ نے بھی اس غرض کے لیے بڑی فیاضی سے روپیہ دیا، چار لاکھ روپیہ صرف اس کی عمارت پر صرف ہوا، خطوط و دوائر کے کھینچنے کے لیے پچاس ہزار کا پتھر مرزا پور سے منگوایا گیا تھا، اور ایک لاکھ روپیہ کے آلات لندن سے آئے تھے رصد خانہ کا اہتمام کرنل ولکاکس کے متعلق تھے۔ دس برس میں تعمیر تکمیل کو پہنچی، رصد خانہ کا نظام بالکل گرین وچ کے مشہور رصد خانہ کے مطابق تھا، کل انیس ۱۹ لاکھ اس رصد خانہ پر صرف ہوا تھا،

اس رصد خانہ میں کرنل ولکاکس وغیرہ انگریز علماء کے علاوہ مولوی عبد الرب

کمال الدین حیدر، اور مفتی اسمٰعیل مراد آبادی بھی شریک کار تھے، ۱۸۴۹ء میں واجد علی شاہ کے زمانہ میں ولکاکس کا انتقال ہوگیا، رصد خانہ صرف اس کے دم سے زندہ تھا، ایک بہت بڑا نادر کتب خانہ اس رصد خانہ میں موجود تھا، وہ سب اٹھ کر علی نقی خاں کے محل میں جو ان دنوں وزارت کرتے تھے۔ چلا آیا،[۱]

شاہان اودھ کی طرف سے لکھنؤ میں ایک دار الترجمہ بھی قائم تھا، جس میں جدید علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ ہوکر اور مطبع سلطانی میں چھپ کر، شائع ہوتی تھیں، سید کمال الدین حیدر جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، ان کا اصل نام محمد میر حسنی تھا، انھوں نے جدید علوم پر انیس[۱۹] رسالوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا، ان انیس[۱۹] رسالوں میں سے حسب ذیل رسائل کا حال معلوم ہے،

(۱) رسالہ ہیئت، مصنفہ ڈاکٹر ولسن، (۲) رسالہ دیگر ہیئت، مصنفہ ڈاکٹر برنکلی، (۳) رسالہ علوم طبیعیہ (فزیکس) (۴) رسالہ قوت مقناطیسی (الکٹریسٹی) (۵) رسالہ علم الکیمیا (کیمسٹری)، مصنفہ پارکس (۶) رسالہ علم [illegible] (ڈینمکس) (۷) رسالہ علم المائر (ہیڈروسٹکس) (۸) رسالہ علم الہوا (۹) رسالہ علم المناظرۃ (۱۰) رسالہ مقاصد العلوم مصنفہ لارڈ بروگم،

اخیر رسالہ دفتر تاریخ بھوپال کے کتب خانہ میں موجود ہے، یہ رسالہ ۱۸۴۱ء میں مطبع سلطانی میں طبع ہوا تھا، رسالہ کا موضوع مختلف علوم کے فوائد اور ان کے مقاصد اور مواضع بحث کی تشریح ہے، اصل انگریزی رسالہ کا عنوان یہ ہے،

---

[۱] یہ تمام تفصیل قیصر التواریخ میں جو شاہان اودھ کے حال میں ہے مذکور ہے،

A treatise on the objects advantagsand pleasure of zience by Lord Brougham

مترجم نے مقدمہ میں لکھا ہے،

حسب الحکم ابو الفتح معین الدین سلطان الزمان نوشیروان عادل محمد علی شاہ بادشاہ غازی حسب فرمایش محکمۂ اجلاس جنرل کا منٹی کمیٹی، اسکول بک سوسائٹی کے، عاصی سراپا معاصی سید کمال الدین حیدر عرف محمد میر الحسنی الحسینی نے زبان اردو میں ترجمہ کیا، اور صاحب عالی شان ہتمم رصدخانہ سلطانی سے اس کا مقابلہ کیا،

رسالہ ایک مقدمہ اور پانچ فصلوں پر منقسم ہے،

مقدمہ میں مقصد علم اور فوائد علم کا بیان ہے،

پہلی فصل میں علم ریاضی کا بیان ہے،

دوسری فصل میں علم ریاضی اور علم طبیعی کی حقیقتوں کے اختلاف کا بیان ہے

تیسری فصل میں علم طبیعی کا بیان ہے،

چوتھی فصل میں علم طبیعی جو عالم حیوانات اور نباتات سے متعلق ہے اسکا بیان ہے،

پانچویں فصل میں فوائد اور مقاصد علم کا بیان ہے،

رسالہ میں علم کے جو فوائد بیان کیے گیے ہیں، اُن کا مقصد یہ ہے کہ کس علم کے جاننے سے انسان کیا کر سکتا ہے،

سنہ ۱۲۶۵ کا ایک رسالہ مطبع نظامی لکھنؤ کا چھپا ہوا میری نظر سے گذرا ہے، رسالہ کا نام کشاف عالم اور مصنف کا نام حکیم الہند ہے، رسالہ کا موضوع جدید

جغرافیہ ہے، حکیم الہند نے نہایت ناز و غرور کے ساتھ اہل ملک کے سامنے اپنی یہ تالیف پیش کی ہے، رسالہ کے خاتمہ میں حکیم الہند نے اپنے فضل و کمال اور ابنائے عصر کی ناقدردانی پر بہت گریہ و ماتم کیا ہے، اور ارادہ کیا ہے کہ انگلش طرز حکومت پر ایک رسالہ لکھ کر پبلک کے سامنے پیش کرے، آخر میں اپنی تصنیفات و ایجادات کا بھی ذکر کیا ہے، رسالہ کی زبان فارسی ہے، لکھتے ہیں :-

تالیفات حکیم الہند اوّل در نفس انسانی، دوّم در بیان کیفیات شمس و قمر عطارد و مشتری جملہ سیارات ہر طریق حکمائے فرنگ و قدیم یونان، سوم در بیان زمین و آب و ہوا و زلزلہ و ژالہ و مد و جزر و باران و برق، چہارم جر اثقال (میکنکس) پنجم در علم حساب"

صفحات بالا اور آیندہ واقعات سے بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں زیادہ تر فن ہیئت کی طرف لوگوں کو توجہ تھی، لکھنؤ میں قدیم و جدید فنون ہیئت و ریاضی پر سب سے زیادہ ضخیم و محقق کتاب ایک ہندو نا مسلمان کی ہے، اس زمانہ مین شرفائے ہنود عربی و فارسی پر کامل دستگاہ رکھتے تھے، راجہ رتن سنگھ محمدی نے لکھنؤ کے دربار میں حدائق النجوم کے نام سے ایک کتاب لکھی، جو اب بھی علمائے ہند میں فلکیات پر مستند ترین کتاب سمجھی جاتی ہے، اس کتاب میں مصنف نے جدید و قدیم معلومات پہلو بہ پہلو لکھے ہیں، انگریزی جوان ہو کر پڑھی، اور کتاب کے تمام مصارف خود اپنی ذات سے ادا کیے، مولوی کرامت حسین جونپوری ماخذ علوم میں لکھتے ہیں :-

خصوصاً کتاب حدائق النجوم. فارسی مین مولفہ راجہ رتن سنگھ علیہ الرحمہ کی

بہت مفید ہے، اس مرحوم نے انگریزی زبان سیکھ کر علم حاصل کیا، اور عربی میں استعداد کامل رکھتا تھا، اور سب خرچ اپنی ذات سے کیا، بڑا آدمی ہو، تو ایسا ہو،"

دہلی کے شہزادہ سلیمان جاہ لکھنؤ میں آکر رہ گئے تھے، نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں مراد آباد کے مولوی رستم علی سنبھلی نے زیچ سلیمان جاہی لکھ کر پیش کی، ایک انگریز نے فن زراعت پر ایک رسالہ اردو میں لکھا، اس کا مطبوعہ نسخہ میں نے دیکھا ہے،

حیدرآباد۔ لکھنؤ کے بعد اس عہد میں مسلمانوں کا دوسرا مرکز حیدرآباد تھا، جہاں سیاسی فتنوں سے کسی قدر فراغ حال نصیب تھا، سنہ ۱۲۰۴ھ میں نظام الملک میر فرخندہ علی خان فتح جنگ فرمانروائے حیدرآباد تھے۔ اس زمانہ میں حیدرآباد میں نواب محمد فخر الدین خاں المخاطب بہ شمس الامراء ایک نہایت ذی علم امیر تھے۔ ریاضیات اور خصوصاً ہیئت سے ان کو غایت درجہ شغف تھا، ایک بڑے کمرے میں آلات ہیئت اس قدر انھوں نے جمع کئے تھے، کہ پورا رصد خانہ معلوم ہوتا تھا،

شمس الامراء کی علم دوستی نے بہت سے ماہرین فن کو ان کے سایۂ دامن میں جمع کر دیا تھا، سنہ ۱۲۳۱ھ میں شمس الہندسہ کے نام سے انھوں نے علم ہندسہ پر ایک کتاب لکھی، میر شجاعت حیدرآبادی نے شمس الامراء کے حکم سے کیمسٹری کی ایک کتاب انگریزی سے ترجمہ کی۔ ریورنڈ چارلس (۱۸۱۸ء) کا انگریزی میں مختلف علوم پر چھ رسالوں کا ایک سلسلہ تھا، نواب شمس الامراء کے اہتمام سے سنہ ۱۲۵۳ھ میں میر امان دہلوی، مولوی غلام محی الدین دہلوی، مسٹر جونس (انگریز) اور موسیو ٹنڈوسی (فرنچ) نے پورے سلسلہ کا اردو میں ترجمہ کیا، اور ستہ شمسیہ

اس کا نام رکھا، اس سلسلہ کا تاریخی نام "تالیف نواب شمس الامراء" قرار پایا، یہ سلسلہ چھوٹی تقطیع کی چھ جلدوں میں حسب ذیل علوم پر منقسم ہے،

جلد اوّل، جر ثقیل، ہیولی، اس کے انقسامات، کشش، انجماد، کشش ثقل، مرکز ثقل، کلیات حرکت جلد دوم، علم ہیئت جلد سوم، علم آب، جلد چہارم، علم ہوا، جلد پنجم علم الانظار، جلد ششم علم دور نما،

مقدمہ میں تصریح کی ہے، کہ قدیم اصطلاحات جہاں نہیں مل سکے ہیں، اپنی طرف سے فارسی و عربی اصطلاحات وضع کیے گیے ہیں، اور بدرجۂ مجبوری انگریزی اصطلاحات باقی رکھے گیے ہیں،

کلکتہ کلکتہ برطانوی قوت کے نشو ونما کا پرورش گاہ تھا، عموماً جو انگریز یہاں آتے تھے، وہ اردو و فارسی اکثر بازمی طور سے سیکھتے تھے، جس ملک پر ان کو حکومت کرنی تھی، وہ جدید علم و آداب سے بے خبر تھا، اس بنا پر ان کو ضرورت پیش آئی کہ کلکتہ میں اس قسم کے علماء مجتمع کیے جائیں، جو اس ضرورت کو پورا کر سکیں، دلی کے بعض شعراء اور نثر نویسوں سے جس طرح اردو کے مختلف قصے لکھوائے گئے، عربی و فارسی زبانوں کے ماہرین سے بھی اسی قسم کے کام لیے گئے،

سب سے پہلے تو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کا ذکر کرنا ہے جس کے ذریعہ سے ملک میں قدیم عربی و فارسی تصنیفات کا ذوق پیدا ہو، ایک چیز جس کی تاسیس کے ہم مدت سے مشتاق ہیں، لیکن ہمیں میسر نہیں آتی، وہ بآسانی قائم ہو سکی، یعنی ایک مجلس اشاعۃ العلوم مولانا محمد وجیہ، مولوی سید کرامت حسین جونپوری، مولوی کبیر الدین احمد وغیرہ اس کے منتظم و ممبر تھے، ان کے علاوہ تقریباً ۸۰ آدمی گورنمنٹ عہدہ دار، زمیندار، تجار

اور علماء اس کے ارکان اور اربابِ اعانت تھے، مطبع مظہر العجائب سے مختلف کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں،

مولوی سید کرامت حسین، جونپور کے باشندہ اور امام باڑہ ہگلی کے متولی تھے مولوی صاحب ممدوح نے جدید علوم کی کامل واقفیت حاصل کی، اور یہ کہنا بلا مبالغہ صحیح ہے کہ اردو زبان میں جدید علم کلام کے بانی اور واضع اول ہونے کا فخر ان ہی کو حاصل ہے ان کی ایک نہایت قابلِ قدر تصنیف ماخذ علوم ہے، دوسری تصنیف اسی کا ضمیمہ ہے، ضمیمہ خاتمہ میں مولوی صاحب لکھتے ہیں،

"بہت برس ہوئے کہ حکمائے فرنگ نے واقعی وحقیقی طبیعی وریاضی کے علوں کو تجربیات ومشاہدات پہ رکھا ہے، نظریات کو تابع مشاہدات وتجربیات کیا، حقیقت کی دریافت کے لیے یہ بہت اچھا طریقہ ہے، اور پڑھنے والے آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں، مگر اس کے سیکھنے کو زمانے اور قیمتی قیمتی بہت سامان چاہیئے اور طلاب علم استطاعت وبضاعت نہیں رکھتے اگر امراء ان کی تائید فرمائیں، جیسے امرائے فرنگ ہر طرح سے مدد فرماتے ہیں، تو وے سب علموں میں پورے نکلیں گے،

آگے چل کر وہ ایک دارالاشاعہ قائم کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، لکھتے ہیں،

تو طالب العلم فی الجملہ استطاعت رکھتا ہو، اس زبان (انگریزی) کو سیکھ کے علم حاصل کر کے اپنی زبانوں میں ترجمہ کر کے چھپوا کے مشتہر کرے، اور سردست جو لوگ اشاعت علوم کا دم بھرتے ہیں، ان کو چاہیئے کہ طبعی وریاضی کی کتابوں کو جو عربی وفارسی وہندی (اردو) میں ترجمہ ہو کر چھپی ہیں، ان کے مالکوں سے

اذن دے کہ اگر ضروری ہو تو سرے سے چھپوا کے مشتہر کریں، مثلاً ہیئت میں رسالہ مفتاح الافلاک مع نقشہ اردو میں اگرچہ بہ ایں سوال و جواب کی صورت کو بدل دیں، تو بہت ہی مختصر ہوگا، خصوصاً کتاب حدائق النجوم فارسی میں مؤلفہ راجہ رتن سنگھ علیہ الرحمہ کی بہت ہی مفید ہے۔ اس مرحوم نے انگریزی زبان سیکھ کے علم حاصل کیا، اور عربی میں استعداد کامل رکھتا تھا۔"

ان فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید علوم پر کچھ اور کتابیں بھی ترتیب پائی تھیں۔

آخر میں ہم ایک اور کتاب کا ذکر کرتے ہیں، جس کا نام جامع بہادر خانی ہے، یہ فارسی زبان میں فل اسکیپ سائز پر ۱۴۰ صفحہ کی ایک ضخیم کتاب ہے، اور ریاضیات کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، یہ ۱۸۳۳ء میں یہ کتاب اختتام کو پہنچی ہے، اور کلکتہ کے مطابع میں خود مصنف کے اہتمام سے چھپ کر شائع ہوئی ہے، مصنف کا نام غلام حسین جونپوری ہے، مصنف نے احتشام الدولہ مبارز الملک رحبہ خان بہادر خان نصرت جنگ خلف مہاراجہ مزجیت سنگھ بہادر کے دربار میں یہ کتاب لکھ کر پیش کی تھی، بہادر خان غالباً ٹکاری کا راجہ تھا، جو صوبہ بہار میں ایک ہندو ریاست ہے۔

کتاب پانچ خزینوں پر منقسم ہے۔ خزینۂ اوّل در علم ہندسہ، خزینۂ دوم در علم البصار، خزینۂ سوم در علم حساب، خزینۂ چہارم در منتخبات فنون ثلثہ، مقدمہ خزینۂ پنجم در علم ہیئت، اجرام علویہ و بسائط سفلیہ خزینۂ ششم در تبیین مو امرات زیچ و تقویم

یہ کتاب درحقیقت جدید و قدیم فنون ریاضی پر ایک بسیط محاکمہ ہے، اور اس قدر محقق ہے کہ اس کا ایک صفحہ بھی استناد سے گرنے

نہیں پایا، حکمائے فرنگ کی تحقیقات سے اس قدر واقف ہے کہ شاید آج بھی کوئی مسلمان اس سے بہتر جاننے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، یہ گوشہ نشین گو اس راہ میں نہایت خفیف نہیں، لیکن انگریزی تعلیم کی پنجاہ سالہ اشاعت کے بعد بھی اس سے بہتر ہم کچھ نہ کر سکے،

(معارف فروری ۱۹۱۷ء)

رومن کیتھولک تاریخ کی چند من گھڑت کہانیاں

بنگال سنتے ہیں کہ مسلمانوں کا صوبہ ہے، مگر وہاں کی تعلیم گاہوں سے وقتاً فوقتاً مسلمان اور تاریخ اسلام کے متعلق ایسی ہنگامہ خیز اطلاعیں آتی ہیں کہ ہم کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ واقعی بنگال میں مسلمانوں کی کوئی قوت ہے بھی یا نہیں،

ابھی اکبر کی دین الٰہی والی کتاب کا ہنگامہ فرو نہیں ہوا تھا کہ معلوم ہوا کہ کلکتہ کے ایک مشنری کالج اسینٹ زویر کالج، کے ہائی اسکول سکشن میں ایک کتاب "کیتھولک چرچ ہسٹری" طالب علموں کو پڑھائی جاتی ہے، جس میں ایک باب اسلام کے سخت خلاف ہے، کتاب مذکور کے اس باب کا خلاصہ میں نے پڑھا، تعجب ہوا، کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو مذہبی رواداری ہی کے خلاف نہیں، بلکہ علم اور واقفیت کے بھی خلاف ہے۔ عیسائیوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیا ہے کہ انھوں نے تلوار کے زور سے اپنے مذہب کو پھیلایا ہے، یہ واقعہ صحیح ہو، یا غلط، مگر بہر حال انھوں نے جھوٹ اور فریب سے اپنے مذہب کو کبھی نہ پھیلایا، جیسا کہ اس زمانہ کی مشنریوں کی تبلیغی کوششوں میں نظر آتا ہے، اس کتاب کے اس باب کا حاصل بھی یہی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو بزور شمشیر پھیلایا ہے، ممکن ہے بعض صورتوں میں یہ واقعہ صحیح ہو، جس طرح جرمنی کے باب میں یہ واقعہ صحیح ہے کہ وہاں عیسائیت تلوار کی نوک سے

پھیلائی گئی ہے،

اس باب میں پیغمبر اسلام علیہ السلام اور خلفا کے بھی مختصر واقعات ہیں،

دنیا اس کتاب کے مصنف کی اس تحقیق کو سن کر حیران رہ جائے گی، کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدۂ ماجدہ یہودیہ تھیں، حضرت آمنہ بنت وہب کو جو قریش کی سیدہ تھیں، یہودی نسل یا مذہب بتانا ایک ایسا جھوٹ ہے، جس کی مثال مشکل سے مل سکے گی

۲۔ اس کتاب کا یہ بیان کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے تیسویں سال میں نبوت کا دعویٰ کیا، مشنری جہالت کا آئینہ ہے، دنیا جانتی ہے، کہ حضور کی نبوت اس کے دس برس بعد کا واقعہ ہے، جب عمر شریف چالیس سال کی تھی، اور شباب کا عہد اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا،

ف: ولادت کی صحیح تاریخ اپریل ۵۷۱ء ہجرت کی ستمبر ۶۲۲ء ہے "ص"

۳۔ آپ کی ولادت کا سال ۵۸۰ء[ف] بتا کر ہجرت کا سال ۶۲۲ء بتانا بھی تاریخ کا خون کرنا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہجرت کا واقعہ آپ کی عمر کے بیالیسویں سال میں آیا، حالانکہ آپ کی عمر اس واقعہ کے وقت باتفاق عام ۵۳ سال کی تھی، کیونکہ چالیسویں سال آپ کو نبوت ملی، اور اس کے بعد تیرہ سال مکہ میں رہ کر، قریش کے ہر قسم کے ظلم و ستم سے، تب مدینہ کو ہجرت فرمائی، اور اس کتاب کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبوت ملنے کے بعد جب بت پرستی کے خلاف آپ نے وعظ شروع کیا، تو بت پرست قریش کے غیظ و غضب کو دیکھ کر آپ فوراً اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ چل دیئے، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے،

۴۔ مصنف کا یہ بیان بھی تحقیق سے خالی ہے کہ قرآن پاک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی وفات کے بعد جمع کیا گیا، کوئی کتاب جس کی سطریں یکجا اور آیات مرتب نہ ہوں، نہ پڑھنے میں آسکتی ہے، اور نہ اُس کی تلاوت کیجا سکتی ہے، حالانکہ ہرایک کو معلوم ہے، کہ قرآن پاک کا ہر حصّہ اس وقت بھی ہر مسلمان نماز میں پڑھتا تھا، اور ہر روز اس کی تلاوت کرتا تھا، ہاں یہ صحیح ہے کہ کاغذ پر اس کی تمام آیتیں اور سورتیں یکجا ترتیب کے ساتھ بشکل کتاب حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں لکھی گئیں،

۵۔ اس کتاب کا بیان ہے کہ جب آپ سے درخواست کی جاتی تھی کہ آپ کوئی مافوق الفطرۃ نشانات اپنے دعوی کی تائید میں پیش کریں، تو آپ جواب دیتے کہ "مجھے اللہ تعالےٰ نے معجزات دکھانے کے لیے نہیں بھیجا ہے بلکہ دعوت دینے اور لڑنے کے لیے بھیجا ہے" اس بیان کی صداقت کے لیے مصنف نے قرآن کی سورہ ۱۳ آیہ ۷، کا حوالہ دیا ہے، میرا چیلنج ہے، کہ اس معنی کی کوئی آیت قرآن پاک میں نہیں ہے، قرآن کی تیرہویں سورہ رعد ہے، اور اس کی جس تیرہویں آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ شاید حسب ذیل ہے،

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ	اور کافر کہتے ہیں، کہ اس پر اسکے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتری (اے محمد) آپ تو خبردار کرنے والے ہیں، اور ہر قوم کیلئے ایک رہنما ہے،

اس آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں، جو معجزہ نہ دکھانے کے واقعہ کو ظاہر کرے اور یہ کہے کہ آپ "لڑنے" کو بھیجے گئے ہیں، خیال ہوتا ہے کہ شاید قرآن پاک کے

کسی ترجمہ میں منذر کا ترجمہ خبردار اور ہشیار کرنے والے کے بجائے ڈرانے والا یا ڈر سنانے والا کیا گیا ہے، اور اس سے لڑنے کا مفہوم حاصل کیا گیا ہے، ایسے لوگوں کی اطلاع کے لیے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ منذر عربی زبان مین وقت سے پہلے آنے والی مصیبت کو بیان کرکے اوس سے بچنے کی تدبیر کے لیے تیار کرنے والے کو کہتے ہیں، جیسے ڈاکٹر کسی مریض کو دیکھ کر آئندہ خطرات سے اس کو ہشیار اور متنبہ کرے، کہ اگر اپنی حالت کی درستی کے لیے کوشش نہ کروگے، تو تم کو فلان فلاں بیماریاں لاحق ہو جائیں گی، اس انذار کو جنگ اور لڑائی سے کوئی تعلق نہین، یہ تنبیہ اس عذاب الٰہی کے مقابلہ میں ہے، جو دوسری دنیا میں اسلام کے پیغام کے نہ ماننے اور اس پر عمل نہ کرنے سے پیش آنے والا ہے، قرآن کی بہت سی آیتوں میں یہ لفظ آیا ہے، اور ان ہی معنوں میں آیا ہے، جیسے سورۂ زمر میں ہے، فرشتے قیامت میں کہیں گے،

اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْکُمْ آیَاتِ رَبِّکُمْ وَ یُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا (زمر - ۸)	کیا تمھارے پاس تمھارے میں سے رسول تم کو تمھارے پروردگار کے حکم کو پڑھ کر سنانے اور اس تمھارے دن کی ملاقات سے ڈرانے والے اور ہشیار کرنے نہین آئے

کیا قیامت کا میدان لڑائی کا میدان ہے، دوسری جگہ ہے،

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰھَا (نازعات۔۲)	آپ اسکو ڈرا سنانے والے ہیں جو قیامت سے ڈرتا ہے،

دیکھیے اس میں ٹھیک وہی لفظ منذر ہے جو پہلی آیت میں ہے،

سورۂ یٰسین میں ہے،

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ	اور برابر ہے ان کے لیے ان کو
أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا	ہشیار کریا نہ کرو ایمان نہیں لائیں گے
يُؤْمِنُونَ إِنَّمَا تُنذِرُ مَنِ	تم اسی کو ہشیار کر سکتے ہو،
اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ	جو نصیحت کی پیروی کرتا، اور بن
بِالْغَيْبِ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ	دیکھے رحمت والے خدا سے ڈرتا
وَأَجْرٍ كَرِيمٍ	ہے، تو اس کو گناہوں کی معافی
(یٰسین - ۱)	اور نیک مزدوری کی خوشخبری سنادے

کیا یہ "انذار" اعلانِ جنگ ہے، اور کیا اسی کو اعلانِ جنگ ہے، جو نصیحت کو مانتا اور اللہ تعالے سے ڈرتا ہے، یہ کیسا حماقت کا خیال ہے،

قرآن کہتا ہے،

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا	اور (دنیا کی) کوئی قوم ایسی نہیں
فِيهَا نَذِيرٌ	جس میں ایک ڈر سنانے والا
(فاطر - ۱۰)	نہیں آیا،

کیا ہر قوم میں آنے والا اور ہشیار کرنے والا پیغمبر ہے، جو قوموں کو ان کے اعمالِ بد کی پاداش سے ہشیار اور باخبر کرکے ان کے دل میں اللہ تعالی کا خوف پیدا کرتا ہے، یا وہ جنگ کا الٹی میٹم دینے والا ہوتا ہے، ایک اور آیت ہے،

انما انت منذر من یخشاها	اے پیغمبر! تم کو اس کو جو قیامت سے

(نازعات - ۲) ڈرتا ہو، ہشیار کرنے والے ہو،

یہاں صاف تصریح ہے، کہ عربی میں لفظ انذار کا مفہوم ہشیار و باخبر کرنا اور عمل بد کی پاداش سے متنبہ کرنا ہے، نہ کہ لڑائی اور جنگ جوئی،

اب یہ کہنا ہے کہ اس آیت میں بے شبہہ عجائب و غرائب اور خوارق عادات کے مانگنے والے کو خوارق اور معجزات کے بجائے اسلام کی تعلیم و ہدایت کی صداقت میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور عجائب پرستی کے عامیانہ جذبہ کے بجائے عقل و خرد کو کام میں لانے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، مگر اس سے اس کا انکار نہیں نکلتا، کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ معجزات دکھانے سے انکار کیا ہے۔ قرآن خود معجزہ ہے اور اس میں متعدد معجزوں کا بیان مذکور ہے، جن میں ایک شق القمر کا معجزہ بھی ہے، جو سورۂ قمر میں ہے، اسی طرح بدر اور خندق کے معجزوں اور روم کی فتح کی پیشین گوئی کا ذکر بھی ہے،

اس آیت میں معجزوں کے دکھانے سے جو پہلو تہی ظاہر کی گئی ہے، اس کے وہی معنی ہیں جو حضرت مسیح علیہ السلام کے ان فقروں کے ہیں، جن میں معجزوں کے دکھانے سے انھوں نے انکار کیا ہے، اور کہا ہے کہ "اس قوم کو یونس کے معجزہ کے سوا اب کوئی اور معجزہ نہیں دکھایا جائے گا" تفصیل منظور ہو تو میری کتاب سیرۃ النبی کی تیسری جلد میں اس کو پڑھیں،

اتفاق[1] سے انجیل کا ایک نسخہ اس وقت مل گیا ہے، اس سے یہ دو درس بالفعل نقل کر دیئے جاتے ہیں،

---

[1] یہ مضمون بحالت سفر لکھا گیا ہے،

اے استاد ہم تجھ سے ایک نشان دیکھنا چاہتے ہیں، اس نے جواب دے کر اُن سے کہا اس زمانہ کے برے اور زناکار لوگ نشان چاہتے ہیں مگر یوناہ نبی کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائے گا، (متی ۱۲-۱۹)

مرقس میں ہے،

پھر فریسی نکل کر اوس سے بحث کرنے لگے، اور آزمانے کے لیے اوس سے کوئی آسمانی نشان طلب کیا، اوس نے اپنی روح میں آہ کھینچ کر کہا، اوس زمانہ کے لوگ کیوں نشانی طلب کرتے ہیں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائے گا، اور وہ ان کو چھوڑ کر پھر کشتی میں بیٹھ گیا، (۸-۱۱)

اس انجیل میں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں سے بھری ہوئی ہے، آزمائشی اور فرمائشی معجزوں کے جواب میں انکار کا ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے تائیدی معجزے گو بکثرت ہوتے ہیں، مگر متحدی بہ معجزہ کے دکھانے سے وہ انکار کرتے ہیں، کہ قانونِ الٰہی کے مطابق ایسے معجزوں کے ظہور کے بعد نافرمان امت کی ہلاکت یقینی ہے، اس لیے وقت مقرر سے پہلے یہ فرمائش پوری نہیں کیجا سکتی" ٹال دی جاتی ہے، کیا عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس انکار کی توجیہ اس سے بہتر کر سکتے ہیں،

کہا گیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مذہب میں آخرت کو صرف مادی شکل میں پیش کیا گیا ہے، اور اس کے روحانی تخیل سے خالی ہے، یہ بھی معترض کی بے خبری ہے، اول تو یہ عرض ہے کہ کیا انجیل میں قیامت کے بعد جنت میں اپنے ساتھیوں کے پہلو میں افشردۂ انگور خواہ وہ شربت ہو، یا شراب، پینے کا ذکر نہیں، (متی ۲۶-۲۹)

اور کیا دوزخ کی "آگ" کا منظر انجیل میں جابجا نہیں دکھایا گیا ہے (لوقا ۱۲-۵ و ۱۶-۲۴ متی ۲۳-۳۳)

تفصیل منظور ہو تو میری کتاب سیرۃ النبوی کی چوتھی جلد میں دوزخ اور جنت کا بیان پڑھیں، اس میں بائبل کے اکثر حوالے لکھے ہیں، جن کو روشن خیال عیسائی چھپاتے ہیں جہنم کے عذاب کا ذکر (متی ۲۳-۳۳) میں ہے،

فریسی یہودی جو قیامت کو مانتے تھے، وہ جنت و دوزخ کو سراسر مادی اور عیسائی اس کو سراسر روحانی فرشتوں کی سی زندگی بتاتے ہیں، اسلام میں جنت و دوزخ کے تصور میں مادی و روحانی دونوں منظروں کی جامعیت ہے بہشت باغ و بہار بھی ہوگی، اور اللہ تعالےٰ کی رضا اور خوشنودی اور دیدار کے روح پرور جمال کا نظارہ گاہ بھی، جیسا کہ قرآن کہتا ہے،

ورضوان من اللہ اکبر — اور اللہ کی خوشنودی آخرت کی سب نعمتوں سے بڑھ کر ہے،

(توبہ - ۹)

(تفصیل میری مذکورۂ بالا کتاب کی چوتھی جلد میں ہے)

زیر اعتراض باب کا آخری حصہ اس بیان میں ہے کہ اسلام کی اشاعت صرف تلوار کے زور سے ہوئی ہے، یہ بالکل ٹھیک ہے، انہی معنوں میں جن معنوں میں آج بھی عیسائی یورپ، اپنی عیسائی تہذیب کی اشاعت توپ و تفنگ اور ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کے ذریعہ سے کر رہا ہے، جس کے زیر سایہ عیسائی سامان عیش و مسرت اور مشنری صلح پسندوں کا غول ملکوں میں داخل ہوتا ہے، اور ان پڑھ جنگلیوں کو بے خبری کی حالت میں عیسائی بناتا ہے، افریقہ کے گروہ گروہ عیسائیت کے بجائے اسلام کو قبول کرتے ہیں، تو اس سے ہمارے عیسائی دوستوں کو فکر مند ہونے کی کیا بات ہے،

اسلام کی تلوار ابی سینیا میں کبھی نہیں چمکی، پھر وہاں مسلمانوں کی تعداد کہاں سے آئی، جزائر ملایا وسیام میں کبھی اسلام نے کوئی لشکر نہیں بھیجا، پھر یہ کروروں مسلمان ان جزیروں میں کہاں سے آباد ہو گئے، فلپائن اور مدگاسکر وغیرہ جزیروں میں اسلام کس کشورکشا جلاد کے خوف کا نتیجہ ہے، چین میں مسلمانوں کی حکومت کبھی نہیں ہوئی، پھر وہاں کروروں مسلمان کس تلوار کے زور سے مسلمان بنائے گئے، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد ان کی حکومت کے ختم ہونے کے بعد بھی تین چار کرور سے زیادہ نہ تھی، جیسا کہ پہلی مردم شماری میں درج ہے، مگر سو برس کے عرصہ میں ان کا بے تلوار کے دس کرور کے قریب ہو جانا کس ماد ی ہیبت کا نتیجہ ہے، پھر آج یورپ کے مختلف ملکوں اور گوشوں میں اسلام کی نموداری جب کہ اس کی ہر تلوار زنگ آلود ہو چکی ہے، کس اعجاز کا کرشمہ ہے، افریقہ کے ریگستان کے ہر گڑھے میں آج عیسائیت تلوار کے زور سے قائم ہے، تاہم روحانی منقولوں کی بڑی تعداد عیسائیت کے بجائے اسلام کے آغوش میں آتی ہے، کیونکہ اسلام افریقہ کو ایمان کی تازگی کے ساتھ حکومت کی آزادی بھی بخشتا ہے، لیکن عیسائیت تثلیث کی بت پرستی کے ساتھ یورپ کا غلام بناتی ہے، رومن کیتھولک چرچ کی تاریخ میں یہ بھی لکھا تھا کہ رومن کیتھولک چرچ انسانوں کو پوپوں کا معتقد بنایا کرتا تھا، اسلام نے آکر انسانوں کو صرف ایک خدا کا معتقد بنایا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے یہودیوں نے حضرت مریم صدیقہؑ پر جو اخلاقی تہمت اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جو الزامات رگا ئے تھے، اسلام ہی ہے، جس نے ان معصوموں کی عصمت کی گواہی دیکر، کروروں بندگان خدا کے

دلوں میں ان کی سچائی اور صداقت کا سکہ بٹھایا، اور عیسائیوں نے ان کو انسانوں کے بجائے جو دیوتا کی شکل عطا کی تھی، اس کو مٹا کر مقدس انسانوں اور محبوب بندگان الٰہی کی صورت میں جلوہ گر کیا،

مصنف کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تیغ زن سپاہیوں سے بڑی شکایت ہے لیکن رائل کی زبان میں پوچھا جا سکتا ہے کہ ان تیغ زن سپاہیوں کو تو تنہا کس تلوار کے زور سے مسلمان بنایا، ایسے تیغ زن سپاہیوں اور بہادروں کو جن میں سے کسی نے ایران کا تخت الٹ دیا، کسی نے قیصر سے مصر و شام اور شمالی افریقہ کا علاقہ چھین لیا۔ اور کسی نے خراسان و ترکستان کی سرزمینوں کو روند ڈالا،

مشنریوں نے اسلام کے خلاف جو یہ خیال پھیلا رکھا ہے، کہ وہ کوئی نیا مذہب نہیں بلکہ وہ حضرت عیسوی اور یہودی مذہب کا مجموعہ ہے، کوئی نیا اعتراض نہیں یہ تو پیغمبر اسلام کے عہد میں بھی کفار نے کہا تھا،

لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے، کہ بجائے خود اسلام کا دعویٰ بھی یہی ہے، کہ یہ کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جو کچھ انبیا علیہم السلام سے کہا گیا تھا، اور جس کو ان کے پیرووں نے بھلا دیا تھا، اسلام کے ذریعہ سے وہی پیغام پھر دنیا میں بھیجا گیا، جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے معترضوں سے یہ کہا تھا، کہ میں تورات کے قانون کو مٹانے کے لیے نہیں، بلکہ اس کو پورا کرنے کے لیے آیا ہوں، اور جب تک دنیا قائم ہے، تورات کا ایک نقطہ نہیں بدل سکتا، اسی طرح قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ تورات اور انجیل کا مصدق

مصدقا لما بین یدیہ (بقرہ ۱۰) اگلی کتابوں کو سچا بتانے والا،

اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ دینِ الٰہی ایک ہی ہے، جو آدم علیہ السلام سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک یکساں پیغمبروں کے ذریعہ بھیجا جاتا رہا، اور قرآنِ پاک میں جو کچھ ہے، وہی اگلی کتابوں میں بھی تھا، چنانچہ وہ اپنی نسبت آپ گواہی دیتا ہے،

توراۃ اور انجیل کے ذکر کے بعد ہے،

وانزلنا الیک الکتاب	اور ہم نے تیری طرف قرآن اتارا،
بالحق مصدقا لما بین یدیہ	حق کے ساتھ جو اپنے سے پہلے کی کتابوں
من الکتاب ومھیمنا علیہ	کی تصدیق کرتا ہے اور ان کتابوں
(مائدہ ۸-۷)	پر مہیمن ہے،

لفظ مہیمن کا ترجمہ محافظ، مشتمل، اور جامع بھی کیا گیا ہے،

سورۂ شعراء میں ہے۔

وانہ لفی زبر الاولین	اور یہ مضمون (جو قرآن میں ہے)
	اگلوں کی کتابوں میں (بھی) ہے،

ایک اور سورہ میں ہے۔

ان ھذا لفی الصحف	یہ مضمون اگلے صحیفوں میں ہے اور
الاولی صحف ابراھیم و	ابراہیم اور موسیٰ کی کتابوں میں
موسیٰ (اعلیٰ-۲)	

سورۂ شوریٰ میں ہے،

شرع لکم من الدین	اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر
ما وصیٰ بہ نوحا والذی	کیا، جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا،

اوحینا الیک وما وصّینا بہ	اور جس کو ہم نے تمہارے پاس
ابراہیم وموسیٰ وعیسیٰ	وحی کیا، اور جس کا ہم نے ابراہیم اور
(شوریٰ - ۲)	عیسیٰ کو حکم دیا تھا،

اب جس بات کا قرآن خود دعویٰ کر رہا ہو، اور جو اوس کے متفقہ اور متحدہ صداقت کی دلیل ہے، اوس کو اعتراض کے موقع پر پیش کرنا کہاں تک صحیح ہے، اسلام کا عقیدہ یہی ہے، کہ تمام انبیاءؑ ایک ہی دعوت، ایک ہی تعلیم، اور ایک ہی شریعت لیکر آئے۔ مگر ان کے متبعوں نے اس کو کھو دیا، اور بگاڑ دیا، اب وہی چیز قرآن کے قالب میں آخری بار آئی ہے، اب اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے "وانا لہ لحافظون"

اب جہانتک عقائد حقہ، تعلیمات صحیحہ اور انبیاء کے صحیح واقعات وقصص کا تعلق ہے، قرآن پاک اور توراۃ اور انجیل کی یکسانی بالکل کھلی بات ہے، لیکن جہان ان کتابون کی تحریفات اور انسانی آمیزشوں کا تعلق ہے، قرآن سب سے الگ اور ان سب سے ممتاز ہے، تثلیث کا عقیدہ اور ان عقائد کے ذکر سے جن کو پالوس نے دین عیسوی میں شامل کیا ہے، قرآن پاک بری ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے قصوں کے ان عناصر کی جو توراۃ میں بری طرح آج مذکور ہیں قرآن نے علانیہ تردید کی ہے، اور انبیاء علیہم السلام کی عصمت کو دنیا میں دوبارہ ظاہر کیا ہے، اگر قرآن موجودہ انجیل اور موجودہ توراۃ کا مجموعہ ہوتا، تو یہ امتیاز کیون نظر آتا۔

مقصود یہ ہے کہ خدا، انبیاء، قیامت، جزا وسزا اور قصص انبیاء کی حد تک قرآن اور دیگر آسمانی کتابون کا اتحاد، قرآن پاک کی صداقت کی دلیل ہے،

نہ کہ بطلان کی، کہ یہ سب چشمے ایک ہی ربانی سرچشمہ سے نکلے ہیں،
اور اگر مقصود یہ ہے کہ اگلی کتابوں کی کوئی بات پچھلی کتاب میں دہرائی نہ جائے
تو اس نقص سے عیسائیوں کی موجودہ انجیل بھی خالی نہیں، وہ بھی یہودی کتب واسفار
کے اقوال کی تکرار سے معمور ہے، حضرت عیسیٰ کا آخری فقرہ ایلی ایلی لما سبقتنی،
(مرقس ۱۵-۳۴، متی ۲۷-۴۶) زبور ۲۲ میں مذکور ہے، اور حضرت داؤدؑ کی
دعا کا ٹکڑا ہے، خدا کے باپ اور حضرت عیسیٰؑ کے بیٹے ہونے کا دعویٰ بھی زبور
۲-۷ کی نقل ہے، جس میں حضرت داؤد نے خدا کو مجازاً باپ اور اپنے کو بیٹا کہا ہے،
انجیل کی بہت سی جو بصورت تمثیلین بھی عہد قدیم کے صحیفوں میں ملتی ہیں، اور ان کے
علاوہ مصری اور یونانی میتھالوجی بلکہ بودھ تک کے فقرے بھی موجودہ انجیل کے نسخوں
میں مذکور ہیں، مصر کے ایک فاضل نے التطبیق بین الدیانۃ الوثنیہ والدیانۃ المسیحیہ
میں ان سب کو پوری تفصیل سے جمع کر دیا ہے،

(معارف ماہ اگست ۱۹۲۵ء)

مرزا بیدل کیا عظیم آبادی نہ تھے؟

مرزا عبدالقادر بیدل ۱۰۵۴ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۱۳۳ھ میں دلی میں وفات پائی، ان کو طاہر نصرآبادی نے اپنے تذکرہ میں جس کو اس نے ۱۰۸۳ھ میں بیدل کی زندگی میں ایران میں بیٹھ کر ترتیب دیا، لاہوری لکھا ہے،

بندرا بن خوشگو جس نے بیدل سے اون کی آخر زندگی میں دلی میں بارہا ملاقاتیں کی ہیں، ان کو "اکبرآبادی الوطن" لکھا ہے، میر غلام علی آزاد نے جو بیدل کی وفات کے وقت ۱۷ برس کے تھے، اور جن کے سامنے خوشگو کا بیان موجود تھا،[1] اپنے تینوں تذکروں ید بیضا، سرو آزاد، اور خزانہ عامرہ، میں ان کی جائے پیدائش تصریح کے ساتھ پٹنہ عظیم آباد لکھی ہے، سب سے عجیب بیان مجموعۂ نغز کے مصنف پر قدرت اللہ قاسم کا ہے، جس نے اپنا تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں ختم کیا ہے، اس نے بیدل کو بخاری المولد بتایا ہے، علی قلی ہدایت نے جس کا تذکرہ ریاض العارفین ۱۲۶۰ھ میں ترتیب پایا ہے، ان کو دہلوی لکھا ہے،

ان بیانات پر نظر ڈالنے سے بیدل کے مولد و منشا کی تعیین میں بڑا اختلاف

لہ اورینٹل لائبریری پٹنہ میں سفینۂ خوشگو کا جو نسخہ ہے، وہ آزاد بلگرامی کی ملک میں رہ چکا ہے، اس پر ان کے دستخط ثبت ہیں،

نظر آتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیدل اپنی زندگی کے مختلف حصوں میں مختلف شہروں میں اقامت پذیر رہے، اس لیے ہر ایک نے ایک مقام کی طرف انھیں منسوب کر دیا، بخاری المولد کا کہنا البتہ صحیح نہیں ہے کہ وہ ان کے آباء و اجداد کا مولد ہو تو، مگر ان کا تو قطعاً نہیں نصر آبادی کے اس بیان کی کہ بیدل لاہوری تھے، خوشگو نے اپنے سفینہ میں اسی زمانہ میں تردید کر دی تھی، لیکن خود خوشگو کا یہ بیان کہ بیدل اکبر آبادی الوطن تھے' اس تصریح سے خالی ہے، کہ اکبر آباد ان کی جائے پیدائش بھی تھی، ہو سکتا ہے کہ ان بزرگوں نے ترکستان چھوڑنیکے بعد اکبر آباد کو وطن بنایا ہو، لیکن پیدائش وہاں نہیں ہوئی ہے، کیونکہ ہر موطن کا مولد ہونا ضروری نہیں ہے، ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے' کہ بیدل کا مولد و منشا صوبہ بہار تھا، جس کا دار الحکومت عظیم آباد پٹنہ تھا، اور یہ' اس دعوی کی شہادت میں اولاً میر غلام علی آزاد جیسے محقق کا بیان ہے، جس نے تین تین جگہ اس کی تصریح کی ہے، ثانیاً خود بیدل کے اشارات ہیں جن سے قیاس میں یہی آتا ہے کہ اون کا مولد و منشا یا کم از کم ان کی طفولیت اور آغاز شباب کا زمانہ بہار ہی میں گذرا ہے، چنانچہ میر غلام علی آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں:-

اصلش از قوم ارلاس[1] در بلدۂ پٹنہ متولد شد بہ ہندوستان نشو و نما یافت"

سرو آزاد میں ہے،

"از نژاد او قوم ارلاس است، در بلدۂ عظیم آباد پٹنہ از نہاں خانۂ عدم بشہرستان وجود خرامید و در ہندوستان نشو و نما یافت"

خزانۂ عامرہ کی عبارت یہ ہے،

---

[1] ایک ترک قبیلہ،

اصلش از گروہ لاش در بلدۂ عظیم آباد پٹنہ از شبستان عدم بہ صبح کدۂ ہستی

در رسیدہ و در بلاد ہندوستان نشو و نما یافت و در بنگالہ بیشتر بسر می کرد"

عبد الوہاب افتخار نے بھی اپنے تذکرۂ بے نظیر میں اپنے استاد آزاد کی تقلید میں ان کو عظیم آبادی کہا ہے،

. . . . . . بیدل کی کچھ جوانی کا اور بڑھاپے کا بڑا حصہ دہلی میں گذرا

اور وہیں وفات بھی پائی، اس لیے اگر کسی نے انھیں دہلوی کہا تو اعتراض کا موقع

نہیں ہے، بیدل بطریق سیاحت لاہور بھی جاتے رہے ہوں، جیسا کہ بابا حسن ابدال

ان کا جانا خود چہار عنصر میں ہے، جس کے راستہ میں لاہور پڑتا ہے، لاہور کا آخری سفر

اپنی وفات سے دو سال پہلے کیا تھا، ۱۱۳۱ھ میں جب سادات بارہہ نے فرخ

سیر کے ساتھ زیادتی کی، تو بیدل نے اس کی تاریخ "سادات بوے نمک حرامی کردند"

کہی، اور اس کی شہرت ہوئی، تو بیدل نے دہلی سے بھاگ کر لاہور عبد الصمد خان

ناظم لاہور کے یہاں پناہ لی، اور سال دو سال کے فتنہ کے فرد ہونے کے بعد پھر دہلی

لوٹ آئے، اور وہیں ۱۱۳۳ھ میں وفات پاکر، اپنے گھر کے صحن میں مدفون ہوئے،

اس بنا پر اگر ایران میں ان کے قیام لاہور کی خبر پہنچی، اور وہاں کسی نے ان کو لاہوری

لکھدیا، تو مغالطہ ہو سکتا تھا،

اصل اختلاف بیان خوش گو اور میر غلام علی آزاد کے درمیان ہے اور دونوں

مصنفوں کا زمانہ بھی قریب ہے یعنی بیدل کی وفات کے وقت خوش گو ادھیڑ ہونگے

تو آزاد نوخیز، اس لیے ان دونوں کے بیانات میں تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ یہ

مان لیا جائے، کہ خوش گو کے بیان کے مطابق بیدل اکبر آبادی الوطن اور آزاد

کے بیان کے مطابق عظیم آبادی المولد تھے،

ط ایلزی قبیلہ

یہ بات کہ پٹنہ اُن کی جائے پیدائش تھی، یا نہ تھی، خواہ مشتبہ ہی ہو، لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں، کہ انھوں نے اپنا ایک اچھا خاصہ زمانہ پورب کے شہروں اور قصبوں میں گذارا، چنانچہ معتبر راوی خوش گو اپنے سفینہ میں رقم طراز ہے:-

پس آنحضرت بطریق سیاحی رو بہ مشرق نہاد، عزیمت فرمودہ مدتے در حدود ممالک بنگ[1] و بہار و اڈیسہ بآزادگی و بے تعینی بسر بردہ و در دشت و بیاباں پیمودہ عجائب قدرت الٰہی تماشا نمودہ اکثر از خصوصیات آں ہنگام در چہار عنصر نگاشتہ قلم راست رقم اوست و ہم دراں ایام بسیارے نعمت درویشی نیز نصیب او گردیدہ انجا بتکلیف بیرکامگار بہ ہندوستان رسیدہ چندے بہ بلدۂ اکبر آباد اقامت ورزیدہ و باز بدار الخلافہ شاہجہان آباد رسیدہ کنج عزلت گزید"

خوش گو کی اس عبارت سے ظاہر ہے کہ بیدل ایک مدت تک پورب میں رہے، اس لیے ان کا عظیم آبادی مشہور ہونا بے اصل نہیں ہے، اب ہم اون کی کتاب چہار عنصر سے ان شہروں کا پتہ لگاتے ہیں، جہاں جہاں اون کا قیام رہا یا اون کی آمد و رفت رہی، اس سلسلہ میں خود ان کے کچھ ذاتی حالات بھی زیر قلم آئیں گے،

بیدل صوفی منش تھے اور مشائخ اور بزرگوں کی ملاقات کے مشتاق رہتے تھے، ان کی تصنیفات میں چہار عنصر[2] اون کے صوفیانہ ذوق و شوق اور نکتہ شناسی اور بزرگوں کی ملاقاتوں اور باتوں کے تذکروں سے معمور ہے، بیدل کے والد قادری المشرب تھے، وہ حضرت قطب ربانی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی روحانیت سے

---

[1] بنگال [2] کتاب مذکور نولکشور لکھنؤ میں چھپی ہے،

فیض یاب تھے، اور عجب نہیں کہ انھوں نے اپنے بیٹے کا نام عبدالقادر اسی مناسبت سے رکھا ہو، بیدل لکھتے ہیں :-

"ملقین والد شریف فقیر از روح مقدس حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ بوساطت آن ذات تقدس آیات بود" (ص ۳۰۱)

بیدل کے چچا مرزا قلندر بھی اسی چشمہ سے فیضیاب تھے۔

مرزا قلندر عم من از نسبت ہم حرنگیش کلاہ مباہات بر عرش عزت می سود آوازہ سلسلۂ قادریہ از رسائی قدرتش مشتہر گردوں کمندے دپایہ مدارج سلوک باستقامت ہمتش مفتخر سربلندی (ص ۳۰۱)

بیدل کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا، باپ کا انتقال تو ان کے بچپن میں ہو چکا تھا، مگر چچا کا سایہ مدت تک اُن کے سر پر رہا، اور ان ہی کی تربیت میں بیدل جوان ہوئے، اس لیے سپاہیانہ اور صوفیانہ ذوق ترکہ میں پایا، بیدل نے اپنے چچا کی شہ زوری اور پُرخوری (ص ۳۳۳) اور اپنی شہ سواری (ص ۳۴۴) کے اور خوش گو نے اپنے سفینہ میں بیدل کی پُرخوری کے واقعات لکھے ہیں، جوانی میں اپنے صوفیانہ ورع و تقوی کی پردہ داری کے لیے سپاہیانہ ملازمت کا پیشہ اختیار کیا،

ناچار تتبع سنت آباد گردید و طریقہ سپاہ گزید تا طبیعت ہیچ خورسند از آفات تعین ورع چندے در سایۂ تیغ امان داشتہ باشد در ہم نزور تقوی بسر داری این وضع دامن ناموس بے تعینی نخراشد (ص ۴۳۰)

بیدل کو بچپن سے تعویذ و عملیات کا شوق تھا، اور اسی راہ سے وہ تصوف کے کوچہ سے آشنا ہوئے، اور گو وہ موروثی طور سے قادری تھے، مگر اپنے علوم

و معارف کے لحاظ سے ان پر نقشبندیت اور مجددیت کے اثرات غالب معلوم ہوتے ہیں،
وہ اپنی نظم و نثر میں جو نکتے بیان اور جن حقیقتوں کو ظاہر کرتے ہیں، وہ تمامتر وحدت شہود،
ظہور اسما، وصفات، تعین، بے تعینی، فنا، تجرد، استغنا کے مضامین ہیں، جو ان کے اشعار
و نکات میں جابجا آتے رہتے ہیں،

بہرحال سپاہیانہ طور سے مختلف صوبوں میں ملازمت کے خیال سے یا تجرد
کے عالم میں بزرگوں سے ملاقات کے شوق میں وہ مختلف شہروں میں پھرتے رہے ہیں
ان کی مسافرت کا مغربی سلسلہ چہار عنصر کے تخلص سے بابا حسن ابدال کے قصبہ پر جو
پشاور کے قریب واقع ہے، ختم ہوتا ہے، یہاں اُن کے فیض تلقین سے ایک جوگی
جو وحدتِ شہود کے مسلک میں اُن کا ہم عقیدہ تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی رسالت کا قائل ہو کر اسلام لایا، اور ان کی سیاحت کا مشرقی نقطہ اڑیسہ کا
شہر کٹک ہے، جہاں اوس زمانہ میں مولانا یعقوب چرخی کے پوتے خان دوران
سید محمود صوبہ دار تھے، (ص ۳۴۹)

بیدل کے سفر کے مقامات میں مغرب میں بابا حسن ابدال اور پورب میں
اڑیسہ کے علاوہ زیادہ تر یوپی اور بہار کے شہر اور قصبے ہیں، متھرا اور بندرا بن میں
کئی سال رہے ہیں، اکبرآباد آئے گیے ہیں، اور بہار کے مختلف شہروں میں اون کی
آمد و رفت رہی ہے، مگر ان تمام مقامات پر استقصار کی نظر ڈالنے سے یہ معلوم
ہو جاتا ہے، کہ بچپن سے جوانی تک ان کا تعلق زیادہ تر بہار سے رہا، اور جوانی سے
بڑھاپے تک اور اخیر زمانہ دہلی میں گذرا،

اوپر گذر چکا ہے کہ ان کے والد اور چچا قادری المشرب صوفی تھے، مگر یہ فیض

ان کو بہار ہی میں ایک شیخ وقت سے حاصل ہوا، بیدل نے عنصر ادل میں اپنی ظاہری وباطنی ابتدائی تعلیم کا حال اس طرح بیان کیا ہے،

وہ بچہ ہی تھے کہ ان کے والد نے وفات پائی، ماں نے اپنے بچہ کو چھٹے سال چھٹے مہینے (رجب میں) پڑھانے کے لیے بٹھایا، دسویں برس کی عمر میں قرآن پاک ختم کر کے فارسی نظم ونثر اور عربی صرف ونحو کی کتابیں تمام کیں، اور یہی ان کی رسمی تعلیم کی آخری حد ہے، اس کے بعد جو کچھ پایا وہ معلم فطرت کی تعلیم کا نتیجہ ہے"

(ص ۳۰۰ وص ۴۰۱)

اس ظاہری تعلیم کے اختتام کے بعد ہی، وہ صوبہ بہار کے ایک بزرگ شاہ کمال قدس سرہ کی خدمت میں پہنچ گئے، جو ان کے والد اور چچا کے پیر تھے؛ (ص ۳۰۱)

اکنوں از کمال تعلیمی اساتذۂ معنوی کہ بہ جمال توجہ شان نسخہ آرائے تفاصیل حقائق است سطرے چند می نگارد و ذکر صحبت فیض منقبت ایشاں از مغتنمات توفیق بیاں می شمارد، استفادۂ صحبت صافی گوہر دریائے یقین رونق انجمن شرع مبین، ہادی عالم فیض، توفیق خضر، سرچشمۂ رمز تحقیق، آئینہ حقائق تمثال، مولانا شیخ کمال کہ تلقین والد شریف فقیر از روح مقدس حضرت غوث الاعظم رضی اللہ عنہ بوساطت آن ذات تقدس آیات بود، میرزا قلندر عم من از نسبت ہم رنگیش کلاہ مباہات ہر عرش عزت می سود، آوازۂ سلسلۂ قادریہ از درسا فی قدرتش مشتہر گردوں کمندے دپایۂ مدارج سلوک باستقامت ہمتش مفتخر سربلندی حقیقت اخلاق از آئینۂ سمایش چوں نور از آفتاب روشن ومعنی عظمت از نسخہ سراپایش چوں رفعت از افلاک مبرہن ہم در آداب قواعد شریعت

نسق زمانہ وہم در علوم ارشاد طریقت استاد یگانہ . . . . در مالک بہار بہ یمن ہدایت پناہ جمعے از وادی ضلالت درگذشتند و موصول سر منزل توفیق صلاح گشتند . . . . . . (ص ۳۰۳)

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ بیدل کے والد بزرگوار جو بیدل کے بچپن ہی میں جب وہ چھ برس کے بھی نہ تھے، وفات پا چکے تھے، اور ان کے والد حضرت شاہ کمال بہاری کے صحبت پروردہ تھے، اور ان کے چچا مرزا قلندر بھی جو بعد کو اپنے یتیم بھتیجے کے ولی تھے، ان ہی بزرگ کے خوشہ چین تھے،

یہ بزرگ کہاں رہتے تھے، بیدل کے بیان سے صاف معلوم نہیں ہوتا، مگر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرائے بنارس بہار میں ایک مقام تھا، یہاں ان کا قیام تھا،

"سرائے بنارس کہ موضعے است از نواح مالک بہار (ص ۳۰۷)

سرائے بنارس نام کا کوئی مقام مجھے ابھی تک معلوم نہیں ہوا، آگے چل کر لکھتے ہیں،

"مرزا قلندر را چندے در قصبہ رانی ساگر کہ بہ یمن توطن مولانا شیخ کمال افتخار مدینۃ الاولیاء داشت اتفاق اقامت بود . . . . . . از بنارس تا رانی ساگر فرسنگے بیش نبود" (ص ۳۰۷)

یہاں چھپا ہوا بنارس ہے، مگر غالباً صحیح سرائے بنارس ہے، جس کا ذکر پہلے گذرا، مرزا قلندر رانی ساگر جا کر شیخ کے پاس ہفتوں مقیم رہتے تھے، (ص ۳۰۴) رانی ساگر میں خوشنما تالاب تھا (۳۰۴)

بیدل شیخ کمال کی صحبتوں سے آغاز شباب ہی سے مانوس تھے، اور چچا کے ساتھ

اس بارگاہ اقدس میں پہنچتے تھے اور ان کے معارف وحقائق سے بہرہ مند ہوتے تھے، (۳۱۵)

رانی ساگر صوبہ بہار میں آرہ شاہ آباد سے اٹھارہ میل اور پٹنہ سے پچاس ساٹھ میل پچھم اب بھی آباد ہے، اور تالاب بھی موجود ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں بیدل کے باپ اور چچا نے تلقین کا فیض پایا، اور بیدل کے دل ودماغ نے وہاں سے آبیاری پائی، اس سے قیاس ہوتا ہے، کہ بیدل کا مولد اگر پٹنہ نہ بھی ہو تو ان کا منشا یعنی ان کی ابتدائی نشو ونما کی جگہ بہار ہی کا کوئی مقام ہے،

شاہ کمال صاحب قدس سرہٗ سے ایک اور ملاقات کا ذکر، بہار کے قصبہ آرہ میں جو اب ضلع ہے، بیدل نے کیا ہے،

درایامے کہ قصبہ آرہ اقامت کدۂ امر اتفاقی بود، او یم افسرز میں بسہیل

تدمش رائحۂ سعادت می اندوخت (ص ۳۱۹)

دوسرے حلقۂ شوق کے ساتھ مرزا قلندر بھی شاہ صاحب کے ہم رکاب تھے

خصوص مرزا قلندر کہ در ہر بن موے زبانے داشت مرہون ستایش

کمالش و در ہر جنبش نفس بیانی مصروف تذکرۂ احوالش (ص ۳۱۹)

۱۰۶۸ھ میں جس سال شاہ شجاع نے شاہ جہاں کی بیماری کے زمانہ میں بنگال اور بہار میں اپنی سلطنت کا علم کھڑا کیا، بیدل پٹنہ میں یا پٹنہ کے پاس ہی کہیں مقیم تھے، اس زمانہ میں اس ملک کی جو کیفیت تھی، اور آس پاس کے راجے اور زمیندار جس طرح ملک میں ہنگامہ برپا کر رہے تھے، اور اس سے ملک میں جو بدامنی پیدا ہو رہی تھی، اور راستے جیسے خطرناک ہو گئے تھے، اس کا پورا حال عنصر چہارم میں کئی صفحوں میں لکھا ہے، اور صوبہ بہار و پٹنہ کا حال جس طریقہ سے

لکھا ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے، کہ وہ اس صوبہ سے پوری طرح آشنا تھے، اور یہاں کے نہ صرف شہروں بلکہ گانوں سے بھی واقف تھے، بلکہ کہیں کہیں جاکر رہے بھی تھے۔ لکھتے ہیں :-

سالے کہ شاہ شجاع بن شاہ جہان بیماری پدر را سکۂ مضمون سلطنت اندیشیدہ از خطۂ بنگالہ تا سرحد ممالک بہار . . . . . و از انجملہ تسخیر نواح ترہت کہ شمالی حدود پٹنہ ملکے است عظیم و کوہستانی مشتمل بر چندیں عقبات (ص ۵۵۱)

شاہ شجاع کی طرف سے بیدل کے چچا مرزا قلندر کے ایک عزیز مرزا عبداللطیف ترہٹ میں فوج کے افسر تھے، (ص ۵۵۱) بیدل بھی ترہت میں کہیں رہ نورد تھے۔ ایک مقام پر پہنچے، جس کا نام چاند چور بتایا ہے اور وہاں کے عجائبات خیالی کا ایک واقعہ حوالۂ قلم کیا ہے، (ص ۵۵۴) اور آخر وہ کسی طرح

بہ سواد دامن پٹنہ رسید (ص ۵۵۴)

ایک اور موقع پر پٹنہ کا ذکر کرتے ہیں

در بلدہ پٹنہ وفاق معارف اتفاق مرزا ظریف (ص ۵۵۵)

پٹنہ سے پچاس ساٹھ کوس دریاے گنگا کے اوس طرف مظفرپور اور موتی ہاری کے بیچ میں نہسی نام ایک قصبہ تھا، جواب بھی ہے، اس قصبہ میں بیدل کے چچا مرزا قلندر بھی سکونت پذیر تھے، اور بیدل ان کے ساتھ تھے، (ص ۵۶۶) سنہ ۱۰۷۰ھ میں جب شاہ شجاع کا ہنگامہ سرد پڑ رہا تھا،

مرزا قلندر نے اسی نہسی کے راستہ سے بنگال کا رخ کیا، اور اپنا سامان

واسباب یہیں چھوڑ دیا، (ص ۵۶۶)

نہسی میں اس وقت کوئی بزرگ خواجہ شاہ محمد تھے، ان کے تابعون
میں جان محمد تھے، ان ہی کے پڑوس میں مرزا قلندر کی سکونت تھی (ص ۵۶۶)

اسی بدامنی کے زمانہ میں بیدل کو اس قصبہ میں جانے کی ضرورت
پیش آئی (ص ۵۶۶) جمعیت کے بجائے تنہا ایک ملازم کو لیکر پاپیادہ چل پڑے
پیادہ چلنے کی عادت نہ تھی، راہ میں بیحد تکلیف ہوئی، گنگا سے پار اتر کر
تین کوس ہی گئے تھے، کہ تھک گئے، کسی طرح جمناپور تک پہنچے، پھر تین کوس
اور چلے تھے، کہ بالکل بے بس ہوکر، پڑگیے، اتنے میں دیکھا کہ ایک پیر مرد
ایک گھوڑی پر سوار سامنے آئے، قریب آکر بڑی گرم جوشی سے سلام کیا،
اور اس تباہ حالی کے ساتھ سفر کا سبب دریافت کیا، بیدل کے وہ پہلے
ملنے والے تھے، مگر بیدل ان کو پہچان نہ سکے، انھوں نے کہا:

من جان محمدم از تابعان خواجہ شاہ محمد کہ در نہسی با مرزا
قلندرش نسبت ہمسایگی دیوار بدیوار است (ص ۵۶۶)

انھوں نے بڑے اصرار کے ساتھ بیدل کو اپنی گھوڑی پر سوار کیا،
اور خود پیادہ ساتھ ہوے، اور دونوں نہسی کی طرف چلے،

"ہنگام نماز عصر محمل تردد بسواد معمورۂ نہسی رسید پیرد انست
تخمیر بر دروازۂ خواجہ شاہ محمد ایستادہ بود" (ص ۵۶۶)

لوگوں کو بیدل کی آمد کی خبر ہوئی، تو سب خوش ہوئے،

فرداے آں کہ پسران خواجہ برسم قدیم صحبت فقیر دریافتند (ص ۵۶۹)

ان لفظوں کو پھر پڑھئے کہ خواجہ صاحب کے لڑکوں نے رسم قدیم کے مطابق بیدل سے ملاقات کی۔ اور صحبت رہی، رقعات بیدل کے آخر میں ایک رقعہ بہار کے کسی بزرگ کے نام کا ہے، جس کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے،

نسیم عیش صوبہ بہار مبارکباد قبلۂ آرزو دے بے دلال ہرچند عبودیت قدیم بہیچ جاے ازاداے خدمات سر بر نمی آرد"

ان اقتباسات اور حالات سے ظاہر ہوگا، کہ بیدل کو صوبہ بہار سے بھی موروثی تعلق تھا، اور اگر اس کو عظیم آبادی کہنے میں تامل ہو تو بہاری کہنے میں مطلق تامل نہیں، اور اکثر قصباتی لوگ بہاری کے بجاے عظیم آبادی ہی کہلاتے ہیں،

آخر میں عظیم اباد پٹنہ کے شرفا کی زبان پر بیدل کے متوطن عظیم آباد ہونے کی جو کہانی سینہ بہ سینہ نقل ہوتی چلی آئی ہے، ہم اس کو ذکر کرتے ہیں، شاد عظیم ابادی اپنی تاریخ صوبہ بہار میں جس کو انھوں نے ۱۸۹۰ء میں لکھا ہے، لکھتے ہیں:-

مرزا عبدالقادر متخلص بیدل خاص عظیم اباد پٹنہ کے متوطن تھے، ناقدردانی ابناے روزگار کے سبب سے وطن کو چھوڑ کر عہد دولت شاہجہاں میں دہلی گئے اور وہاں نہایت معزز و مکرم ہوئے . . . اگلے لوگوں سے سنا ہے کہ مرزا محلہ ٹپن ڈیوڑی میں رہتے تھے، لیکن کسی تاریخ میں نہیں دیکھا" (ص ۲۲۰)

چہار عنصر میں میری تلاش میں دو دفعہ اکبر آباد کا ذکر آیا ہے،

در بلدۂ اکبر اباد منظور ابرار امیر کامگار کہ بدلیل سعادت ازلی اوقات گرامی مصروف خدمت فقرا، داشت و در احترامیکہ لائق حال

این طائفہ است . . . . . . بہ حکم حسن اعتقاد فقیر را نیز از ین فرقہ تصور فرمودہ (ص ۴۹۲)

دوسرا موقع

تابستانی در گوشۂ از زدایاے اکبرآباد گرمی ہاے صحبت تنہائیم بساط عافیتے بر داختہ بود" (ص ۵۴۹)

مگر ان کے ان فقروں میں سے کسی سے بھی وطن نہیں آتی

معارف

اگست ۱۹۴۶ء



حکیم سنائی کے سنینِ عمر

شیخ ابو المجد مجدود بن آدم سنائی کے متعلق اتنا بالاتفاق ثابت ہے کہ انھوں نے سلطان بہرام شاہ غزنوی (۵۱۲ھ – ۵۴۷ھ[۱]) اور سلطان سنجر سلجوقی (۵۱۱ھ – ۵۵۲ھ) کا زمانہ پایا ہے، لیکن ان کی عمر کے سنین میں بے حد اختلاف ہے۔

نظامی عروضی جس نے تقریباً ۵۵۰ھ میں اپنی کتاب چہار مقالہ لکھی ہے، اس نے سنائی کا نام غزنوی سلاطین (آل ناصر) کے شعرا میں سب سے آخر میں لیا ہے (ص ۲۸ گب) عوفی نے لباب الالباب (۶۱۸ھ) میں حسب دستور کوئی تاریخ و سنہ درج نہیں کیا ہے، حمد اللہ قزوینی نے گزیدہ میں جو ۷۳۰ھ میں لکھی گئی ہے، دو جگہ ان کا ذکر کیا ہے، ایک مشائخ کے سلسلہ میں اور دوسرے شعراء کے ضمن میں، پہلے موقع پر لکھا ہے:

"معاصر شیخ ابو سعید ابو الخیر بود" (ص ۷۸۰ گب)

شیخ ابو سعید ابو الخیر کی وفات ۴۴۰ھ میں ہوئی ہے، اس بنا پر سنائی کی تاریخ زندگی بھی اسی کے پیش و پیش ہونی چاہیے لیکن دوسری جگہ اس میں لکھا ہے:

"تا زمان سلطان بہرام شاہ (غزنوی) در حیات بود" (ص ۸۱۸ گب)

بہرام شاہ غزنوی کی سلطنت کا زمانہ ۵۱۲ھ سے ۵۴۷ھ تک ہے، اس لحاظ سے انکی تاریخ وفات اسی عہد کے درمیان ہونی چاہیے۔

مولانا جامی نے نفحات میں نقل کیا ہے کہ سنائی نے سلطان محمود کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا،

۱؎ بہرام شاہ کی وفات کا سال گزیدہ میں ۵۴۴ھ ہے، طبقات ناصری میں ۵۵۲ھ، بدایونی میں ۵۴۸ھ، برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات (ص ۹، ۵۴۹ ج ۲) میں ۵۴۷ھ ہے، مگر زیادہ تر مورخین ۵۴۷ھ ہی لکھتے ہیں۔

سلطان محمود نے ۴۲۱ھ میں وفات پائی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنائی کی ولادت چوتھی صدی کے اواخر میں ہوئی ہوگی، اور پانچویں صدی کے شروع میں اس قابل ہوں گے کہ سلاطین کیلئے مدحیہ قصیدے کہہ سکیں، مگر خود اسی نفحات میں مولانا نے ان کا ایک ہی سال وفات (گو بقول بعض) لکھ کر نقل کیا ہے، اور وہ ۵۲۵ھ ہے، اور یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہوسکتیں، ورنہ ان کی عمر شاید سوا سو برس سے زیادہ کی ماننی پڑے گی۔

حکیم موصوف کے سال وفات میں بھی اختلاف ہے جن کی تفصیل آگے آئے گی، ان مشکلات کے حل کی صورت یہ ہے کہ پہلے سنائی کی مشہور مثنوی حدیقہ کی تصنیف کی تاریخ متعین کیجائے۔

حدیقہ کا سال تصنیف | حکیم سنائی نے اپنی مثنوی حدیقہ کے آخر میں اپنی اس کتاب کی تصنیف کا سال لکھا ہے، مگر عجب تر یہ ہے، کہ اس کے قلمی اور مطبوعہ دونوں قسم کے نسخوں میں یہ تاریخی شعر کئی طرح پر ہے، اکثر نسخوں میں تو یہ ہے:

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام   پانصد و بست و پنج گشتہ تمام

اس سے تصنیف کی تاریخ ۵۲۴ھ سے ۵۲۵ھ تک معلوم ہوتی ہے، لیکن یہی شعر لکھنؤ کے شاہی کتب خانہ کے ایک نسخہ میں (دیکھو اسپرنگر کی فہرست) نیز شرح حدیقہ کے قلمی نسخہ (انڈیا آفس لائبریری) اور بعض دوسرے قلمی نسخوں میں اس طرح ہے۔

پانصد و سی و چار رفتہ ز عام   پانصد و سی و پنج گشتہ تمام

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ۵۳۴ھ میں شروع اور ۵۳۵ھ میں تمام ہوئی،

لیکن نولکشور لکھنؤ کے مطبوعہ نسخہ میں اور ایک دو قلمی نسخوں میں (دیکھو فہرست میونک یونیورسٹی لائبریری) یوں ہے،

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام   پانصد و سی و پنج گشتہ تمام

یہ شعر بتاتا ہے کہ حدیقہ ۵۲۵ھ میں شروع اور ۵۳۵ھ میں تمام ہوئی یعنی دس برس میں۔

میونک یونیورسٹی کے ایک نسخہ میں اس آخری قرأت کی ایک اور تصحیف ہے۔

ماہ بست و چہار رفتہ ز عام   پانصد و بست و پنج گشتہ تمام

بوڈلین کے ایک نسخہ میں حسب معمول "پانصد و بست و چار اور پانصد و بست و پنج" ہے،

لیکن دوسرے میں (نمبر ۵۳۳) ایک اور تغیر ہے،

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام   پانصد سی و چار گشتہ تمام

اس میں ۵۲۴ھ میں آغاز اور ۵۳۴ھ میں انجام بیان ہوا ہے،

بہرحال ان میں سے کوئی سا نسخہ بھی اختیار کیا جائے، اتنا تو بے شبہہ ثابت ہے کہ حکیم موصوف کا زمانہ پانچویں صدی کے اواخر سے لیکر چھٹی صدی کے اواسط تک ہے، اس کے خلاف کی سب روایتیں قطعاً غلط ہیں،

اب یہ سوال ہے کہ ان مختلف نسخوں میں سے کون صحیح ہے، تو اس کے جواب میں حسب ذیل مراتب طے کرنے ہیں،

۱۔ اکثر نسخوں میں ۵۲۴ھ۔ ۵۲۵ھ ہے۔

۲۔ متعدد نسخوں میں ۵۳۴ھ۔ ۵۳۵ھ ہے۔

۳۔ ایک دو نسخوں میں ۵۲۵ھ۔ ۵۳۵ھ ہے،

۴۔ ایک میں ۵۲۴ھ۔ ۵۳۴ھ ہے۔

پہلے اور دوسرے نسخوں کی بنا پر تصنیف کی مدت ایک سال ہوتی ہے، اور تیسرے چوتھے کی بنا پر دس سال، یہ دس سال کی مدت تصنیف حسب ذیل وجوہ سے ناقابل قبول ہے،

۱۔ یہ اکثر معتبر و مستند نسخوں کے خلاف ہے۔

۲. سنائی نے ۵۲۸ھ میں اپنی مثنوی طریق التحقیق لکھی ہے، جیسا کہ اس مثنوی کے آخر میں ہے (فہرست انڈیا آفس لائبریری)

پانصد و بست و ہشت ز آخر سال | بود کیں نظم نغز یافت کمال

ظاہر ہے کہ پہلی مثنوی کے تمام ہونے کے بعد ہی سنائی نے یہ دوسری مثنوی شروع کی ہوگی، تصانیف اور خصوصاً نظمیہ اور وہ بھی ہم مضمون نظمیات کے ظاہر حال کے خلاف ہے کہ ایک کو ناتمام چھوڑ کر، دوسری کو شروع کر دیا جائے کہ ایک ہی قسم کے ذوقیات اور ایک ہی قسم کے وزن میں تغیر اور تبدل کی ضرورت قرائن کے خلاف ہے۔

۳. اس شعر کے اوپر ایک اور شعر سب نسخوں میں ہے جس میں مہینوں کا ذکر ہے، ان دونوں شعروں کو ملا کر پڑھنے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس تصنیف میں ایک سال صرف ہوا ہے وہ شعر یہ ہیں:

شد تمام ایں کتاب در مہ دی | کہ در آغاز کندم ایں را پی

پانصد و بست و چار رفتہ ز عام | پانصد و بست (سی) و پنج گشتہ تمام

آغاز و انجام کے مہینوں کا یہ حساب اسی وقت پیش کیا جاتا ہے جب حساب سال کے اندر یا سال کے قریب ہو، اس قرینہ سے اس قرأت کی تصدیق ہوتی ہے جس سے تصنیف کی مدت ایک سال ثابت ہوتی ہے، ایک سال کے آغاز سے لیکر دوسرے سال کے وہیں تک ٹھیک ایک سال ہوتا ہے، اس لیے اکثر نسخوں کے مطابق یہ تصریح نکلتی ہے کہ ماہ آذر ۵۲۴ھ سے شروع ہو کر ماہ دی ۵۳۵ھ میں تمام ہوئی، اور یا بعض نسخوں کے مطابق یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ماہ آذر ۵۳۴ھ سے تصنیف کا آغاز اور ماہ دی ۵۳۵ھ میں اس کا انجام ہوا،

اگر یہ مدت دس گیارہ برس ہوتی (۵۲۴ھ سے ۵۳۵ھ یا ۵۳۴ھ تک) تو آغاز و انجام کے

نہیوں کا پیش کرنا بے سود ہو جاتا ہے ،

۴۔ شعراء اس قسم کی تاریخ کا اظہار فخریہ کرتے ہیں ، ایک سال میں (یعنی ۵۲۴ھ ۔ ۵۲۵ھ یا ۵۳۴ھ ۔ ۵۳۵ھ) اس کتاب کا تصنیف پانا تو وجہ افتخار بن سکتا ہے ، مگر دس گیارہ برس کی محنت شاقہ میں تصنیف پانا سنائی کیا کسی معمولی شاعر کے لیے بھی افتخار کی وجہ نہیں ہو سکتی ۔

ان قرائن کی بنا پر ۵۲۴ھ ۔ ۵۳۵ھ کا نسخہ ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صحیح وہی نسخہ ہے جس سے اس کی تصنیف کی مدت ایک سال ثابت ہو[۱]۔ اب اگر ۵۲۴ھ ۔ ۵۲۵ھ کا نسخہ صحیح ہے تو ثابت ہوگا کہ حدیقہ پہلے اور طریق التحقیق ۵۲۸ھ میں بعد میں لکھی گئی اور اگر دوسرا نسخہ ۵۳۴ھ ۔ ۵۳۵ھ صحیح ہو تو معلوم ہوگا کہ طریق التحقیق ۵۲۸ھ میں پہلے اور حدیقہ ۵۳۴ھ ۔ ۵۳۵ھ میں بعد کو نظم ہوئی ۔

اب ان دونوں نسخوں میں سے جن میں سے ایک میں "بست و چار و بست پنج" اور دوسرے میں "سی و چار و سی و پنج" ہے ، پہلا نسخہ میرے خیال میں صحیح ہے ۔ کیونکہ حدیقہ کے اکثر و معتبر نسخوں میں بست و چار و بست و پنج ہی مذکور ہے ،

چنانچہ ہندوستان اور یورپ کے جن کتبخانوں کے نسخوں کا حال معلوم ہو سکا ہے ، ان میں علی العموم یہی تاریخ ہے ۔ بمبئی کے نسخہ مطبوعہ ۱۸۵۹ء میں جو ایرانیوں نے چھاپا ہے ، یہی ہے ، حاجی خلیفہ چلپی کے سامنے جو نسخہ تھا ، اس میں بھی یہی تھا ۔ کشف الظنون میں ہے ،

" فرغ من نظمہ سنۃ اربع وعشرین وخمس ماتہ "

مولانا جامی کے پیش نظر نسخہ میں بھی یہی تھا ۔ نفحات میں ہے :

" تاریخ تمامی حدیقہ چنانچہ خود بنظم آوردہ سنۃ خمس وعشرین وخمسمائہ بودہ است "

اس بنا پر اسی نسخہ " بست و چار و بست و پنج " کو صحیح تر ماننا چاہیے اور یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ

---

[۱] وسیع النظر پروفیسر شیرانی کا تنقید شعر العجم ذکر سنائی میں "بست و چار دسی و پنج" کے نسخہ کو بلا دلیل تسلیم کرکے یہ نتیجہ نکالنا کہ سنائی حدیقہ کی تصنیف میں دس برس مصروف رہے یعنی ۵۲۴ھ سے ۵۳۵ھ تک ، درست نہیں معلوم ہوتا ، شاید انکے پیش نظر صرف نولکشور والا نسخہ تھا ۔
" ص "

سنائی نے حدیقہ ماہ آذر ۵۲۴ھ میں شروع اور ایک سال بعد ۵۲۵ھ میں تمام کی،

تاریخ ولادت حکیم سنائی کی تاریخ ولادت عموماً اگلے تذکروں میں مذکور نہیں، مگر بعض متاخرین نے ۴۳۴ھ ولادت کی تاریخ لکھی ہے؛ چنانچہ ریو نے تذکرۃ الافکار کے حوالہ سے یہی تاریخ نقل کی ہے، (فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم ج ۲ ص ۵۵۰) شیر خاں لودی نے صاحب مجمل فصیحی کی روایت سے اپنے تذکرہ مرآۃ الخیال (ص ۴۴ طبع کلکتہ) میں، اور آزاد بلگرامی نے ید بیضا میں بھی یہی تاریخ ولادت درج کی ہے، مگر میرے نزدیک یہ قطعاً غلط ہے، یہ معلوم ہو چکا ہے کہ حدیقہ اکثر و بیشتر نسخوں کے مطابق ۵۲۴ھ-۵۲۵ھ میں لکھی گئی ہے، اور اگر بعض دوسرے نسخوں کا اعتبار کیا جائے، تو ۵۳۴ھ-۵۳۵ھ میں تالیف ہوئی، حدیقہ کے تقریباً وسط میں ہے،

پاسے بر پائے آمد از غم شصت ۶۰   لاجرم دست می زنم بر دست

(باب الضعف والشیب)

عمر دادم بکلی برباد   بر من آمد ز شصت ہمہ بیداد

(فی تبدیل الحال)

ان دونوں شعروں سے ثابت ہے کہ حدیقہ کی تصنیف کے وقت سنائی کی عمر ساٹھ ۶۰ سال تھی، اب اگر ۵۲۴ھ کو وقت تصنیف مانا جائے تو ولادت کا سال ۴۶۴ھ نکلے گا، اور اگر ۵۳۴ھ مانا جائے تو ۴۷۴ھ ہوگا۔

تاریخ وفات سنائی کے سال وفات کے متعلق چار روایتیں ہیں

۱۔ شیر خاں لودی نے مجمل فصیحی کی روایت سے لکھا ہے کہ سنائی ۴۳۴ھ میں پیدا ہوئے اور باسٹھ ۶۲ برس کی عمر پائی، اس حساب (۴۳۴ + ۶۲ = ۴۹۶) سے ۴۹۶ھ میں واقع ہوئی ہے،

جو سراپا غلط ہے کہ یہ حدیقہ و طریق التحقیق کی تصنیف سے اور بہرام شاہ و سنجر کی تخت نشینی سے پہلے کا واقعہ ہوگا، جو ہر طرح شائبۂ صحت سے خالی ہے۔

۲۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں بعض کا قول نقل کیا ہے کہ ۵۲۵ھ میں جب سال حدیقہ کی تصنیف ختم ہوئی، مصنف کی زندگی کا بھی خاتمہ ہوا۔

بعد کے اکثر لوگوں نے اس بعض کے قول کی بے تحقیق تقلید کی ہے۔

۳۔ تقی الدین کاشانی نے اپنے تذکرۂ خلاصۃ الاشعار و زبدۃ الافکار میں جو ۹۷۹ھ ۔ ۹۹۳ھ کی تالیف ہے، اور جس کے ابواب کا خلاصہ ڈاکٹر اسپرنگر نے اپنی فہرست کتب خانۂ شاہ اودھ میں دیدیا ہے، سنائی کی وفات کا سال ۵۴۵ھ نقل کیا ہے، (ص ۵۵۸)

(فہرست مذکور ص ۵۵۰)

۴۔ دولت شاہ سمرقندی نے تذکرہ میں اپنی مشہور بے احتیاطی کے ساتھ سنائی کا سال ۵۷۶ھ لکھا ہے۔

اگرچہ ان میں سے کوئی بھی قدیم ترین اور قریب ترین شہادت نہیں ہے تاہم محققین حال نے متعدد وجوہ کی بنا پر تقی کاشانی کی روایت یعنی ۵۴۵ھ کے سال وفات کو معتبر قرار دیا ہے۔

میرے نزدیک تو دولت شاہ کی ۵۷۶ھ والی روایت اس لیے قبول کے قابل نہیں کہ جب ۴۶۴ھ میں ان کی ولادت ہوئی اور ۵۲۵ھ میں حدیقہ کی تصنیف کے وقت وہ ساٹھ سال کے تھے تو ۵۷۶ھ میں ان کی عمر ایک سو گیارہ برس کی قرار پاتی ہے، اور یہ طویل عمر ثبوت کی محتاج ہے۔ اور اس لیے بھی اس قدر متاخر تاریخ نہیں مانی جاسکتی کہ سنائی کی تصنیفات میں صرف بہرام شاہ اور سنجر دو بادشاہوں کے نام آتے ہیں۔

اور جیسا کہ معلوم ہو چکا ہے کہ بہرام شاہ غزنوی نے ۵۴۷ھ میں اور سنجر سلجوقی نے ۵۵۲ھ میں وفات پائی ہے، اور ان کے بعد دوسرے سلاطین دونوں خانوادوں میں تخت نشین ہوئے ہیں، اور اگر وہ دوسروں کا زمانہ بھی پاتے تو ان کے نام کے قصائد بھی سنائی کے کلام میں مل سکتے.

حکیم کے کلیات میں غزنویہ اور سلجوقیہ کے صرف ایک ایک بادشاہ کے نام کے قصیدے ہیں، غزنویہ میں سلطان بہرام شاہ کے نام کے اور سلجوقیہ میں سنجر کے.

سلطان ہمہ مشرق بہرام شہ آنکہ بہرام سپہرش نسزد بندہ ٔ در بہ
خسرو خسرو نشاں بہرام شاہ سلطان حق آنکہ بہرام فلک، در سطوتش حیران نماند
آفتاب دادو دیں سنجر کہ او در ایران اول القاب نوشیروان ثانی آمدست

ان دونوں بادشاہوں کے زمانے بہت لمبے ہوئے ہیں، بہرام شاہ کا عہد ۵۱۲ھ سے ۵۴۷ھ تک، اور سنجر کا ۵۱۱ھ سے ۵۵۲ھ تک، اس سے معلوم ہوتا ہے. کہ سنائی نے اول تو درباروں تک دیر ہی رسائی پائی ہے، اور پھر ایک ایک بادشاہ سے زیادہ اپنا مربی نہیں پایا.

پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ سنائی نے ۵۵۵ھ کی وفات کی صورت میں اپنے رب و محسن بہرام شاہ کو ۵۴۷ھ اور سنجر کو ۵۵۲ھ میں مرتے ہوئے سنا، لیکن ان کے اس سانحہ پر غم و حسرت کے دو قطرے بھی نہ بہائے، یہ تعجب خیز ہے، درانحالیکہ معزی شاعر کے سنجر کے ہاتھ سے اتفاقیہ مارے جانے پر وہ آنسو کے چند قطرے گراتے ہیں، اس معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ان بادشاہوں کی وفات کے وقت شاعر زندہ ہی نہ تھا،

۵۲۵ھ کی تاریخ وفات بھی کئی وجوہ سے ناقابل اعتبار ہے.

۱۔ سنائی نے اپنی دوسری مثنوی طریق التحقیق جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ۵۲۸ھ میں لکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ ۵۲۸ھ تک تو یقیناً زندہ تھے۔

۲۔ حدیقہ کے بعض نسخوں میں اس کا ۵۲۴ھ سے لیکر ۵۳۵ھ تک اور بعض کے رو سے ۵۳۴ھ سے ۵۳۵ھ تک تصنیف ہونا پایا جاتا ہے۔

۳۔ سنائی نے امیر معزی شاعر کے مرثیہ میں جس نے ۵۴۲ھ میں سلطان سنجر سلجوقی کے اتفاقی تیر سے زخم کھا کر وفات پائی ہے[1]، چند قطعے لکھے ہیں جن میں ایک کو آذر نے اپنے آتشکدہ میں درج کیا ہے، (ص ۱۵۳ بمبئی)

گر زہرہ بچرخ دو دم آید نشگفت است | در ماتم طبع طرب افزاے معزی
از حسرت درہاے ثمینش چو یتیماں | بنشست عطارد بعزای معزی

اور دوسرے کو مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی نے حواشی چہار مقالہ میں نقل کیا ہے[2]،

تا حیسنہ معزاے معزی کہ خدا لیش | زینجا بفلک برد قباے ملکی داد
چو تیر فلک بود قرینش سرہ آورد | پیکان ملک برد، بہ تیر فلکی داد

اس سے معلوم ہوا کہ ۵۴۲ھ تک سنائی کی وفات نہیں ہوئی تھی اور ۵۴۷ھ میں وہ وفات پا چکے تھے، ورنہ اپنے محسن و مربی بہرام شاہ کا مرثیہ ضرور کہتے۔ اب ان دونوں تاریخوں کے بیچ میں ان کی وفات کا سال ہوگا، اور یہ وہی ۵۴۵ھ ہے جس میں کاشانی نے ان کی وفات بیان کی ہے۔

ان تفصیلات کا نتیجہ یہ ہے کہ حکیم سنائی کی ولادت کا سال ۴۶۴ھ یا ۵۹۵ھ اور وفات کا سال ۵۴۵ھ قبول کیا جائے۔ اس حساب سے ان کی پوری عمر اسی اکیاسی

---

[1] لباب الالباب عوفی ج ۲ ص ۔، گب و آتشکدہ آذر ص ۱۵۳ بمبئی و فہرست مخطوطات انڈیا آفس (حدیقہ سنائی ص ۵۱) [2] حواشی چہار مقالہ ص ۱۵ اگب۔

برس کی ہوگی، اور اگر ۵۳۴ھ کو حدیقہ کا سالِ تصنیف مانا جائے تو دس گیارہ برس عمر اور کم ہو جائیگی،

اس تفصیل سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مستوفی قزوینی صاحب گزیدہ کا ان کو سلطان ابوسعید ابوالخیر متوفی ۴۴۰ھ کا معاصر بتانا قطعاً غلط ہے، نیز حضرت جامی کا یہ فرمانا کہ انھوں نے سلطان محمود المتوفی سنہ ۴۲۱ھ کی مدح لکھی تھی، درست نہیں، اسی لیے دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں اس مدح مذکور کا سلطان محمود کے بجائے سلطان ابواسحاق ابراہیم غزنوی (۴۵۱ھ - ۴۹۲ھ) کی شان میں ہونا ظاہر کیا ہے، جو قرین قیاس ہو سکتا ہے، مگر اس نام کا کوئی قصیدہ شاعر کے مطبوعہ کلیات میں مجھے نظر نہیں آیا، لیکن چونکہ یہ شاید منتخب ہے اسلیے پورے استناد سے نہیں کہا جا سکتا،

(معارف مارچ ۱۹۳۲ء)

حجاز کے کتب خانے

حجاز اسلام کا مرکز ہے۔ اس لیے یہ توقع بیجا نہیں کہ وہ علوم اسلامیہ کا بھی مرکز ہوگا۔ اسلام کی ابتدائی صدیاں اس توقع کے عین مطابق تھیں۔ یہی سرزمین ہے جہاں اسلام کی پہلی کتاب (قرآن مجید) وحی کے دستِ ترتیب سے مرتب ہوئی، یہیں احادیث کا پہلا مجموعہ عمرو بن حزم کے ہاتھ سے مرتب ہوا، یہیں مدینۃ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام و قضایا امام مالک نے فراہم کیے، یہیں فقہ اور اصول فقہ اور احکام القرآن کی پہلی کتابیں امام شافعی نے تالیف کیں، یہیں حدیث کی پہلی صحیح کتاب امام بخاری نے مدینہ منورہ میں بیٹھ کر لکھی، اس عہد میں حجاز کا گوشہ گوشہ قال اللہ و قال الرسول کے ترانوں سے گونج رہا تھا۔

حجاز نے بنی امیہ کے دمشق الشام کا کامیاب مقابلہ کیا، اور اس کے سامنے دمشق کا چراغ نہ جل سکا، مگر عراق کے کوفہ و بصرہ نے آہستہ آہستہ اس کی مرکزیت کو صدمہ پہنچانا شروع کیا، اور آخرکار تیسری صدی میں بغداد نے اس کی قوت کو سلب کرکے سیاسی اور علمی دونوں حیثیتوں سے اس کو عجم کا تخت بنا دیا، اس وقت سے جو اس کے قوی مضمحل ہوکر سوئے تو اب تک نہ جاگے۔

تاہم اس کی مذہبی مرکزیت جو خانہ کعبہ اور مسجد و مدفن نبوی کے باعث دنیائے اسلام میں اس کو حاصل تھی، چونکہ وہ اسلام کے ارکان میں داخل تھی، اس لیے ملوک و سلاطین

اور علماء و فضلاء کے توجہات کو اپنی طرف برابر کھینچتی رہی، صدیاں گذریں، دنیا بدل گئی، سلطنتیں بنیں اور مٹ گئیں، قومیں ابھریں اور فنا ہوئیں، تاہم ہر اسلامی سلطنت نے جو منصۂ وجود پر آئی، اس کی مذہبی خدمت گذاری اپنا فرض سمجھا،

ملوک اور سلاطین اسلام نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی جو خدمتیں کیں جس طرح وہاں سونے چاندی کی نہریں بنائیں، زاویے قائم کیے، مدرسے بنوائے، علماء اور ائمہ کو جاگیریں دیں، اہل خدمت کو وظیفے دیے، اس بنجر زمین میں اپنے ملک کی پیداوار بھیجکر جس طرح اس کو سرسبز وشاداب رکھا، وہاں کے سنگستان میں جو یادگاریں اور مسجدیں بنائیں، جو مسافرخانے قائم کیے، جو نہریں کھدوائیں، جو شفاخانے تعمیر کیے اور رفاہ عام کے جو کام انجام دیے، ان کی کچھ مٹی مٹی یادگاریں کھنڈروں اور ویرانوں کی صورت میں اب بھی باقی ہیں، لیکن تاریخ کے اوراق میں ان کی زندگی اب بھی بعینہٖ محفوظ ہے۔

ان ہی یادگاروں کے ضمن میں کتب خانے بھی داخل ہیں، ہر عہد میں ملوک وسلاطین اور علماء و فضلاء نے اس میں سینکڑوں کتب خانے قائم کیے، مگر بادصرصر کے جھونکے انکے اوراق کو یکے بعد دیگرے منتشر و پریشان کرتے رہے، اس وقت حجاز کی سرزمین میں جو کچھ یادگاریں ہیں، وہ قسطنطنیہ کی مرحوم ٹرکی کے آثار منشور ہیں، اور خدا جانے اب کس مپرسی کے عالم میں ان کی زندگی کب تک ہے،

ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر

مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

اس وقت تاریخ کا پچھلا صفحہ دہرانا مقصود نہیں ہے، یہ دکھانا نہیں ہے کہ اس سلسلہ میں کیا ہوا، بلکہ یہ دکھانا ہے کہ اس وقت کیا ہے؟

ہندوستان کے مسافر کو عرب کا پہلا ساحل جدہ ملتا ہے، جدہ کی گذشتہ علمی یادگار کا مجھکو علم نہیں، سردست اس وقت اس شہر میں علم کے ایک شائق رئیس شیخ محمد حسین نصیف کا وجود ہے، جن کا خاندان ایک مدت سے جدہ میں شرفائے مکہ کا وکیل تھا، مگر پچھلے دنوں وہ اس امتیاز سے محروم ہو چکا تھا، شیخ نصیف سلفی العقیدہ ہیں اور اسی سبب سے اس عہد حکومت میں ان کو خاص رسوخ اور اعتبار حاصل ہے۔

جدہ کے گذشتہ سفر اور موجودہ سفر میں بھی ان کی عنایات کا میں ممنون رہا، موصوف کی ذات جدہ میں ہمارے موضوع بحث کے لحاظ سے تنہا ذات ہے، حجاز کے اس دروازہ میں ان ہی شیخ نصیف کا پہلا ذاتی اور شخصی کتب خانہ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے، شیخ محمد نصیف کے کتب خانہ کا بڑا حصہ مطبوعہ کتابوں پر مشتمل ہے، مگر اسی کے ساتھ قلمی یادگاروں سے بھی وہ خالی نہیں، مجھکو متعدد دفعہ اس کتب خانے کے دیکھنے کا موقع ملا ہے، کتب خانہ میں تین چار ہزار کتابیں ہوں گی، جو الماریوں میں ترتیب سے رکھی ہیں، قلمی نوادر میں اس کتب خانہ کی چند کتابیں ذکر کے قابل ہیں، جن میں سے علامہ ابن حزم اندلسی کی محلی ہے، جو فقہ اسلامی کی انسائیکلو پیڈیا سمجھی جاتی ہے۔ اور ہر عہد میں وہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے، یہ کتاب فقہی فرقہ آرائیوں اور تعصبات سے بلند ہو کر محض اسلامی فقہ واحکام پر لکھی گئی ہے، نسخہ کے بعض اجزا ناتمام ہیں، اس کتب خانہ کی دوسری نادر کتاب حمیدی کی الجمع بین الصحیحین کی پہلی جلد ہے، یعنی بخاری و مسلم میں جو حدیثیں مکرر ہیں، ان کو حذف کر کے صحیحین کی بقیہ روایتیں یکجا کر دی گئی ہیں، امام حمیدی نے ان حدیثوں کو مسند کی طرز پر یعنی راوی اول کے ناموں کی ترتیب پر ان کو مرتب کیا ہے، مثلاً سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیق رضی کی وہ روایتیں ہیں جو بخاری اور مسلم میں آئی ہیں، اسی طرح عقائد میں حضرت امام احمد بن حنبل کے بعض

رسائل ہیں۔

مکہ معظمہ میں بالفعل دو سرکاری اور تین پرائیوٹ کتب خانے ہیں، دونوں سرکاری کتبخانے حرم کے دو مختلف پہلوؤں میں ہیں، باب السلام کے قریب اور باب الزیادہ کی سمت میں تبہ مہر دارالقضاۃ ہے، اسی سے لگا ہوا ایک دروازہ ہے، جو باب المدرسہ کہلاتا ہے۔ ایک راستہ اوپر جاتا ہے، آگے زینہ ہے، زینہ کی دونوں سمتوں میں دو چھتیں ہیں، یہ سلطان محمود کی تعمیر ہیں، ایک طرف کتب خانہ ہے اور دوسری طرف مدرسہ محمودیہ ہے، مدرسہ تو مٹ کر عمارت شخصی تصرف میں آچکی ہے، اور اس میں حاجی کرایہ سے ٹھہرتے ہیں، ہمارے مخدوم نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اسی عمارت میں کئی امسال فروکش تھے،

کتب خانہ قائم ہے، صدر دروازہ میں اوپر ترکی کے چند شعر ہیں، جن میں بنا کی تاریخ اور بانی کا نام نامی ہے۔ غالباً سلطان عبدالمجید خاں کا نام ہے، حرم کی متفرق کتابیں اس میں یکجا کر دی گئیں، اور کچھ قسطنطنیہ سے سلطان نے بھجوائیں، بالفعل اس کتب خانہ میں میرے اندازہ کے مطابق پانچ چھ ہزار کتابیں ہوں گی۔ ان میں مطبوعہ اور قلمی کتابیں ہیں، یہ کتابیں مصاحف، تفاسیر، احادیث، فقہ، تصوف، ادب، تاریخ، تجوید و قرأت، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی غرض ہر علم و فن کی ہیں، اور ترتیب سے کھلی الماریوں میں چنی ہیں،

کتب خانہ کے موجودہ ناظر داغستان کے ایک عالم ہیں، جنھوں نے مصر میں تعلیم پائی ہے، کتب خانہ کی ایک پرانی فہرست ہے، جو ایک ضخیم جلد میں ہے اور شکستہ ہو رہی ہے۔ داغستانی صاحب نے نہایت محنت اور جانفشانی سے اس کی ایک نئی فہرست ترتیب دی ہے اور ہنوز وہ تمام نہیں ہوئی، کچھ حصہ زیر ترتیب ہے، شاید کہ اب تمام ہو گئی ہو۔

قلمی کتابوں میں سینکڑوں کتابیں ایسی ہیں جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہیں، نادر کتابیں
بھی اس میں متعدد ہیں، جن میں سے ایک فرقہ ماتریدیہ کے امام ابومنصور ماتریدی کی تفسیر تاویلات
قرآن ہے، یہ نسخہ نہایت باریک فارسی خط میں، بہت بڑی تقطیع پر ایک ضخیم جلد میں ہے،
امام موصوف نے متکلمانہ حیثیت سے قرآن پاک کی تفسیر املا کی تھی، اور ایک شاگرد نے
اس کو جمع کر کے تاویلات القرآن نام رکھا ہے،

اس کتب خانہ میں ایک اور دوسری تفسیر نظم الدرر فی تناسب الآی والسور کی
چند جلدیں ہیں، اس کے مصنف امام برہان الدین ابراہیم بقاعی ہیں، اس تفسیر کی خاص
خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آیتوں اور سورتوں کا باہم ربط اور نسق بیان کیا ہے، اسی کے
ساتھ ایک اور خصوصیت اس میں ایسی پائی جاتی ہے جو کسی اور قدیم تفسیر میں نظر نہیں آئی
یعنی یہ کہ جہاں جہاں یہود و نصاریٰ کا تعلق ہے، عام مفسرین کی طرح اسرائیلیات اور یہودیوں
کی بیہودہ روایتیں نہیں درج کی ہیں، بلکہ خود توراۃ اور انجیل کی عربی متعلقہ عبارتیں نقل
کی ہیں، امام بقاعی نے یہ تصنیف ۲۴ برس میں تمام کی ہے، ۸۶۱ھ میں شروع کی اور
۸۸۵ھ میں ختم کی،

مکہ کے قیام کے زمانہ میں ایک ہندوستانی مہاجر عالم صاحب جو بالفعل سلطان
ابن سعود کے مخالف ہیں، اور روایتوں کے بیان کرنے میں نہایت بے احتیاط ہیں، انھوں نے
مجھ سے فرمایا کہ نجدیوں نے مکہ معظمہ کے داخلہ کے وقت اس کتب خانہ سے ساٹھ آدمیوں پر
ساٹھ اونٹوں پر لاد کر کتابیں نجد بھجوادیں، اور فلسفہ و منطق اور امام غزالی کی سب
تصنیفات جلا ڈالیں، میں اس کتب خانہ کو پہلے دیکھ چکا تھا، تاہم ان کے اس کہنے پر
میں نے جا کر دوبارہ کتب خانہ کا جائزہ لیا، تو اس میں فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضیات،

تصوف حتی کہ رمل و جفر کی کتابیں بھی موجود پائیں، امام غزالی کی تصنیفات بھی موجود تھیں، اور ساٹھ آدمیوں یا اونٹوں پر اگر کتابیں منتقل کیجاتیں تو کتب خانہ کی الماریاں خالی ہوتیں، میں نے اسی پر بس نہیں کیا، ناظر صاحب سے دریافت کیا، انھوں نے ہنس کر نئی اور پرانی فہرستیں سامنے رکھ دیں، میں نے اپنی تحقیق یہیں ختم نہیں کی، قاضی ابن بلیہد صاحب جو قاضی القضاۃ ہیں، اور جن سے ان چیزوں کا تعلق ہے، ان سے جاکر پوچھا کہ یہ افواہ اس میں کہاں تک صداقت ہے، انھوں نے نہایت غصہ سے اس کی تردید کی، اور کہا کہ اہل نجد کو کتابوں کی حاجت نہیں، ہمارے ملک میں سب کتابیں موجود ہیں،

ہندوستان میں ابھی انڈین مسلم حجاز کانفرنس کی ایک تجویز میں یہ کہا گیا ہے کہ نجدیوں نے فقہ و تصوف وغیرہ کی کتابیں جلا ڈالیں، اور وفد خدام الحرمین کی رپورٹ میں اسی سرکاری کتب خانہ کے ذکر میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کو عینی شہادت ملی ہے، کہ شہداء کے مقام پر جو مکہ معظمہ سے دو تین میل پر ہے، اس کتب خانہ کی فقہ و تصوف اور فلسفہ، منطق وغیرہ کی کتابیں جلا ڈالی ہیں، یہ قطعاً غلط اور کذب محض ہے، اور کتب خانہ آج بھی ان کتابوں سے موجود و فد مذکور کی سنی ہوئی عینی شہادت کی تکذیب کرنے کو تیار ہے، اور ہندوستان میں بھی سیکڑوں اس کے دیکھنے والے موجود ہوں گے،

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (مائدہ)	یہ تقویٰ سے قریب تر ہے	کسی قوم کی عداوت تمھارے اس جرم کے ارتکاب کی باعث نہ ہو کہ تم اسکے ساتھ انصاف نہ کرو (ہر حال میں) انصاف کرو

یہ جملہ معترضہ تھا، جو اس لیے لکھا گیا، تاکہ اسلام کا کوئی آیندہ مخالف مورخ اس واقعہ کو دوسرا کتب خانہ اسکندریہ نہ بنالے۔

حرم کا دوسرا عمومی کتب خانہ شروانیہ کے نام سے موسوم ہے، یہ کتبخانہ محمد رشدی پاشا شروانی زادہ جو کسی زمانہ میں حجاز کے والی تھے، ان کا وقف کیا ہوا ہے، باب ام ہانی کے پاس سڑک کے رخ ایک چھوٹا سا کمرہ حرم سے ملا کر بنایا گیا ہے، اس کی کھڑکیاں حرم کی سمت میں کھلتی ہیں، یہ نہایت چھوٹا کتب خانہ ہے، چند سو کتابیں ہوں گی، جو زیادہ تر مطبوعہ ہیں، کچھ قلمی بھی ہیں، عربی کے علاوہ ترکی، فارسی، اردو کی بھی کچھ کتابیں اس میں موجود ہیں، فارسی کتابوں میں ایک بہاری مہاجر عالم کے قلم سے مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات کا ایک نسخہ نظر آیا، عربی کتابوں کی فہرست پوری دیکھی، حدیث اور علوم القرآن کے متعلق بعض رسائل کے نام اس میں ملے، بالفعل اس کتب خانہ کو ایک ریڈنگ روم بنا دیا گیا ہے جس میں اخبارات و رسائل آتے ہیں، اور لوگ تمام کو انکو پڑھنے جاتے ہیں،

مکہ معظمہ کے چار غیر سرکاری کتب خانوں میں سے تین ہندوستان کے شرمندۂ احسان ہیں، ایک مدرسہ صولتیہ کا کتب خانہ ہے، اس کتب خانہ کی صرف فہرست میں نے دیکھی، مطبوعہ اور قلمی کتابوں کا خاصا مجموعہ ہے، زیادہ تر ہندوستان اور مصر کی مطبوعہ کتابیں ہیں، کچھ یورپ کے مطبوعات ہیں، درسی کتابیں زیادہ ہیں، جو ایک مدرسہ کے مناسب حال ہیں، اس فہرست میں کوئی نادر کتاب نظر سے نہیں گذری،

دوسرے کتب خانہ کا نام شیخیہ ہے، یہ ایک ہندوستانی عالم کی ذاتی ملکیت ہے، کتب خانہ جا کر نہیں دیکھا، موصوف نے کتب خانہ کی فہرست میرے پاس بھجوا دی تھی، جس کو میں نے شروع سے آخر تک مطالعہ کیا، مطبوعات کا مجموعہ ہے، کچھ قلمی کتابیں بھی ہیں، جن میں مکہ معظمہ کی دو تاریخیں قابل تذکرہ ہیں، العقد الثمین فی تاریخ علماء البلد الامین جو علامہ فاسی المتوفی ۸۳۲ھ کی تصنیف ہے، اور جس میں مکہ معظمہ کے علما، حکام، قضاۃ،

اور رجال کے حالات ہیں، دوسری کتاب شفاء الغرام فی اخبار البلد الحرام ہے، اسی مصنف
کی ہے، اور جس میں شہر مکہ معظمہ کی تاریخ ہے،

تیسرا کتب خانہ بیت دہلوی کی ملکیت ہے، اور جس کو ہمارے دوست اور کرم فرما
مولانا عبدالوہاب صاحب نے اپنے شوق سے جمع کیا ہے، یہ علم کے شائق اور نوادر کتب
کے عاشق ہیں اور خود بھی علم وآگاہی رکھتے ہیں، اور مجھے مسرت ہے کہ میرے اور موصوف
کے درمیان پہلے ہی سے تعلقات غائبانہ خط وکتابت سے قائم تھے، اب یہ "شنیدہ دیدہ"
ہوکر اور بھی زیادہ مستحکم ہوگئے، یہ کتب خانہ ابھی اپنے نوجوان اور فاضل مالک کے زیر سایہ
نشو ونما پارہا ہے، اس کتب خانہ میں متعدد نادر کتابیں ہیں، ازانجملہ امام حمیدی کی الجمع بین
الصحیحین کی، جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے، دوسری جلد ہے، میری نگاہ میں شیخ نصیف کے کتب خانہ
میں اس کی پہلی جلد اور اس میں دوسری جلد ایک ہی نسخہ کی دو متفرق جلدیں ہیں، عجب نہیں
کہ دونوں صاحب ایک ایک جلد دوسرے سے نقل کراکر اپنا اپنا نسخہ مکمل کرالیں، اسی
موضوع پر امام اشبیلی کی اسی نام کی الجمع بین الصحیحین کی پہلی جلد ہے، حمیدی نے مسند کے طریق
پر جمع کیا ہے، اور اشبیلی نے فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے،

امام ابن جوزی نے جامع المسانید کے نام سے تمام مسند حدیثیں یکجا کی تھیں، حاجی خلیفہ
نے اس کا نام جامع المسانید والالقاب لکھا ہے، اور لکھا ہے کہ "یہ بہت بڑی کتاب ہے"
اس کتب خانہ میں اس کتاب کی چوتھی جلد ہے،

فن سیرۃ میں زرقانی کے بعد حافظ سیوطی کے شاگرد شیخ محمد بن یوسف دمشقی صالحی شامی

کی تصنیف سبل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد سب سے مبسوط کتاب ہے، مصنف نے
مقدمہ میں لکھا ہے کہ تین سو کتابوں سے اس نے یہ کتاب تالیف کی ہے، سات سو کے
قریب اس میں ابواب ہیں، شروع میں مصنف نے پوری فہرست دیدی ہے، غالباً یہ
۸ جلدوں میں تمام ہوئی ہے، اس کتب خانہ میں یہ کتاب تمام وکمال موجود ہے، حاجی خلیفہ نے
اس کے ذکر میں لکھا ہے کہ "متاخرین کی تصانیف میں یہ کتاب سب سے بہتر اور سب سے مبسوط ہے"،
مولانا شبلی مرحوم، سیرت کی تصنیف کے زمانہ میں اس کے جویا تھے، اور خیال آتا ہے کہ
وہ فرماتے تھے کہ اس کے بعض اجزا حیدرآباد کے کسی کتب خانہ میں ہیں، میں نے یہ کتاب
جابجا سے دیکھی، شاگرد میں اپنے استاد کا پورا پرتو پایا یعنی شامی بھی اپنے استاد سیوطی
کی طرح حاطب اللیل ہیں، اور ہر قسم کی روایتیں اس میں جمع کردی ہیں، سیرۃ شامی
کے نام سے یہ کتاب مشہور ہے، حلبی کی سیرت جو چھپ کر متداول ہو چکی ہے، وہ
عیون الاثر لابن سید الناس اور اسی کتاب کی تلخیص ہے۔

جو تھا ذاتی کتبخانہ قازان کے عالم ملا مراد کا ہے، مجھے رات کے وقت اسکے سرسری دیکھنے کا موقع ملا۔

مدینہ منورہ کو اللہ تعالیٰ نے جو فضیلتیں عطا کی ہیں، اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ
یہاں ابتک نوادر کتب کا انبار پڑا ہے، اور یہ سب کے سب ترکوں کے علمی فیض وجود
کی یادگاریں ہیں، جنگ عظیم کے زمانہ میں ترکوں نے عرب میں اپنا جنگی مرکز مدینہ منورہ
کو بنایا تھا، شریف حسین نے جب بغاوت کی اور عرب کی حالت متزلزل نظر آئی تو
ترکوں نے حجرۂ مطہرہ میں جو یادگار تحفے اور شہر کے کتب خانوں میں جو نادر کتابیں تھیں

وہ شام منتقل کر دیں، اتفاق سے شام بھی ہاتھ سے نکلنے لگا تو حجرۂ مطہرہ کی یادگاریں اور ان نادر کتابوں میں سے بھی نادر کتابیں چھانٹ کر قسطنطنیہ بھجوا دی گئیں، باقی کتابیں وہیں پڑی رہیں، اسو اتفاق سے اسی اثنا میں سیلاب آیا جسکا اثر اس مکان میں بھی پہنچا، جس میں یہ کتابیں پڑی تھیں، چنانچہ مدینہ کے کتب خانوں میں سے سیدنا عثمان کے کتب خانہ کو اس سے زیادہ نقصان پہنچا، عرب اور شام کے تسلط کے بعد جب فیصل شام کے بادشاہ تھے، اور امیر علی مدینہ کے حاکم مقرر ہوئے تو کتب خانہ والوں نے امیر علی سے کہہ سن کر شام سے کتابیں واپس منگائیں، اس خرابی بصرہ کے بعد جو کتابیں بچ گئی ہیں وہی اب مدینہ منورہ کی علمی بزم کی رونق اور زینت ہیں۔

گذشتہ لڑائی میں امیر علی نے حفاظت کی غرض سے شہر کے کتب خانوں کی کل کتابیں عارف حکمت بے شیخ الاسلام کے کتب خانہ ہیں وہیں کے ناظر ابراہیم حمدی بے کی نگرانی میں یکجا کر دی تھیں، حمدی بے ایک نہایت بیدار، محتاط اور کام کرنے والے ترکی عالم ہیں، انھوں نے ہر کتب خانہ کی کتابیں گن گن کر علیحدہ رکھوائیں، اور ہر ایک کی علیحدہ فہرست بنائی، اور امن وامان کے بعد ہر ایک سے واپسی کے دستخط لے کر ہر کتب خانہ کے متولی کو کتابیں فہرست کے مطابق واپس کر دیں، اسی محنت اور دلچسپی کو دیکھکر اس عہد حکومت میں ان کو مدینہ کے تمام کتب خانوں کا نگراں مقرر کر دیا گیا ہے، اس کتب شماری اور فہرست سے ہم کو بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ کے ان کتب خانوں کی کتابوں کا حال بھی معلوم ہو گیا جن کو ہم نے جا کر خود نہیں دیکھا، حمدی بے کی تحقیق اور شمار کے مطابق اس وقت چھوٹے بڑے ذاتی اور موقوفہ مدینہ میں چودہ[۱۴] کتب خانے ہیں، اور ہر ایک کی کتابوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

نام	تعداد کتب
۱۔ کتب خانہ روضۂ مطہرہ	۱۳۳۲
۲۔ کتب خانہ امین پاشا	۱۱۴۵
۳۔ کتب خانہ مدرسۃ الشفا	۱۴۷۲
۴۔ کتب خانہ شیخ محمد معصوم	۳۷۵۰
۵۔ کتب خانہ حسین آغا (قریب بقیع)	نامعلوم
۶۔ کتب خانہ مدرسہ قرہ باش	۱۵۵۹
۷۔ کتب خانہ محمودیہ (سلطان محمود)	۵۲۱۰
۸۔ کتب خانہ عرفانیہ	۱۲۷۴
۹۔ کتب خانہ سیدنا عثمان	۱۴۵۷
۱۰۔ کتب خانہ شیخ وزیر تونسی (دارالضیافہ)	تقریباً ۳۰۰
۱۱۔ کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت بے	۱۷۰۰۰
۱۲۔ کتب خانہ ساز کزلی	۸۳۲
۱۳۔ کتب خانہ مدرسہ ازبک	۷۳۲
۱۴۔ کتب خانۂ ثروت	۵۱۴

بعض اور مقامات بھی ہیں جہاں موقوفہ کتابیں ہیں، لیکن ان کی تعداد ۵۰۰ یا ۵۰۰ سے کم ہے، مثلاً

۱۵۔ کتب خانۂ کیلی ناظر — تقریباً ۵۰۰

۱۶۔ کتب خانہ کہربا (متعلقہ محکمۂ برقیات یادگار سلطان عبد الحمید) ۱۱۱

۱۷۔ کتب خانہ عبد الحمید بخاری — ۱۳۲

۱۸۔ کتب خانۂ بہائیہ (بہاء الدین قازانی) — ۱۲۴

یہ سب موقوفہ کتب خانہ ہیں۔ ان کے علاوہ چند شخصی کتب خانے بھی ہیں، جو لوگوں کی ذاتی ملکیت ہیں:

نام	تعداد کتب
۱۔ کتب خانہ شیاطی (شیاط مصر کے ایک گاؤں کا نام ہے)	۲۵۰۰
۲۔ کتب خانۂ سادات مدینہ بخاری	تقریباً ۱۰۰۰
۳۔ کتب خانۂ جمال الدین	۱۰۰۰
۴۔ کتب خانۂ صافیہ	۱۰۰۰
۵۔ کتب خانہ حمدیہ (حمدی بے)	۱۰۰۰
۶۔ کتب خانۂ یوسف معصوم	۱۰۰۰

(معارف اکتوبر ۱۹۲۶ء)

(۲)

مکہ معظمہ کے کتب خانۂ حرم کی نایاب کتابوں کی کوئی فہرست منتخب کرنے کی فرصت نہ مل سکی کہ صبح سے شام تک موتمر کے جھمیلوں میں رہنا پڑتا تھا، ہر روز ارادہ کرتا تھا کہ آج نہیں تو کل یہ کام کر لوں گا، مگر ہر روز بروز دگر افتاد، آخر روانگی کا دن آگیا، اور یہ کام نہ ہو سکا، مجھے افسوس ہے لیکن الحمد للہ کہ مدینہ جا کر اس کی پوری تلافی ہو گئی،

مدینہ منورہ میں وسعت، انتظام، صفائی، باقاعدگی، حفاظت اور مختلف فنون کی کتابوں کی حیثیت سے شیخ الاسلام عارف حکمت بے کا کتب خانہ بے نظیر ہے، یہ کتب خانہ مسجد نبوی سے متصل باب جبرئیل کے قریب قبلہ کی سمت میں واقع ہے، کتبخانہ کی عمارت جس زمین پر بنائی گئی ہے، وہ مکان حضرت جعفر صادقؓ کا ہے، اسی سے متصل یعنی اس کے اور مسجد نبوی کے بیچ میں ایک مکان ہے جو اب سبیل ہے، اس پر دیار عشرہ مبشرہ لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات عشرہ مبشرہ کے گھر تھے، مگر یہ صحیح نہیں، یہ درحقیقت وہ مجلس تھی، جہاں حضرت عمرؓ صحابہ کو بلا کر مشورے کیا کرتے تھے، اسی کتب خانے کے بالمقابل حضرت ابو ایوب انصاریؓ کا وہ گھر ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے موقع پر مہمان اترے تھے،

کتب خانہ کی عمارت دو منزلہ ہے، مسجد نبوی کی سمت ایک وسیع کمرہ جو کتب خانہ کا اصل مقام ہے، اسی ایک کمرے میں تمام کتابیں ہیں، کتابیں لکڑی کی الماریوں میں ہیں،

الماریوں میں شیشے لگے ہیں، زمین پر قالین کا فرش ہے، بیچ میں ایک میز ہے، جس پر زمین کا ایک کرہ رکھا ہوا ہے۔ اسی کمرے کی دوسری سمت میں دو کمرے ایک دوسرے کے بازو میں ہیں، ان میں کتب خانہ کے ایک دو ملازم رہتے ہیں۔

کتب خانہ کے کمرہ کی باہر والی دیوار پر عربی، فارسی، ترکی کے مختلف قطعات اور ادعیات نہایت خوشخط وصلیوں پر لکھی ہوئی آویزاں ہیں، قدیم ترکی سلطنت، حجاز ریلوے اور مسجد نبوی کے نقشے بھی آویزاں ہیں، قطعات میں بعض قطعے خود شیخ الاسلام عارف حکمت بے کے طبع زاد ہیں، منجملہ ان عربی، فارسی اور ترکی منظومات کے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ان میں ایک اردو نعتیہ غزل بھی کاغذ پر خوشخط لکھی ہوئی، شیشہ میں جڑی ہوئی آویزاں تھی، نیچے اردو کے اس خوش نصیب شاعر کا نام دیکھ اور بھی تعجب ہوا، کہ یہ دکن کا ہندو نام اور اسلام دل صوفی شاعر مہاراجہ کشن پرشاد شاد (سابق مدار المہام دولت آصفیہ حیدرآباد دکن) تھے، مطلع اور مقطع یہ ہے:

یہی کہتے ہیں مدح خوانِ محمدؐ جو شانِ خدا ہے وہ شانِ محمدؐ
شفاعت تری شاد کیونکر نہ ہوگی کہ دل سے ہے تو مدح خوانِ محمدؐ

یہ پوری غزل میرے روزنامہ میں لکھی ہوئی ہے۔

کتب خانہ کے واقف عارف حکمت بے تیرہویں صدی کے مشہور ترک علماء میں تھے، مدینہ منورہ میں یہ قاضی ہو کر آئے تھے، ۱۲۷۰ھ میں اس کی بنیاد ڈالی،

انھوں نے یہ زمین خریدی، اس پر یہ مختصر سی مگر نہایت صاف اور نکھری ہوئی عمارت بنوائی،
کتابوں کے بڑے شائق اور عاشق تھے، اپنی جائداد اور دولت کا بڑا حصہ انھوں نے ان پر
صرف کیا، اور معقول ذخیرہ فراہم کیا تھا، یہ کتابیں اسی عمارت میں رکھیں، پھر مقدونیہ اور
ایشیائے کوچک میں اپنی جائداد اس کتب خانہ کی بقا و ترقی کے لیے وقف کی، اسی جائداد
کی آمدنی اس کتب خانہ پر صرف ہوتی تھی، بلقان کی لڑائی کے بعد مقدونیہ وغیرہ کی جائداد
ملکیت سے نکل گئی، پھر بھی ایشیائے کوچک کے منافع سے اب تک کام چل رہا تھا، عرب کی
علیحدگی کے بعد بھی ٹرکی کے صیغۂ اوقاف سے اس کی آمدنی برابر وصول ہوتی تھی، مگر اب
دو سال سے جب سے انگورہ کی حکومت نے صیغۂ اوقاف کو صیغۂ مال میں داخل کر دیا ہے
یہ آمدنی موقوف ہے، کتب خانہ میں اس وقت ایک ناظر اعلیٰ شیخ عبد القادر حوا، ہیں،
وہ اس وقت مدینہ منورہ میں نہ تھے، کہیں سیر و سیاحت میں ہیں، ان کے نیچے شیخ
ابراہیم حمدی خربوطی ہیں، یہی اس وقت اس کتب خانہ میں عملاً سب کام کر رہے ہیں،
ان کے نیچے عمر آفندی ہیں، یہ سب کے سب ترک ہیں، یا ترکی الاصل ہیں، مکان کی صفائی،
الماریوں کی ترتیب، فہرست کی خوش خطی، ہر چیز سے ترکی خوش سلیقگی ظاہر ہوتی ہے۔

اس کتب خانہ کا عربی حکومت سے نہ پہلے کوئی تعلق تھا، اور نہ اب ہے، دو سال
سے ٹرکی سے اس کی آمدنی بند ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ غیور ترک کس طرح فقر و فاقہ کے ساتھ
شب و روز اپنے فرائض میں مشغول ہیں، یہ کتب خانہ اس مرکز اسلام میں ترکوں کی
علمی قدردانی کی ایک زندہ یادگار ہے، انگورہ کی حکومت کو زیبا نہیں کہ اس یادگار
کو اپنے تغافل سے مٹنے دے، ہم نے ترکی کے مشیر سفارت محمود ندیم بے سے جدہ میں یہ
تحریک کی تھی، کہ وہ حکومت کو متوجہ کریں، کہ کتب خانہ کی آمدنی صیغۂ مال سے اس کو

بدستور ملتی رہے،

کتب خانہ میں عربی، فارسی، ترکی کی کتابیں ہیں، زیادہ تر حصہ عربی کتابوں کا ہے، جلدوں کی تعداد مجھے سترہ ہزار بتائی گئی، ہر کتاب عمدہ جلد بندھی ہوئی، صاف ستھری اور خوش خط ہے، اکثر کتابیں غیر مطبوعہ اور قلمی ہیں، اور مختلف علوم و فنون سے متعلق ہیں، اکثر کتابوں کی زیارت کی، اور پوری فہرست استیعاب کے ساتھ دیکھی، ہر علم و فن میں مجھکو نایاب کتابیں معلوم ہوئیں، اُن کے نام لکھ لیے۔

علوم القرآن

(۱) برہان القرآن لما فیہ من الحجۃ والبرہان للامام محمود بن حمزۃ الکرمانی (۲) البرہان الکاشف عن اعجاز القرآن للامام عبد الواحد بن الخطیب زملکانی (۳) تاویلات القرآن فی بیان اصول السنۃ واصول التوحید للامام ابی منصور الماتریدی جمع الشیخ علاء الدین محمد بن احمد السمرقندی (۴) التعریف والاعلام فیما ابہم فی القرآن من الاسماء والاعلام للشیخ عبد الرحمن بن الخطیب عبد اللہ الخثعمی السہیلی (۵) الجامع لاحکام القرآن للامام قرطبی (قرآن پاک کی جمع و ترتیب کی تاریخ اور اس کے فضائل اور وجوہ اعجاز اور احکام فقہی پر مختصر بحث) (۶) الدر المصون فی علوم الکتاب المکنون للشیخ شہاب الدین احمد بن یوسف المعروف بالسمین (کشاف کی طرز کی ایک بے مثل ادبی و نحوی لغوی تفسیر، جو میرے نزدیک بعض وجوہ سے زمخشری کی کشاف سے بہتر ہے) (۷) رسالہ فی اعجاز القرآن للعلامہ قاسم بن فیرہ الشاطبی (۸) رسالہ فی اعجاز القرآن للامام المطرزی (۹) قید الاوابد من الفوائد والعوائد و الزوائد مما یتعلق بالقرآن المجید للعلامہ عبد الملک بن حسین العصامی (مصنف کے ہاتھ کا)

(۱۰) القول الصحیح فی تعیین الذبیح لتقی الدین السبکی (۱۱) مشکل اعراب القرآن و ذکر علله وصعبه ونادره للشیخ محمد مکی بن ابی طالب حموش الاندلسی النحوی (۵۹۰ھ کا لکھا ہوا نسخہ) (۱۲) مشکلات القرآن لمحمد بن عبد التوقانی (مصنف کے ہاتھ کا ۶۶۶ھ کا لکھا ہوا نسخہ) (۱۳) معانی الآیات المتشابہات الی الآیات المحکمات للشیخ ابی عبداللہ محمد شمس الدین المعروف بابن النبا، (ابن اللبان المصری کی ایک کتاب حافظ وہبہ نے اس موضوع پر قسطنطنیہ سے شائع کی تھی) (۱۴) ملاک التاویل بذوی الالحاد والتعطیل (۱۵) الناسخ والمنسوخ للشیخ ہبۃ اللہ ابن سلامہ بن علی المقری النحوی (۱۶) نفائس المرجان فی جمع قصص القرآن للعلامہ صفی الدین الموصلی (۱۷) مجموعہ کلام الشافعی فی احکام القرآن للامام ابی بکر البیہقی (۱۸) مختصر من کلام المقعد المقیم فی علوم القرآن للامام ابن الجوزی۔

۲۔ کتبِ حدیث

۱۹۔ تسہیل السبیل الی کشف الالباس عما دار من الاحادیث بین الناس للعلامہ محمد عز س الدین الخلیلی المدنی (۲۰) تصحیح عمدۃ الاحکام عن سید الانام للامام تقی الدین عبد الغنی المقدسی الحنبلی للشیخ بدر الدین محمد الزرکشی (۲۱) تصحیفات المحدثین للحافظ ابی احمد الحسن بن عبد اللہ العسکری (۲۲) تنزیہ الشریعۃ المرفوعۃ عن الاخبار الشنیعہ الموضوعہ للشیخ علی بن محمد بن عراق الکنانی (۲۳) تنویر الحوالک علی موطا امام مالک للسیوطی (۲۴) الجمع بین الصحیحین للحمیدی (۲۵) جمع الفوائد ومجمع الزوائد من جامع الاصول للامام محمد بن سلیمان المغربی (الجزء الاول الی الغزوات) (۲۶) الدیباج علی صحیح مسلم بن الحجاج للسیوطی،

(۲۷) فتح المتعال فی مدح النعال للحافظ احمد بن محمد المقری التلمسانی (۲۸) فضل الخیل للامام شرف الدین عبد المومن الدمیاطی (۲۹) کتاب الزہد الکبیر للامام ابی بکر احمد بن الحسین البیہقی (۶۲۶ھ کا نسخہ) (۳۰) کتاب الیقین لابی بکر عبداللہ بن محمد بن ابی الدنیا القرشی (۳۱) الکواکب الدراری فی شرح صحیح البخاری للکرمانی (۳۲) مسند الفردوس للحافظ زین الدین شہردار بن شیرویہ الدیلمی (۳۳) مصباح الزجاجہ علی سنن ابن ماجہ للسیوطی (۳۴) معجم حافظ احمد بن محمد الاصفہانی السلفی (۳۵) ملخص موطا الامام مالک للعلامہ ابی الحسن علی ابن محمد بن خلف القابسی المعافری (۳۶) ما ورد فی حیات الانبیاء وبعد وفاتہم علیہم السلام لابی بکر البیہقی (۳۷) نجاح القاری فی شرح صحیح البخاری لمحمد یوسف زادہ (۳۸) وسیلۃ الطالب الی نیل المطالب للعلامہ یحییٰ بن ابی بکر الحنفی۔

۳۔ توحید و عقائد

(۳۹) الارشاد فی عقائد اہل السنۃ من العباد للامام الحرمین (۴۰) اسرار التنزیل وانوار التاویل للرازی (۴۱) انوار القوامیہ فی الاسرار الکلامیہ للرازی (۴۲) اثبات عذاب القبر لابی بکر البیہقی (۴۳) التنبیہ علی الاسباب التی اوجبت الاختلاف بین المسلمین فی آرائہم و مذاہبہم لابی محمد عبداللہ بن السید البطلیوسی (۴۴) الفریدۃ الشمسیہ للعلامۃ الآمدی (۴۵) التجرید فی کلمۃ التوحید للامام احمد الغزالی (۴۶) رسالۃ فی علم اللہ تعالےٰ للآمدی (۴ ورق) (۴۷) رسالہ فی علم التوحید للامام محمد بن حسن بن فورک (۲۱ ورق) (۴۸) شرح عقیدۃ الامام الطحاوی للعلامہ عمر بن اسحاق الہندی (۷۴۶ھ کا نسخہ) ہندوستان کے لیے یہ قابل فخر اور قدیم یادگار چیز ہوگی۔

(۴۹) شرح عقیدۃ الامام ابی منصور الماتریدی للسبکی (۲۱ ورق)

۴- کتب مغازی وسیر

(۵۰) الفیۃ السیر النبویہ للحافظ عبدالرحیم العراقی (۵۱) خیر البشر بخیر البشر للشیخ محمد بن ظفر الصقلی (مصنف صقلی کا باشندہ تھا) (۵۲) سبل الہدیٰ والرشاد فی سیر خیر العباد واعلام نبوتہ واحوالہ فی المبدء والمعاد للعلامہ یوسف الدمشقی الصالحی جزء ۳، ۴ (۵۳) عیون الاثر فی فنون المغازی والسیر لابن سید الناس (۵۴) نور النبراس علی سیرۃ ابن سید الناس للعلامہ برہان الدین ابراہیم بن محمد بن خلیل سبط ابی العجمی۔

۵- اصول حدیث ورجال ومتعلقات حدیث

(۵۵) معرفۃ علوم الحدیث للامام محمد بن عبداللہ الحاکم النیسابوری (۵۶) التقصی فی معرفۃ شیوخ الامام مالک لابن عبدالبر (۵۷) اختصار علوم الحدیث للحافظ عماد الدین ابن کثیر (۵۸) ذکر اسماء من اتفق البخاری ومسلم علی تخریج الروایۃ عنہ من الصحابۃ للحافظ ابی الفتح محمد بن ابی الفوارس (۵۹) شواہد التوضیح والتصحیح لمشکلات الجامع الصحیح للحافظ ابی عبداللہ بن مالک الطائی (۶۰) منتخب الاسماء والانساب والکنی والالقاب للحافظ الذہبی (۶۱) مقدمۃ الکاشف المصطلح عن حقائق السنن للامام الطیبی (۶۲) النکت علی ابن الصلاح لبدرالدین الزرکشی (۶۳) الہدایۃ والارشاد فی معرفۃ الثقۃ والسداد الذین اخرج لہم البخاری فی جامعہ للشیخ احمد الکلاباذی (۶۴) معجم شیوخ البخاری ومسلم وابی داؤد والترمذی والنسائی والقزوینی (۶۵) التقریب والتیسیر لمعرفۃ سنن البشیر النذیر للامام النووی۔

۶۔ تاریخ واخبار

(۶۶) انباء الغمر بانباء العمر للحافظ ابن حجر العسقلانی (۶۷) انباء نجباء الابناء لمحمد بن ظفر الصقلی (مصنف سسلی کا باشندہ تھا) (۶۸) اخبار المستفید باخبار خالد بن ولید شیخ الاسلام رضی الدین بن محمد حنبلی، (۶۹) البدر الطالع من الضوء اللامع لاہل القرآن التاسع لاحمد بن محمد بن عبد السلام تلمیذ امام سخاوی (۷۰) تاریخ ابی الحارث ایبک من ملوک الہند لحسن نظامی نیشاپوری (اس میں ابو المظفر محمد بن سام کا ذکر ہے) (۷۱) تاریخ مدینۃ اصفہان للحافظ احمد بن عبد اللہ الاصبہانی (۷۲) تاریخ جزری لشمس الدین محمد الجزری (۷۳) تاریخ امام بقاعی (۸۵۵ھ سے ۸۷۰ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے) (۷۴) تاریخ سلاطین گجرات از سلطنت ظفر خاں تا سلطنت محمود خاں (۷۵) تحفۃ الکبار فی اسفار البحار حاجی خلیفہ چلپی (ترکوں کے بحری فتوحات کی تاریخ) (۷۶) تفریج الہموم وتغریب الغموم فی الرحلۃ الی بلاد الروم لمصطفیٰ بن کمال الدین البکیری الخلوتی (۱۱۳۵ھ کا سفرنامہ ہے) (۷۷) التعریف بما انست الہجرۃ من معالم دار الہجرۃ للمطری (مدینہ منورہ کی مستند تاریخ) (۷۸) تاریخ دولۃ الاکراد والایوبیہ (۷۹) تیمور نامۂ ہاتفی (۸۰) رحلۃ العلامہ عیاشی لابی سالم عبد اللہ بن ابی بکر العاشی المغربی (۱۰۵۹ھ کا سفرنامہ مراکش سے عرب تک) (۸۱) رسالہ فی من نسب الی امہ من الشعراء لمحمد بن حبیب بروایۃ عثمان بن جنی (۸۲) کتاب الاصنام لابی المنذر ہشام بن محمد الکلبی (طبع کے بعد بھی نہیں ملتی) (۸۳) الزبد والضرب فی تاریخ حلب لمحمد بن ابراہیم بن الحنبلی الحنفی (۸۴) رسالۃ ایمان العرب لابی اسحاق ابراہیم بن عبد اللہ النجیرمی (یہ رسالہ اب مطبع سلفیہ مصر میں چھپ گیا ہے)

(۸۵) سفارت نامہ چین (سلطان سلیم بن بایزید کے عہد حکومت میں فارسی میں لکھی گئی) (۸۶) سکردان السلطان لابی العباس احمد بن یحییٰ التلمسانی الشہیر بابن ابی عجلۃ الدمشقی (۸۷) سیاحت نامہ للعلامہ محمد خلیل بن محمد السرہندی الاحمدی الفاروقی (فارسی میں اس ہندوستانی عالم نے بانی کتب خانہ احمد عارف بے کے لیے لکھی، اس میں لاہور اور کل پنجاب کا مختصر حال ہے)

(۸۸) سیر البلاد لخادم العظیم آبادی (پٹنہ کے ایک عالم امام بخش خادم نے ۱۲۴۵ھ میں ایران، عراق و جزائر عرب کا سفر نامہ لکھا۔ اس میں مولف کے اردو کلام کا نمونہ بھی ہے)

(۸۹) سیر الملوک منسوب بہ نظام الملک وزیر سلجوق (۹۰) سنی الوفاۃ من بدء الہجرۃ الی آخر القرن العاشر لابی الفلاح عبد الحی بن احمد بن محمد العکبری الصالحی المعروف بابن العماد الحنبلی (۹۱) شذرات الذہب فی اخبار من ذہب فی التراجم

(۹۲) شفاء الغرام باخبار البلد الحرام لتقی الدین محمد بن احمد بن علی الحسینی الفاسی المکی

(۹۳) صفوۃ الزمان فی من تولی علی مصر من امیر و سلطان للعلامہ مصطفی الصفدی الغلاطری الشافعی

(۹۴) ضوء القبس فی مناقب ابی حنیفۃ والشافعی و احمد و مالک بن انس (۹۵) الطالع السعید الجامع لاسماء نجباء الصعید لابی الفضل جعفر بن ثعلب الادفوی (۹۶) طبقات الحکماء لمحمد بن الخطیب الزوزنی (۹۷) طبقات الشافعیۃ الصغریٰ للسبکی

(۹۸) طبقات الشافعیہ لابن قاضی شہبۃ الاسدی (۹۹) طبقات الشافعیہ لابی الحسن الاسنوی

(۱۰۰) طبقات الشعراء لمحمد بن سلام الجمحی (شعرائے عرب کے حال میں سب سے پہلی کتاب یورپ میں چھپ چکی ہے اور اب مصر میں بھی چھپ گئی ہے، مگر یہ نسخہ بہت پرانا اور لائق اعتماد ہے)

(۱۰۱) طبقات القراء للقاسم بن فیرۃ الشاطبی (۱۰۲) طبقات المفسرین لہٗ

(۱۰۳) طبقات المحدثین و طبقات علماء الوضع و طبقات المورخین و طبقات علماء الاصول (چند اوراق میں مختصر سا رسالہ)

(۱۰۴) ظفرنامہ فی وقائع امیر تیمور (فارسی) (۱۰۵) عجائب المخلوقات وغرائب الموجودات واخبار الامم الماضیہ والقرون الخالیہ عمر بن احمد الشہیر والدہ بالصفدی نقلہ من الکتب۔ (۱۰۶) العقد المذہب فی طبقات حملۃ المذہب لابی حفص عمر بن علی الاندلسی الشہیر بابن الملقن المصری (۱۰۷) عقود الجمان وتذییل وفیات الاعیان لابن خلکان للامام الزرکشی (۱۰۸) فتوح مصر لمحمد بن اسحاق الاموی (۱۰۹) الفہرست لابن الندیم (یورپ میں چھپ چکی ہے، مگر رجوع واعتماد کے لیے اس کا ذکر کردیا ہے) (۱۱۰) القبس الحاوی لغرر ضوء السخاوی (مختصر الضوء اللامع) لزین الدین عمر بن احمد الاثری الحلبی (۱۱۱) قرۃ العیون فی اخبار الیمن المیمون لعبدالرحمن بن علی الشیبانی الشہیر بابن الربیع الزبیدی (۱۱۲) قلائد عقود الدرر والعقیان فی مناقب الامام ابی حنیفۃ النعمان لابی القاسم بن عبدالعلیم الحنفی الیمنی (۱۱۳) کفایۃ المحتاج لمعرفۃ من لیس فی الدیباج لاحمد بابا بن احمد التنبکتی (۱۱۴) الکواکب السائرہ بمناقب اعیان المأۃ العاشرہ لنجم الدین محمد بن بدر الدین الغزی العامری القرشی الدمشقی (۱۱۵) الکواکب الدریہ فی السیرۃ النوریہ (سلطان نورالدین شہید کی سوانح عمری) (۱۱۶) کتاب اسماء الصحابہ لابی حاتم محمد بن حیان (۱۱۷) کتاب الزیارات لابی بکر بن علی الہروی (مصنف نے جن مقامات کی زیارت کی اُن کا حال) (۱۱۸) اللباب فی معرفۃ الانساب لابن اثیر الشیبانی (سمعانی کا خلاصہ) (۱۱۹) لالہ استان فی تراجم المشائخ للعلامہ البہاری؟ (۱۲۰) لب التواریخ (فارسی) للامیر یحییٰ بن عبداللطیف القزوینی (۱۲۱) مجموعہ تواریخ ملوک الفرس لابی شجاع بن ملک شاہ (۱۲۲) مطلع السعدین ومجمع البحرین فی وقائع وحوادث سنۃ ۷۷۵ھ لکمال الدین عبدالرزاق بن جلال الدین السمرقندی (حزان) (۱۲۳) مختصر ریاض النفوس فی طبقات فقہاء مدینۃ القیروان وافریقیہ وما یلیہا الشیخ ابی بکر عبداللہ بن محمد المالکی للعلامہ یحییٰ بن ابراہیم المالکی۔

(۱۲۴) محذوات القصور فی تاریخ اہل العصور لابن القطری الہجری المصری (۱۲۵) المعجم فی آثار ملوک العجم لفضل اللہ بن عبد اللہ (۱۲۶) الذیل علی الروضتین فی اخبار الدولتین لابی محمد عبد الرحمن ابن اسمٰعیل الشہیر بابی شامہ المقدسی (۱۲۷) مرآۃ الممالک للسید علی کاتبی رومی (سفر نامہ) (۱۲۸) المستفاد من فعالات الاجواد لابی محسن بن علی التنوخی (۱۲۹) المرقاۃ الوفیہ فی طبقات الحنفیہ للمجد الفیروز آبادی (۱۳۰) معجم المشائخ للسید مرتضیٰ زبیدی (بلگرامی) بخط مؤلف (۱۳۱) مناقب الامام الاعظم لمحمد بن محمد الکردری (۱۳۲) منتخب لدرر الکامنہ للحافظ السیوطی۔ (۱۳۳) منتخب طبقات الشافعیہ لابن الصلاح لابی زکریا یحییٰ بن شرف النحوی (۱۳۴) المنتخب من "المؤتلف والمختلف فی اسماء الشعراء والقابہم للشیخ الآمدی" لابراہیم احمدی۔ (۱۳۵) نزہۃ المشتاق فی علماء العراق لابی البرکات محمد الرحبی (۱۳۶) ہفت اقلیم امین رازی (۱۳۷) ہفت کشور فخر الدین بن امیری الہروی (۱۳۸) وصایائے نظام الملک الوزیر

۶۔ کتبِ ادب و دواوین

(۱۳۹) اجوبہ عن الاعتراضات فی شرح شعر المعری لابی محمد عبد اللہ بن السید البطلیوسی (۱۴۰) الایضاح شرح مقامات الحریری لابی الفتح ناصر بن ابی المکارم عبد اللہ المغازی (۱۴۱) الاحتیال بما فی شعر ابی العتاہیۃ من الامثال للشیخ یوسف بن عبد اللہ النمیری القرطبی ابن عبد البر۔ (۱۴۲) تسلیۃ الفواد فی قصائد آزاد بلگرامی (۱۴۳) التشبیہات لابی اسحاق البغدادی المکی (کس چیز کو کس چیز سے تشبیہ دیجاتی ہے) ۶۶۳ھ کا نسخہ (۱۴۴) ترجمۃ المتنبی لابی منصور الثعالبی (۱۴۵) الندلی فی التلی لہ (۱۴۶) التحسین والتقبیح لہ (۱۴۷) جزء فیما وجد من کلام ابن الخشاب ستدراکاً علی الحریری فی مقاماتہ للشیخ عبد اللہ احمد بن الخشاب البغدادی۔

(۱۴۸) جملۃ من شرح المفضلیات (۱۴۹) حدائق السحر فی دقائق الشعر لرشید الدین الوطواط (فارسی)
(۱۵۰) دمیۃ القصر وعصرۃ اہل العصر لعلی بن الحسن الباخرزی (۱۵۱) الدیوان الثامن لآزاد بلگرامی
(سات دیوان ہندوستان میں ہیں) (۱۵۲) دیباجہ شرح الحماسہ لاحمد المرزوقی الاصبہانی
(۱۵۳) رسالۃ الصاحب بن عباد فی مساوی شعر المتنبی (۱۵۴) رسالۃ وقصائد لابی
عثمان الجاحظ (۱۵۵) شرح ارجوزۃ ابی نواس لابی الفتح عثمان بن جنی (۱۵۶) شرح
دیوان ابی تمام لابی بکر محمد بن یحییٰ الصولی (۱۵۷) شرح دیوان ابی فراس الحمدانی
(۱۵۸) الشرح المختصر علی الحماسہ للخطیب التبریزی (۱۵۹) شرح دیوان رؤبۃ بن العجاج
(۱۶۰) شرح دیوان زہیر احمد بن یحییٰ بن زید ثعلب النحوی (۱۶۱) شرح دیوان المتنبی لابی
العباس احمد بن علی بن یعقوب الازدی المہلبی (۱۶۲) شرح مختارات المتنبی کلاہما للمعری
المسمی باعجاز احمد (۱۶۳) شرح المعلقات السبع لابی جعفر احمد بن محمد بن اسمٰعیل المعروف
بابن النحاس (۱۶۴) شرح المعلقات السبع للخطیب التبریزی (۱۶۵) شرح مقامات
الحریری لابی البقاء العکبری (۱۶۶) شرح مقصورۃ ابن درید لمحمد بن احمد السبتی المعروف
بابن ہشام اللخمی (۱۶۷) شرح بعض دیوان ابی فراس الحمدانی لابن خالویہ (۱۶۸)
ضرام السقط فی شرح سقط الزند للقاسم بن الحسین الخوارزمی صدر الافاضل (۱۶۹)
عنوان المرقصات والمطربات لنور الدین علی بن موسیٰ الوزیر الغرناطی الاندلسی (۱۷۰)
فرائد الخرائد فی الامثال والحکم لابی یعقوب یوسف بن طاہر النحوی تلمیذ المیدانی بخط
کاتب اسنادہ (۱۷۱) الفلک الدائر علی المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر لابی المعالی
القاسم بن ہبۃ اللہ المعروف بابی حدید المدائنی (۱۷۲) کتاب الخیل لابی عبیدۃ معمر بن المثنی
التیمی نہایت عتیق نسخہ (۱۷۳) کتاب المبہج فی اسماء شعراء الحماسہ لابی الفتح عثمان بن جنی (اس میں

شعراء کے حالات نہیں، بلکہ شعرائے حماسہ کے ناموں کے اشتقاقات اور معانی لکھے ہیں)

(۱۷۴) الملتقط من المتنبی لابی الحسن الواحدی ملائم محمود بن عمر الزمخشری (۱۷۵) شرح لامیۃ العجم لابن الانباری (۱۷۶) مناظرات الوطواط مع الزمخشری (ایک ورق)

(۱۷۷) مختارات الحماسہ للشیخ محمد الحلبی (۱۷۸) مختارات المتنبی (۱۷۹) النجدیات الف بیت فی النسیب لمحمد بن ابی العباس احمد الابیوردی (۱۸۰) نزول الغیث وہو اعتراضات ومناقشات مع الصفدی فی شرحہ علی لامیۃ العجم للعلامہ بدر الدین محمد بن ابی بکر المخزومی الدمیاطی

(۱۸۱) نصرۃ الثائر علی المثل السائر للعلامہ صلاح الدین الصفدی (۱۸۲) امالی ہبۃ اللہ السجزی (جزآن)

کتب خانہ میں قدامت کے اعتبار سے جس کی تاریخ معلوم ہے، سب سے پرانی کتاب غالباً حضرت ابن عباسؓ کی روایات تفسیر جو تفسیر ابن عباسؓ کے نام سے چھپی ہوئی ملتی ہے ان کے آخری چند اوراق ہیں، یہ سورۂ فلق اور والناس وغیرہ آخری سورتیں ہیں، ختم پر اس کی کتابت کی تاریخ سہ شنبہ ۱۲ رجب ۳۱۶ھ مرقوم ہے، یہ ہرن کی کھال کے کاغذ پر لکھی ہوئی ہے، ہرن کی کھال کو اس قدر پتلا اور چکنا کیا گیا ہے کہ موٹا کاغذ معلوم ہوتا ہے، قرآن مجید کا ایک چھوٹی تقطیع کا نسخہ ہے جو پورا شتر مرغ کی کھال کے کاغذ پر ہے، ابتدائی اوراق ضائع ہوگئے ہیں، تو وہ ہرن کی کھال پر لکھ کر لگا دیے گئے ہیں، شتر مرغ کی کھال کا کاغذ نہایت باریک ہے، اس کا خط کوفی ہے، اور اعراب اور شاید نقطوں سے بھی خالی ہے، کسی نے بعد کو سیاہی سے اس پر اعراب اور نقطے لگا کر اس کی خوبی کو برباد کیا ہے، سال تاریخ اس پر نہیں ہے، مگر کسی نے پہلے صفحہ پر لکھ دیا ہے کہ بخط عثمان [illegible] یا نہ ہو، مگر اعراب اور نقطوں کے نہ ہونے کے سبب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعراب اور نقطوں کی ایجاد

کے پہلے لکھا گیا ہو، اعراب اور نقطے حجاج کے زمانہ سنہ میں لگائے گئے ہیں،

ابو ہلال عسکری کی کتاب الاوائل کا نسخہ ۳۹۵ھ کا لکھا ہوا ہے، ابن ابی عون اسحاق بغدادی کی کتاب التشبیہات ۳۲۲ھ کی ہے، اسی طرح محمد بن سلام الجمحی المتوفی ۲۳۱ھ کی طبقات الشعراء کا نسخہ بھی نہایت پرانا ہے،

یہ اس مضمون کا تیسرا نمبر ہے، شاید ناظرین محض کتابوں کے ناموں کو دیکھ دیکھکر گھبرا گئے ہوں، مگر انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے بزرگوں کا یہی اندوختہ ہے جو ان کے علمی کارناموں کی یادگار ہے، یورپ کے علمائے مستشرقین کی نگاہوں میں ان کی یہ وقعت ہے کہ وہ اس کا ایک ایک ورق سونے کے تول سے خریدتے ہیں، اور ہمارے اسلاف نے بھی ان سفینوں کو اپنے سینوں سے لگا کر رکھا تھا، اور اب ان ہی کے اخلاف کو یہ بھی خبر نہیں کہ یہ جواہر ریزے اب کہاں کہاں بکھرے ہیں اور ضرورت ہو تو کہاں سے دستیاب ہو سکتے ہیں، اسی مضمون میں کتابوں کے ناموں کی تفصیل سے یہی مقصود ہے کہ ہمارے علماء اور شائقین علم کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت ہماری مقدس سرزمین کے خزانہ میں کیا کیا نایاب گوہر ہیں،

شیخ الاسلام کے کتب خانے کے بعد دوسرا قابل ذکر کتبخانہ کتب خانہ محمودیہ ہے، سلطان محمود ثانی نے اپنے زمانۂ حکومت میں جو کارنامے انجام دیے اُن میں ایک قابل ذکر کارنامہ مدرسہ محمودیہ ہے، یہ مدرسہ مسجد نبوی سے متصل باب السلام کے راستہ میں داہنی طرف واقع ہے، یہ مسجد مبارک سے اس قدر ملا ہوا ہے کہ اس کے اوپر کے کمروں کی کھڑکیاں مسجد نبوی کے صحن میں کھلتی ہیں، ان کمروں میں بیٹھئے تو مسجد کا صحن بالکل نگاہ کے سامنے ہو جاتا ہے، اس کی دیوار اس سمت میں جس پر "خوخۃ ابی بکر رضی اللہ عنہ" (یعنی حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے مسجد نبوی میں آنے کا دروازہ جس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الموت

میں فرمایا تھا کہ "ابوبکر کی کھڑکی کے علاوہ سب کھڑکیوں کو بند کر دو" مسجد نبوی ہی کی آخری دیوار ہو گئی ہے۔

مدرسہ کے صدر دروازہ کے اوپر اب تک سپید پتھر میں کھدا ہوا یہ کتبہ لگا ہے:

"مدرسۃ الاجابلیۃ لحضرت سلطان محمود۔"

سلطان محمود نے اس کے لیے شام میں جائداد وقف کی تھی، جس کی آمدنی سالانہ حج کے موقع پر شامی محمل کے ساتھ اخیر اخیر تک آیا کرتی تھی، مگر اس بڑی جنگ کے بعد جب سے فرانس نے شام پر قبضہ کیا ہے، دوسرے اوقاف کے ساتھ یہ وقف بھی فرنچ دست برد میں ہے، مدرسہ بالکل ویران ہے، دو منزلہ عمارت تھی، طلبہ کے رہنے کے الگ کمرے تھے، درس کے الگ، مگر اب ایک طرف کی چھت گر گئی ہے، درس و تدریس کا سلسلہ بند ہے، اس کے موجودہ متولی زین العابدین قندیلی ہیں، قندیلی کے معنی یہ ہیں کہ ان کا خاندان مسجد نبوی کی قندیلوں کی نگرانی اور روشنی کا مہتمم تھا،

اس مدرسہ کے پھاٹک میں نے ہمیشہ بند پائے، قندیلی صاحب سے جب میں نے اس کے دیکھنے کا شوق ظاہر کیا، تو دوسرے دن اس کا وقت مقرر کیا، اندر گیا تو دیکھا کہ اس پر ایک ویرانی سی چھائی ہے، متولی صاحب نے اندر چند حاجیوں کو غالباً کرایہ پر جگہ دے رکھی ہے، اوپر کی منزل میں مسجد مبارک کی سمت کے کمرہ میں کتب خانہ تھا، کتب خانہ کھولا گیا، تو معلوم ہوا کہ شاید مدت سے یہاں کسی کا گذر بھی نہیں ہوا ہے، تمام گرد پڑی تھی، دیواروں سے لگی ہوئی الماریاں اور الماریوں میں بے ترتیب کتابیں رکھی ہوئی تھیں،

ٹرکی نے جنگ عظیم میں مدینہ منورہ کے جن کتب خانوں کو یہاں سے شام منتقل کر دیا تھا، ان میں سے ایک سا یہ بھی [illegible] یہاں کی کتابیں قسطنطنیہ میں [illegible]

خالی کیا، تو نادر کتابیں چن کر قسطنطنیہ منتقل کر دیں، اور بقیہ کتابیں وہیں پڑی رہیں، اسی اثنا میں وہاں نہر میں سیلاب آیا جس سے کتابوں کو نقصان پہنچا، ملک میں جب تسلط ہوا، اور شریف علی مدینہ کے امیر مقرر ہوئے تو متولیوں نے ان سے کہہ سنکر کتابیں واپس منگوائیں اسی طرح اس کتب خانہ کی کتابیں واپس آئیں، جن میں ایک صندوق ایسا ہے جس کی کتابیں سیلاب کے پانی سے اس طرح برباد ہوگئی ہیں کہ ورق سے ورق الگ نہیں ہو سکتا،

اس وقت اس کتب خانہ میں پانچ ہزار کے قریب کتابیں ہیں، جو الماریوں میں ترتیب سے فنوار رکھی ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ کتب خانہ کو کسی واقف کار نے ترتیب نہیں دیا ہے، اس لیے کہیں کی کتابیں کہیں رکھ دی گئی ہیں، بعض کتابیں تو تلاش کرنے پر ملیں بھی نہیں، قلمی کتابوں کے ساتھ مطبوعہ کتابیں بھی یہاں ہیں، کتابوں کی فہرست بھی ہے، جو کتابیں قسطنطنیہ چلی گئی ہیں، ان پر حرف "غ" یعنی غائب کا اشارہ بنا دیا گیا ہے۔

بہرحال یہ تو ظاہری حالت کا نقشہ ہے، کتابوں کو جب میں نے ہاتھ لگایا تو خوشی سے اچھل پڑا کہ حدیث و تفسیر کا اتنا نایاب ذخیرہ ابتک میری نگاہوں نے نہیں دیکھا تھا، بہت سی کتابیں جن کو صرف ایک نظر دیکھنے کی تمنا تھی وہ یہاں آج پوری ہوگئی، حسرت رہی کہ بہت سی کتابیں جن کا ایک ہی نسخہ یہاں تھا، وہاں قسطنطنیہ چلا گیا، یا اگر دو نسخے تھے تو کامل چلا گیا اور ناقص یہاں رہ گیا، کاش ترک اتنا ایثار کرتے کہ ان کتابوں کو مرکز اسلام پر دوبارہ جمع کر دیتے کہ تمام دنیائے اسلام ان سے متمتع ہو سکتی،

آج پہلا دن تھا کہ میری آنکھوں نے دلائل النبوۃ امام بیہقی، معرفۃ اصول الحدیث امام حاکم، شرح سنن ابی داؤد لابن ارسلان، شرح بخاری للکرمانی، شرح بخاری لابن بطال، تمہید شرح موطا

لابن عبدالبر، البیان لاحکام القرآن للموزعی الیمنی، زاد المسیر فی علم التفسیر لابن جوزی، تفسیر ابن ابی حاتم، نزہۃ المحکم، شرح صحیح مسلم وغیرہ کتابیں دیکھیں اور خدا کا شکر ادا کیا۔

ذیل میں ہم کتب خانہ محمودیہ کی نادر قلمی کتابوں کی منتخب فہرست درج کرتے ہیں، ان میں دو چار مطبوعہ کتابوں کے نام بھی ہیں، مگر ان کی ندرت اور کمیابی کی وجہ سے ذکر کر دیا ہے:

۱۔ تفسیر

۱۔ تفسیر خطیب شربینی ۲ جلد

۲۔ تفسیر امام عمر نسفی ۴ ،،

۳۔ تفسیر ابی الحسن البکری الصوفی

۴۔ تفسیر قرطبی

۵۔ تفسیر البیان لاحکام القرآن لجمال الدین محمد بن علی ابن الخطیب المعروف بابن نورالدین الموزعی الیمنی ۸۴۵ھ میں تالیف ہوئی۔

۶۔ تفسیر البقاعی ۵ جلد

۷۔ زاد المسیر فی علم التفسیر لابن الجوزی

۸۔ تفسیر ابن کثیر (چھپ چکی ہے)

۹۔ ابن حبان (چھپ چکی ہے)

۱۰۔ تفسیر الوسیط للواحدی النیسابوری

۱۱۔ کشف البیان للامام الثعلبی ۹ جلد

۱۲۔ تفسیر احکام القرآن للرازی الحنفی (چھپ گئی)

۱۳۔ تفسیر ابن ابی حاتم تیسری جلد

۱۴۔ تفسیر المنتخب من البیان فی اعراب القرآن لابن یعیش النحوی جزء اول

۱۵۔ تفسیر معنی القرآن لعلی الطبری

۱۶۔ تفسیر بکر بن سہیل الدمیاطی بسندہ عن ابن عباسؓ

۱۷۔ تفسیر الثمرات فی احکام القرآن کامل

۱۸۔ تفسیر ابن جریر طبری (چھپ چکی ہے)

۱۹۔ جواہر الدرر فی التفسیر بالخبر والاثر

۲۰۔ ذکر آیات القرآن المتشابہات لزکریا الانصاری

۲۱۔ تفسیر التبیان فی اعراب القرآن للعکبری

۲۔ متعلقاتِ تفسیر

۲۲۔ البرہان فی علوم القرآن للزرکشی

۲۳ - تفسیر مشکل القرآن

۲۴ - بدیع القرآن للشیخ زکی الدین ابن ابی اصبع

۲۵ - نواسخ القرآن لابن الجوزی

۲۶ - غرر البیان فی مبہمات القرآن

۲۷ - اعراب القرآن العظیم

۲۸ - تاویل مشکل القرآن

۲۹ - غریب القرآن للمرزوقی

۳۰ - التبیان فی آداب حملۃ القرآن للنووی

۳۱ - طیبۃ النشر فی القراءات العشر لابن الجزری

۳ - احادیث

۳۲ - شرح بخاری للکرمانی

۳۳ - التکملۃ شرح ترمذی للعراقی وہو تکملۃ علی الشرح الحافظ ابن سید الناس

۳۴ - حاشیۃ المسجد علی سنن الترمذی

۳۵ - شرح ترمذی للبغوی جزء ثانی

۳۶ - سنن کبیر للبیہقی

۳۷ - مختصر سنن کبیر للبیہقی بخط تلمیذ مصنف

۳۸ - شرح صحیح بخاری لابن بطال

۳۹ - شرح صحیح مسلم للقاضی عیاض

۴۰ - نزہۃ المحکم وبہجۃ المفہم شرح صحیح مسلم

۴۱ - المطالب العالیۃ بزوائد المسانید الثمانیۃ للعسقلانی

۴۲ - مسند ابی بکر بن ابی شیبہ

۴۳ - تخریج احادیث الشفا لعبد العزیز الزبیدی

۴۴ - شرح الشفا للدلجی

۴۵ - معتمد ذوی العقول مع جامع الاصول فی احادیث الرسول لابن بردلہ

۴۶ - مجمع الزوائد لنور الدین الہیثمی ۵ جلد

۴۷ - تمہید شرح موطا لابن عبد البر

۴۸ - تنویر الحوالک شرح موطا مالک للسیوطی

۴۹ - فتح الرحمن شرح موطا امام محمد

۵۰ - مصنف ابن ابی شیبہ ۲ جلدیں

۵۱ - الافصاح عن معانی الصحاح لابی ہبیرہ جلد ۱-۲-۳-۴

۵۲ - مستدرک حاکم جلد چھپ چکی

۵۳ - التالی من تلخیص المستدرک للذہبی

۵۴ - دلائل النبوۃ للبیہقی

۵۵ - الاستذکار لابن عبد البر

۵۶ - کتاب العمدہ للامام القشیری

۵۷ - عمدۃ الاحکام للمقدسی

۵۸ - کتاب الاطراف المعتلی باطراف مسند امام احمد للعسقلانی

٥٩- کتاب التقییدات

٦٠- مختصر متاع الاسنہ باحادیث اتفق علی تخریجہا الستۃ الائمۃ لیحیی بن محمد الکرمانی

٦١- معجم ابن عساکر

٦٢- کتاب الاباطیل والمناکر والصحاح والمشاہیر

٦٣- بدر التمام من احادیث سید الانام

(٦٤) الناسخ والمنسوخ من الحدیث

(٦٥) جواہر اللآلی لابی المعالی مع نزہۃ الخواطر فی ذکر الحفاظ والاکابر

٦٦- تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف

٦٧- موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان

٦٨- الغریب المصنف لابی عبید

٦٩- تنقیح المفہوم فی الحدیث

٧٠- دلائل النبوۃ لابی نعیم چھپا ہے مگر جا بجا سے ناقص ہے۔

٧١- التنقیح لالفاظ الجامع الصحیح لبدر الدین الزرکشی

٧٢- کتاب الام امام شافعی (چھپ چکی ہے)

٧٣- موضوعات ابن جوزی

٧٤- جزء من اطراف المزی

٧٥- شرح سنن ابی داؤد لابن رسلان

۴- اصول حدیث و رجال

٧٦- معرفۃ اصول الحدیث للحاکم

٧٧- کتاب النسبۃ الی المواضع والبلدان لجمال الدین

٧٨- تہذیب الاسماء واللغات نووی

٧٩- مختصر اسماء الضعفاء والواضعین لابن الجوزی

٨٠- الاکتساب من کتب الانساب مختصر السمعانی

٨١- مغانی الاخیار فی اسامی رجال معانی الآثار ا و ۳ للعینی

٨٢- الانساب للسمعانی (عکسی چھپی ہے)

٨٣- تہذیب الکمال للمزی جلد ۱ و ۳ و ۴ و ۵ و ۷ و ۹ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۳

٨٤- اسماء رجال مسند

٨٥- ثقات ابن حبان

٨٦- لب اللباب فی تحریر الانساب للمغیرا ماجاء فی جامع المسانید لابن الجوزی

٨٧- المؤتلف والمختلف للدارقطنی

٨٨- کشف النقاب عن جرح الی ... من الاصحاب

۵- تاریخ و سیر

۸۹- عیون الاثر فی فنون المغازی و الشمائل والسیر

۹۰- سبل الہدی والرشاد فی سیرۃ خیر العباد، جلد ۱و۳و۵و۶، ۸و۹

۹۱- الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنہ للعسقلانی ۲ جلد

۹۲- کتاب الہدی لابن القیم (زاد المعاد)

۹۳- السیرۃ لابن ہشام (چھپی ہوئی مگر پھر بھی نادر ہے)

۹۴- تاریخ مدینہ للسخاوی جزء ثالث

۹۵- تاریخ الخطیب جزء ۳۳

۹۶- تاریخ مکہ للازرقی (چھپی ہے)

۹۷- العسجد المسبوک والزبرجد المحکوک فی تاریخ دولۃ الاسلام والملوک

۹۸- تاریخ مدینۃ السلام جزء اول

۹۹- انساب الاشراف جزء

۱۰۰- طبقات وسطی للسبکی (کبری چھپی ہے)

۱۰۱- تلقیح ابن الجوزی

۱۰۲- طبقات المفسرین للامام شمس الدین الداودی

۱۰۳- مختصر الطبقات

۱۰۴- طبقات ابن سعد کی آخر جلد اور ایک ٹکڑا (چھپی ہے پھر بھی نادر ہے)

۱۰۵- طبقات الحنابلہ جزء ۴

۱۰۶- اعلام الاخیار من فقہاء مذہب النعمان المختار للکفوی

۱۰۷- کتاب الاعلام فیما یجب علی الانام من معرفۃ النبی علیہ السلام لابن الفرج القرطبی۔

کتب خانہ سیدنا عثمانؓ: یہ کتب خانہ حضرت عثمان ذی النورینؓ کے نام نامی کے ساتھ اس لیے منسوب ہے کہ یہ آپ کے مسکن مبارک میں قائم ہے۔ مسجد نبوی میں باب جبرئیل کے نام سے جو دروازہ ہے اُدھر سے نکلیے تو قبلہ کی سمت "دیار عشرہ مبشرہ" کا جو کتبہ لگا ہوا ہے، اسی کے مقابل کے ایک مکان پر "مشہد سیدنا عثمانؓ" یعنی حضرت عثمانؓ کی شہادت گاہ مرقوم ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ حضرت عثمانؓ اپنے گھر ہی کے بالا خانہ میں

شہید کیے گئے تھے، اس بنا پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کا گھر بہت بڑا تھا جس کی ایک حد مسجد نبوی کی سمت وہ مقام تھا جو آپ کا مشہد ہے، اور دوسری طرف گلی میں دور تک چلا گیا ہے، اور جو اب کئی گھروں کی صورت میں بٹ گیا ہے، جس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں میں مختلف مالکوں کے قبضہ اور تصرف میں رہا ہے۔

امیر جوہان نے ایک زمانہ میں اس کا ایک حصہ لے کر مسافر خانہ بنا دیا تھا جس کا نام رباط العجم ہے، اسی کے ایک بازو میں کہا جاتا ہے کہ سلطان نور الدین شہید کا مزار ہے، جس کا دروازہ آجکل بند کر دیا گیا ہے، سلطان عبد الحمید خاں اول نے اس مکان کا باقی حصہ خرید کر وقف کر دیا تھا، اس مکان کے دروازہ پر سلطان کے نام کا کتبہ لگا ہے، اور کتبہ میں والدۂ سلطانی کا تذکرہ ہے، کتبہ کے اشعار ترکی میں ہیں، اس لیے پوری طرح مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔

یہ مکان بھی اندر سے بے مرمت پڑا ہے، اس وقت بخاری حجاج یہاں ٹھہرے ہوئے تھے، میرے جانے کی خبر متولی صاحب کو پہلے معلوم ہو چکی تھی، ابراہیم حمدی بے خربوطلی نے ان کو مطلع کر دیا تھا، اس لیے کتب خانہ کے سامنے جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کر دیا گیا تھا، کتب خانہ مکان کی چھت پر ایک کمرہ میں تھا، کتب خانہ کا دروازہ جب کھولا گیا تو اس کے اندر اس قدر گرد تھی کہ ہم بیٹھ نہیں سکتے تھے، برادر عزیز ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب ندوی بی، ایس، سی اس وقت ہمارے ساتھ تھے، اور کتابوں کی تلاش میں مدد دے رہے تھے، تمام کتابیں کچھ الماریوں میں، کچھ زمین پر، کچھ طاقوں میں اس طرح بے ترتیب پڑی تھیں، اور اس طرح گرد آلود تھیں کہ اہل شہر کی ناقدری اور متولی کی غفلت پر افسوس آتا تھا۔

کتابوں کی کوئی فہرست بھی نہ تھی، بہزار دقت ایک ایک کتاب کو اٹھا اٹھا کر اور جھاڑ جھاڑ کر دیکھنا شروع کیا، یہ دیکھ کر کس قدر تعجب ہوا کہ اس کتب خانہ کا نہایت قدیم تعلق اندلس، مراکش اور دیار مغرب کے مختلف شہروں سے ثابت ہوا، اکثر نسخے وہیں کے تھے اور ان ہی اطراف کے مصنفین کے تھے، چونکہ وہاں مالکی مذہب کا رواج تھا اور ہے، اس لیے مالکی مذہب کی کتابیں مشتر تھیں، قرآن پاک کے اکثر نسخے مغربی خط میں تھے، جو کوفی خط کے قریب ہے، سب سے زیادہ جس منظر کو دیکھ کر دل پاش پاش ہوا، وہ ایک الماری کے نیچے ہرن کی کھال پر لکھے ہوئے قرآن کے متعدد نسخوں کے منتشر اوراق تھے، ہندوستان کے کسی کتب خانہ میں اگر اس قرآن کا ایک ورق بھی ہوتا تو کتابوں کے شائق دور دور سے اس کو دیکھنے کو آتے

ان کتابوں میں جو مجھکو نادر معلوم ہوئیں، وہ حسب ذیل ہیں،

۱- الاستذکار شرح موطا مالک لابن عبد البر
۲- المسالک علی موطا مالک للشیخ ادریس الفاسی
۳- المنتقی شرح موطا مالک للباجی
۴- شرح بخاری للکرمانی
۵- التنقیح علی الجامع الصحیح للزرکشی
۶- مسند القضاعی فی الحدیث
۷- سنن الکبریٰ للبیہقی (ناقص)
۸- معجم کبیر للطبرانی
۹- تفسیر ثعالبی
۱۰- کتاب الوقف والابتداء لابن العربی
۱۱- کتاب الناسخ والمنسوخ
۱۲- الاکتفاء فی السیرۃ للکلاعی
۱۳- تاریخ فتوح مصر لابن عبد الحکم
۱۴- مشارع الاشواق الی مصارع العشاق لابن النحاس
۱۵- اجابۃ الداعی الی شرح غریب اکتفاء الکلاعی
۱۶- جزء من تبصرۃ اللخمی فی الفقہ
۱۷- کتاب الکافی لابن عبد البر
۱۸- شرح ابن حاجب علی الزوادی فی الفقہ

۲۰۔ شرح مدونۂ امام مالکؒ لابی الحسن الصغیر　　۲۱۔ بہجۃ النفوس لابن ابی جمرہ

۔ شرح تلقیح للقاضی ابی محمد بن عبد الوہاب البغدادی

گیارہویں کتاب کتاب الناسخ والمنسوخ ایک خاص حیثیت سے نہایت قابل قدر
[illegible]، مصنف (نام معلوم نہیں) نے لکھا ہے کہ میں نے یہ کتاب تفسیر کی ۹۵ کتابوں سے لیکر
[illegible] کی ہے، ساتھ ہی اس کا سال تصنیف ۵۰۰ھ ہے، اور یہ اس جزیرہ میں بیٹھکر
[illegible] گئی ہے، جس کے نام کو ہر مشرقی حاجی نہایت درد اور مصیبت کے ساتھ لیتا ہے، یعنی
[illegible] یرہ کمران (کامران) کیا یہ جزیرہ کبھی اسلامی علوم کا مرکز بھی رہا ہے؟ اب تو یہاں چند ہزار
[illegible] دی یمنی و حبشی عربوں کے سوا اور کچھ نہیں، مصنف نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ جزیرہ اسوقت یمن کا حصہ ہے۔

فسبحان　مقلب الایام واللیالی

(معارف اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۲۶ء)

[illegible] کتب خانۂ عارف حکمت بے | یہ تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں عارف حکمت بک ترکی کے
[illegible] شیخ الاسلام تھے، وہ کتابوں کے بڑے شائق تھے، اور ان کا بڑا ذخیرہ ان کے پاس تھا،
[illegible] ۱۲۷۰ھ میں انھوں نے یہ تمام ذخیرہ سرزمین پاک یثرب میں استفادۂ عام کے لیے وقف
[illegible] کر دیا، اس کتب خانہ میں گیارہ بارہ ہزار سے زیادہ کتابیں ہیں، جن میں زیادہ تر قلمی
[illegible] کتابیں تھیں، سات سو خاص شعرائے عرب کے دواوین ہیں، یہ کتب خانہ باب جبرئیل
[illegible] کے قریب ایک خوبصورت عالیشان عمارت میں قائم ہے، کتب خانہ کے اخراجات کے لیے
[illegible] کتب خانہ کے بانی نے ایک وقف بھی چھوڑا ہے، جس سے اس وقت اس کے اخراجات
[illegible] چلتے ہیں، ملازمین کتب خانہ میں سے ناظم اور محافظ اول کی سات سات سو قرش تنخواہ ہے
[illegible] ہیں، محافظ دوم کی چھ سو، اور محافظ سوم کی ۵۵۰ قرش تنخواہ ہے، علاوہ ازیں محافظ چہارم

جلد ساز، دربان بہشتی اور جاروب کش وغیرہ ملازمین کتب خانہ ہیں،

اس کتب خانہ کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مطبوعہ کتابوں سے زیادہ نایاب، نادر قلمی کتابیں ہیں، اگرچہ ان میں کی اکثر کتابیں طبع ہوچکی ہیں، تاہم کتابت میں خاص امتیاز رکھنے کے ساتھ بعض مخصوص تاریخی اہمیت رکھتی ہیں جس کی تفصیل پر ذیل کی فہرست سے قدرے روشنی پڑے گی،

(۱) ایک مجلد قرآن مجید شتر مرغ کے چمڑے پر بہترین اندلسی خط میں لکھا ہوا ہے جسے ۵۸۳ھ میں عبد الرحمن بن علی بن محمد بن مرزوق بن احمد بن مکانس بطلیموسی نے مریہ (اندلس) میں لکھا تھا،

(۲) اسی طرح حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی ایک تفسیر قرآن ۳۱۱ھ کی لکھی ہوئی کتب خانہ میں محفوظ ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس کے چند اجزاء ضائع ہوگئے ہیں،

(۳) نویں صدی کے مشہور عالم جلال الدین سیوطی کی ایک کتاب محاضرات و محاورات خود انہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے،

(۴) ایک کتاب افعال ابن القوطیہ بھی نوادر میں ہے، جو ۵۷۴ھ کی لکھی ہوئی ہے،

(۵) ابو اسحاق بن ابی عون البغدادی کی ایک تصنیف کتاب التشبیہات ہے اس کا ایک نسخہ مشرقی خط میں لکھا ہوا اس کتب خانہ میں بھی ہے، جس کا سنہ کتابت ۴۶۶ھ ہے۔

(۶) ملا شاہی کا فارسی دیوان بھی اس کتب خانہ میں قلمی موجود ہے، یہ دیوان بہترین خط ابیض میں لکھا ہوا ہے،

(۷) رضی الدین محمد بن ابراہیم حنبلی کی کتاب کتاب الزہر و العزب فی تاریخ حلب

بھی یہاں قلمی موجود ہے۔

(۸) محمد بن سلام الجمحی کی طبقات القراء۔

(۹) جمال الدین ابو عبید اللہ بن احمد المطری کی کتاب التعریف بما انست الہجرۃ من معالم دار الہجرۃ بھی وہاں موجود ہے (کتاب التعریف میں فضائل مدینہ منورہ، فضائل مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، مدینہ منورہ کی دیگر مسجدوں وادی مدینہ اور وادی عقیق کے حالات اور حرم کے حدود وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔

(۱۰) اسی طرح سید محمد کبریت المدنی کی کتاب الجواہر الثمینہ مکتوبہ ۱۲۷۰ھ اور ان کی کتاب نصر من اللہ فتح قریب کا قلمی نسخہ، جس میں فضلائے مدینہ کے تراجم بھی موجود ہیں۔

(۱۱) اسی طرح علامہ ابو الحسن علی بن یحیی بن عیسی بن جزلۃ الطبیب البغدادی کی تقویم البلدان فی تدابیر الانسان کا ایک قلمی نسخہ اور

(۱۲) یحیی بن ابی بکر العامری کی غربال الزمان المقتبس لسید ولد عدنان کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ عامری کی یہ تصنیف امام اسعد یافعی کی مختصر یا ملخص ہے۔ جس میں بترتیب سنین ۸۷۵ھ تک کے تاریخی واقعات اور اس زمانہ تک کے مشاہیر کے تراجم بیان کیے گئے ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ

(۱۳) الراعی الشہیر با بن حذار بروی المتوفی ۱۱۹۵ھ کی البرق المتالق فی محاسن جلق

(۱۴) نویں صدی کے لبودی دمشقی کی النجوم الزواہر فی معرفۃ الاواخر

(۱۵) کتاب محذرات القصور فی تاریخ اہل العصور لابن قطری البحیری،

المورخ المصری المتوفی ۸۹۵ھ اور کتاب ایمان العرب لابی اسحاق النجیری الکاتب کا ایک ایک قلمی نسخہ اس کتب خانہ میں موجود ہے۔

افسوس ہے کہ بانی کتب خانہ کی آخری عمر کی تمام جمع کردہ کتابیں ضائع ہوگئیں کیونکہ ان کا انتقال ایک دوسری جگہ ہوا، اور وہ تمام کتابیں جو ان کے پاس تھیں ناقدر دانوں کے ہاتھوں نہایت سستے داموں فروخت ہوگئیں، ان ہی کتابوں میں عربی علم ادب کی مشہور کتاب کتاب الاغانی بھی تھی، یہ وہی نسخہ ہے جو مطبوعہ صورت میں ارباب علم و ادب تک پہنچا۔

کتب خانہ عارف حکمت بک کے لیے یہ سخت قابل تاسف امر ہے کہ اس کی فہرست ابتک شائع نہیں ہوئی کہ ارباب ذوق مستفید ہوسکیں، شاید حجاز کا جدید انقلاب حکومت اس کتب خانہ کو راس آئے، اور علم دوست سلطان ابن سعود کی توجہ اس کتب خانہ کی طرف بھی منعطف ہوجائے۔

سفر گجرات

کی

چند یادگاریں

جولائی ۱۹۳۳ء میں بڑودہ کی مجلس سیرت کے سلسلہ میں مجھے گجرات کے سفر کا اتفاق ہوا، اس خطہ کو ہندوستان کے تمام دوسرے صوبوں کے تقابلہ میں چند خصوصیتیں حاصل ہیں، اول یہ کہ عرب اور ہندوستان کے باہمی تعلقات کا آغاز اسی سرزمین سے ہوا، دوسرے یہ کہ عرب سے جو علمار دریا کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوتے تھے، وہ پہلے یہیں اترتے تھے، موقع ملتا تو آگے بڑھتے ورنہ یہیں سے لوٹ جاتے تھے، ہندوستان سے جو علما، عرب جانا چاہتے تھے، وہ اسی راستہ سے سفر کرتے تھے، اس صوبہ کے سیکڑوں دیہات حرمین محترمین کے مصارف کے لئے وقف تھے، دوسرے ملکوں سے جو نادر اور تحفہ چیزیں یہاں آتی تھیں، وہ پہلے یہیں پہونچتی تھیں، حج کے لئے ہر سال ہزاروں علمار امرا اور عام مسلمان اسی راہ سے منزل مقصود کی طرف روانہ ہوتے تھے،

اخیر زمانہ میں سلطان عالمگیر اور سیواجی کی سیاسی کشمکش کا میدان جنگ یہی خطہ تھا، اور اس لئے سلطانی لشکر کا بڑا اڈا اکثر یہاں رہتا تھا، اور اس تعلق سے یہ صوبہ کبھی

پورے ہندوستان کا دارالسلطنت بنا تا تھا، اور ہر قسم کے اہلِ کمال ادھر کا رُخ کرتے تھے ،

دکن و گجرات کے علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے، اور جو ہے وہ ہندوؤں کی کثرت، زور و قوت، اور سیلابِ تمدّن میں غرق ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان کے علمی و مذہبی و سیاسی مرکز یعنی ہندوستانِ خاص سے وہ بہت دور ہے، اس لئے یہاں کے دیہاتوں اور قصبوں میں مسلمانوں کی حالت قابلِ رحم تھی، سلطان عالمگیر کی دوربین نگاہوں سے ان وجوہ و اسباب کا نتیجہ چھپا نہ تھا، سلطان نے اس پورے علاقہ میں علماء صوفیہ، اور مذہبی معلمین کی قطار و رقطار آباد کردی، موذن خطیب، امام اور ملا (جو جانور شرعی طور سے ذبح کرتے تھے،) موروثی مقرر کردیئے، اور ان سب کے لئے وظائف اور سرکاری اوقاف معین کئے، جو آج تک اُن کے اخلاف کے قبضہ میں ہیں، وہاں کے دیہاتوں میں آج تک ان ہی ملاؤں کی اولاد اپنے اس فرض کو ادا کررہی ہے یہاں تک کہ کوئی ہندو بھی اگر جانور ذبح کرانا چاہتا ہے، تو یہ خون انہی کے ہاتھوں سے گرتا ہے، یہاں اب بھی ایسے سیکڑوں، ہزاروں شریف خاندان آباد ہیں، جو انہی مذہبی فرائض کے لئے یہاں آباد کئے گئے تھے، اور ان کو اس کے لئے سرکاری اوقاف دیئے گئے تھے جن پر وہ آج تک قابض ہیں، اور انہی کے بدولت آج انگریزی سرکار میں بھی ان کو عزت اور وقار حاصل ہے، اور مسلمانوں کی کچھ ممتاز صورتیں وہاں نظر آتی ہیں،

بھڑوچ | جس کے کنارے دریائے نربدا بہتا ہے، اور جو آگے چل کر بحرِ عرب میں مل جاتا ہے، عربوں کے جنگی و تجارتی آمد و رفت کا مرکز تھا، عرب اس کو بروص کہتے ہیں، ۱۵ھ میں حضرت عثمان ذوالنورینؓ کے عہد میں جب اسلام کے ملکی

فتوحات کا شباب تھا، ان کے جنگی جہاز اس کے ساحل پر آ کر لگے تھے، سفر کے اثنا میں جب میں بھڑوچ پہنچا، اور نربدا کے کنارے آ کر کھڑا ہوا، تو تخیل کی آنکھوں نے تیرہ سو چھتیس برس پہلے کی تصویریں نگاہوں کے سامنے کر دیں اور گو میں شاعر نہیں تاہم جذبات کے تلاطم نے موزوں ترانہ کی شکل اختیار کر لی۔

نربدا! اے نربدا! اے جادۂ بحرِ عرب!
گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادۂ بحرِ عرب

جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز
تیرے دروازہ پہ ٹھہرا تھا، مرا پہلا جہاز

تو گذشتہ کاروانوں کا نشانِ راہ ہے
ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے

رشتۂ ہند و عرب تجھ سے ہوا تھا استوار
تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہے آئینہ دار

ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو
چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو

آج کس کو یاد ہے وہ داستانِ باستان
تیرے ساحل پر جب اترا تھا عرب کا کارواں

تو ہے دریائی پری یا شاہدِ عالم ہے تو
اس سمندر کے گلے کی شہ رگِ اعظم ہے تو

تیرا ہر قطرہ حیاتِ نو کا اک سرشار جام
اس تنِ آبی میں تیرا خون دوڑانا ہے کام

اے بھڑوچ! اے خاتمِ انگشتِ رودِ نربدا
عہدِ ماضی کی تری عزت رہی باقی سدا

توتیا ہے چشمِ ظاہر آج تیری خاک ہے
ذرہ ذرہ پہ تو خورشید ذی لولاک ہے

یادگارِ عہدِ خیر القرن ہے تیری زمین
مطلعِ انوارِ ذی النورین ہے تیری جبین

چشمِ عبرت کی نگاہیں جب تری جانب اٹھیں
تیری موجیں کہنہ افسانوں کی سطریں بن گئیں

یہ ترانہ تال سُر اور زیر و بم سے خالی ہے، اس لئے اہلِ وجد و سماع اس پر کان نہ دھریں

بھڑوچ کا ایک پرانا خاندان

بھڑوچ میں عہدِ عالمگیری کی یادگار ایک خاندان ہے، جو یہاں مسندِ قضا پر متمکن تھا، اس خاندان کے موجودہ چشم و چراغ جناب قاضی نور الدین شیرازی صاحب

ہیں، لبِ دریا اُن کا فضیلت کدہ یادگارِ زمانہ ہے، ایک موروثی کتب خانہ اُن کے اسبابِ ثبت میں ہے، افسوس ہے کہ اس وقت قاضی صاحب موجود نہ تھے، اس لئے میں کتب خانہ کی سیر نہ کرسکا، مگر میرے ایک عزیز نے اُن کا کتب خانہ دیکھا ہے، اس کے حسبِ ذیل نوادر کا حال مجھ سے بیان کیا،

اس خاندان کے چند نوادر کتب | (۱) شرح مثنوی مولانا روم (؟) جلد پنجم آخر میں ہے،

"ذوالقعدہ سنہ ۱۰۹۰ ہجری میں بسنت رائے نے قصبہ مچھر ہٹہ سرکار خیرآباد میں تحریر کیا"

(۲) حدائق السحر فی دقائق الشعر مؤلفہ محمد بن محمد بن عبدالجلیل العمری المعروف بہ رشید وطواط آخر میں ہے،

"تم الکتاب بعون الملک الوھاب وحسن توفیقہ علی ید العبد الضعیف محمد الحافظ الهروی، تحریراً فی یوم الاثنین ثانی عشر من ربیع الاول سنہ ۸۶۲ اثنین وستین وثمانیۃ الهجریۃ النبویۃ بدارالسلطنۃ شیراز بزمان قید،

(۳) المحیط للسرخسی جلد ثانی جمع الامام الهمام مولانا رضی الدین محمد بن محمد بن محمد سرخسی الحنفی، آخر میں ہے، :-

"کان الفراغ من کتابتہ فی یوم الرابع ذوالقعدۃ[1] سنہ ۶۰۹ھ کاتب علی بن علی بن رمضان العبادی الشافعی الازهری"

---

[1] یہ کتاب ایران میں چھپی ہے، اور ملتی ہے،

(۴) گلستان، متوسط تقطیع اور معمولی خط نسخ،

مصنف کے اصل نسخہ سے یاقوت مستعصمی نے اور اس نسخہ سے بحکم جہانگیر سید جلال الدین بخاری نے اور اس سے سید محمد بن سید زین العابدین بن سید احمد حسن رضوی نے ۱۲۱۹ھ میں نقل کیا،

(۵) مخازن المعروف جلد ثانی، شرح مشکوٰۃ فارسی، از کتاب الزکوٰۃ تا کتاب البیوع دوسری، تیسری اور چوتھی جلد ہے،

صفحۂ اول مطلا ہے، تقطیع کلاں، اس پر خواص خاں غلام فرخ سیر بادشاہ غازی کی مہر ۱۲۲۵ھ ہے، ابو معروف حسین ۱۱۱۲ھ بھی تحریر ہے،

مدرسہ دارالارشاد احمد آباد میں بھی رہ چکی ہے،

(۶) کتاب الخلاصہ (خلاصۃ الفتاوی) مؤلفہ طاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری ناقص از وسط تقطیع کلاں مختلف مسخ شدہ ورق ہیں، آخر میں ہے،

"تم کتاب الخلاصۃ من املاء الشیخ محمد بن محمد بن نصر الملد عوا حافظ البخاری علی ید انقر عبید لا محمد الملد عوا صفی الدین بن محمد الخلیلی ولد ابن حسین بن علی بن محمد بن احمد فی دولۃ الملک محمد بن مراد بن سلیم بن سلیمان بن سلیم بن بایزید بن شہور سنۃ ثلاث بعد الالف سنۃ ۱۳۰۳ھ نقل من نسخۃ تاریخہا یوم الجمعۃ العشرین من شہر ربیع الاول سنۃ ثلاث وتسعین سنۃ مایۃ،

(۷) مجمع البحرین ترجمہ "اپنکہت پرم ہنس" از اتھربن وید، فارسی، شاہ سرمد نے

سنہ ۱۱۳۶ھ میں سنسکرت سے ترجمہ کیا، کاتب نند رام ولد امانت رام، خط فارسی نستعلیق ۱۳×۸ تقطیع صفحات ۸۲

ہندوستان کی سب سے پرانی مسجدیں

قاضی صاحب کے عزیز خاص جن کو حکومت برطانیہ سے سردار صاحب کا خطاب حاصل ہے، وہ موجود تھے، اُن کا دولت کدہ بھی گذشتہ بنائے جلال کا کہنہ مرقع تھا، موصوف نے اپنے خاندان کے پرانے ہتھیاروں کی سیر کرائی، اُن کی عمارت کے سلسلہ میں ایک چھوٹی سی معمولی مسجد ہے، جس پر سنہ ۴۳۲ھ کا کتبہ لگا ہوا ہے،

ھذہ العمارۃ القدیمۃ فی شہور سنہ ۴۳۲ھ

اس کتبہ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ یہ بعد کو لگایا گیا ہے، بہرحال اس کی کوئی تاریخی سند اگر موجود ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس صوبہ کے اسلامی فتوحات سے پہلے کی یادگار ہے، یا یوں کہئے کہ محمود غزنوی کے حملۂ گجرات سے چند سال بعد کی ہے، جو بہرحال کوئی مستقل فتح نہ تھی،

اس کے بعد اس شہر میں اسلام کی ایک اور قدیم یادگار (رو ہال) کی سنگی جامع مسجد ہے، اس جامع مسجد کی اصلی تعمیر کا کتبہ سنہ ۵۵۴ھ ہے، بعد کو محمد تغلق کے عہد میں سنہ ۷۲۱ھ میں دروازہ کے اوپر ایک گنبد کا اضافہ کیا گیا ہے، گنبد سنگ خارا سے بنایا گیا ہے، اور اس پر حسب ذیل کتبہ لگا ہے،

"در عہد دولت سلطان عالم غیاث الدین والدنیا، محمد تغلق ہفت صد و بست و یک"

غالباً ان مسجدوں سے زیادہ پرانی کوئی دوسری مسجد ہندوستان میں نہ ہوگی،

انکلیشور [illegible]

بھڑوچ سے قریب ہی ایک پرانا قصبہ انکلیشور نام ہے، جو سورت کے سفر میں کبھی بیچ کی ایک منزل تھا، یہاں بھی عہد شاہی کی یادگار ایک خاندان آباد ہے،

خاندان کے بانی شاہ عبدالعلیم صاحب ہیں، جو اکبر کے معاصر تھے، ۱۰۰۵ھ میں انھوں نے وفات پائی ہے، اُن کی خانقاہ و مسجد یہیں واقع ہے، خاندان کے موجودہ جانشین کا نام سید حیدر علی غلام علی انعام دار ہے، موصوف کے پاس اس خاندان کی پرانی اردو کی سند پرانی کتابوں کی ایک الماری ہے، اس میں چند عربی کی اور باقی فارسی تصوف کی کتابیں ہیں، گجراتی اُردو میں بھی بعض کتابیں نظر آئیں،

اس خاندان کے چند نوادر کتب

عربی کتابوں میں سب سے نادر چیز یہاں قدیم طب کی ایک کتاب تقویم الادویہ ہے، اس کا سالِ کتابت ۵۰۰ھ ہے، نسخہ بخطِ عرب خمیرۂ خرما سے لکھا ہوا ہے، اور اب تک اچھی حالت میں ہے،

حقہ کی تاریخ

یہاں ایک مجموعہ میں ایک صفحہ پر چند واقعات کی تاریخیں لکھی ہوئی نظر پڑیں، جن میں سب سے اہم ہندوستان میں حقہ کے رواج کی تاریخ ہے، یہ تاریخ "آخوشی بنا" کے الفاظ سے نکالی گئی جس سے ۱۰۲۹ھ نکلتے ہیں، چونکہ یہ چیز گجرات ہی کے راستہ سے ہندوستان میں وارد ہوئی ہے، اس لئے عجب نہیں کہ تاریخی بیان صحیح ہو، ۱۰۲۹ھ جہانگیر کا عہد ہے،

بندر سورت کی تاریخ

گجرات کا دوسرا مشہور دریا جو بحرِ عرب سے جا کر ملتا ہے، دریائے تاپتی ہے، اس کے کنارے پر شہر سورت آباد ہے، اور دوسرے کنارے پر راندھیر پہلے بحرِ عرب میں جانے والے جہازوں کا بندرگاہ راندھیر تھا، مغلوں کے شروع عہد میں اس کے بجائے سورت کی آبادی بڑھی، اور وہ ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ بنا، اس قلمی یادداشت میں اس بندرگاہ کی آبادی کی تاریخ ۹۳۶ھ نظر آئی، تاریخ کا مصرع یہ تھا،

ع :- یادآباد بندر سورت

راندھیر جس کو پہلے رانیر کہتے تھے، اسلام کے قدیم فتوحات میں ہے، اس یادداشت میں اس شہر کی تاریخ ایک قدیم مسجد کے کتبہ سے حسب ذیل بتائی گئی تھی،

بنا کرد مسجد بجائے کنشت ، برایوانش انا فتحنا نوشت
۵۹۱ھ

راندھیر کی پرانی مسجد | چند دوستوں کی دعوت پر راندھیر جانے کا بھی اتفاق ہوا، یہ دولت مند دیندار مسلمان تاجروں کا مسکن ہے، اور دعوی کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس قصبہ میں جس قدر خوبصورت اور عمدہ اہتمام کے ساتھ مسجدیں دیکھنے میں آئیں پورے ہندوستان میں کہیں نہیں آئیں، ان مسجدوں میں سے ایک قدیم مسجد چوناوارہ ہے، یادداشت مذکور میں اس مسجد کی بنا کی تاریخ یہ لکھی تھی،

گر کسے پرسد ز تو تاریخ ازیں معبد شریف ، گو مسمی مسجد اعلیٰ و در باب شریف
۹۵۵ھ

گجراتی ہندوی کی بعض کتابیں بھی اس خاندان کے ذخیرہ میں دکھائی دیں جن میں سے درج ذیل کتابیں ذکر کے قابل ہیں،

لغت عربی و ہندی | عربی اور ہندی یا ہندوستانی کا ایک لغت ملا، جس کے شروع کے چند شعر یہ ہیں:-

اللہ خدا ہے کرتار	الخالق آفریدہ سرجن ہار
الدنیا کہتی سنسار	الاحمق نادان گنوار
الجنت بہشت سرگ	السقر دوزخ مرگ
الیوم روز دلیس	الشعر موے کیس
اللیل شب رات	القول گفت بات

السبیل راہ باٹ — السبع ہفت سات
الاسم نام ناؤں — الموضع دیہہ ٹھاؤں
الظل سایہ چھانوں — المقام جانگیہ ٹھانوں
الراس سر سیس — العشرین بست بیس
العین چشم آنکھ — اللحیہ ریش داڑھی
الاذن گوش کان — الورق برگ پان
الطعام خوردن کھان — السہم تیر بان

آخری حصہ :-

الفرح خوشی ہلاس — القنوطا ناامید نراس
الفخذ ران تہی جانگ — الجسم تن ہے آنگہ
المورد آب خورا درارا — السمر افسانہ بواڑا
الکدر تیرہ گدلا — الغیم نابینا اندلا

مصنف اور تصنیف کا زمانہ مذکور نہ تھا،
اسی قسم کا ایک عربی لغت برادر عزیز سید نجیب اشرف ندوی کی ملکیت میں ہے مگر
وہ اس کے علاوہ ہے اس کے ابتدائی شعر یہ ہیں،

الالہ پرستیدہ پوجیا — المعلوم دانستہ بوجھیا
المحمد ستودہ کھانیا — المعروف شناختہ بجھانیہ
الرسول فرستادہ بھیجیا — الواضح روشن تجھیا
الآل دودمان کنبہ — النقود خوشہ لونیا

معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ گجرات میں عرب اور ایرانی کثرت سے آیا کرتے تھے، اس لئے ان کو ہندوستانی زبان سے آشنا کرنے کے لیے اس قسم کے لغت یہاں لکھے گئے ہیں،

رسالۂ فقیری [illegible]

اس رسالہ کا آغاز ان لفظوں سے ہے،

"جانو کہ بوجھ تو ن یہ رسالہ فقیری حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا ہے، جو اس کو بوجھیگا وگرنہ تو فقیری نہ کرے،

سوال اگر تیرے پوچھے کہ اول فقیری کیا ہے، و آخر فقیری کیا ہے، اور خانہ یعنی گھر فقیری کا کیا ہے، اور کیلی فقیری کیا ہے، اور لقمہ فقیری کیا ہے،

اسی قسم کے سوال و جواب پر رسالہ کے اکیس صفحے ختم ہوئے ہیں، تصنیف و مصنف کے متعلق بالکل خاموشی ہے،

فقہ ہندی

یہ فقہی مسئلوں کے بیان میں ایک نظم ہے آغاز کے اشعار یہ ہیں،

بڑا نام صاحب سب کوں خالق کل جہاں — لائق حمد ثنا کے اور کو نہ جان
ہم شریعت ال وہی بھیجا پاک رسول — جو کچھ بھیجا رب نے سب ہم کیا قبول
سب انبیا کرم سوں بھیج پیغمبر درود — نبی محمد مصطفیٰ تسوں ہوں خوشنود
[illegible] آل پر اور اصحاب تمام — تس پیچھے احباب پر بہت درود و سلام
مسئلے دین کے ہیں رکھے آئینا — فقہ ہندی زبان سو بوجھو کر و یقین
مطلب مسئلے پوچھا جو کچھ ہر ہزار — عربی ترکی فارسی ہندی یا افغان

اس کے بعد فقہی ابواب ہیں، اور ان کے تحت میں ہر قسم کے مسائل ہیں، خاتمہ میں تصنیف کا زمانہ [illegible] بعہد اورنگزیب عالمگیر صاف بتایا گیا ہے، خاتمہ یہ ہے،

فقہ ہندی کو کرلیا ہو [illegible] گر زبان پر یاد — مسائل اور دین کے کبھی نہ ہوسے فساد

سنہ ہزار پچھتر بیچہ ماہ رمضان تمام — اورنگ شاہ کے دور میں نسخہ ہوا تمام

اس نعتی نظم میں خاص چیز نظم کا وزن ہے، جو عربی فارسی کے بجائے ہندی اوزان کی پیروی میں ہے، اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ پرانے لوگوں کے زمانہ میں ہندی کس کو کہتے تھے،

داستان حضرت ماہ رمضان | اس نظم میں ماہ رمضان کی فضیلتوں کا ذکر ہے، مصنف کا نام بدیع الدین ہے، شروع کے شعر حسب ذیل ہیں،

سرنامہ از نام سبحاں لکھوں — کہ دل کی ورق پر سنبھل کر لکھوں

زباں کو ہے جوہر اسی کو ثنا — اسی کی سو قدرت زگنج غیاں

کریم و رحیم و وہ غفار ہے — کرم عاصیاں پر کرنہار ہے

ز ہر چیز اس کی صنعت کا بیاں — کہ پیدا کیا جن نے ارض و سما

آخر میں لکھا ہے

کرو اس کی سب نعمتوں پر شکر — مصیبت کے اوپر جو کم ہے صبر

کہ تا عاقبت تیری ہووے بھلی — کہ شادی و غم جگ میں جاتا چلی

بدیع الدین تعریف عمل کی کرو — کہ چھوٹا بکس کی جس میں تو رنج دہر

اس نظم کی خصوصیت خاص فارسی آمیز ترکیبیں اور قافیوں میں صرف صوتی ... عربی الفاظ حکم اور صبر وغیرہ کو اس طرح باندھا ہے، جس طرح ہندی میں بولے جاتے تھے

داستان قیامت | اس نظم کا شروع ان اشعار سے ہے،

سخن ہے مرا جوں گل بوستاں — نصیحت کی باتوں سنو دوستاں

لباسی مسلماں کہاتے ہیں دوست — کہ کھاتے ہیں سب گائے بکری کا گوشت

لباسِ شریعت کریں تن مینن　　　شریعت کی باتاں نہ کچھ من مینن

بڑی ریش تسبیح خوش پیرہن　　　بھری دل میں کین بھاتے مکر دفن

آخری شعر میں اس نظم کا سال ۱۱۷۰ھ (؟) بتایا گیا ہے،

سنہ ایکہزار دو سو تو ستر سو　　　لکھی یہ حکایت کتابوں کی رو

بتاریخ غرہ دریں ماہ پیر　　　باتمام آن شد، مدد دستگر

فقہ مبین | یہ نظم فقہ کے مسائل میں ہے آغاز اس طرح ہوتا ہے،

بنامِ پاک ربّ العٰلمین سوں　　　شروع کرتا ہوں فقہ مبیں سوں

بحقِ معجزہ و مقبولِ مرسل　　　سبھی عقدہ فقہ کے مجھ پہ کر حل

مسائل فقہ کے ہیں اصل ایماں　　　جو نیں بوجھے سو وہ کیوں ہوئے مسلماں

اس کے بعد اپنے تمام ماخذوں کا نظم میں ذکر کیا ہے، پہلے ایمان کے مسائل پھر طہارت، وضو، غسل وغیرہ اس کے آخر میں بدعت کا رد اور جوئے کی برائی ہے، آخر میں ہے،

یقیں فقہ المبیں کوں کرتے مختوم　　　بحقِ دین پناہ آلِ معصوم

ہزار و ہشت تا ذو والقعدہ ہجرہ　　　بتاریخ ہمایوں گشت تمت

اگنیارہ سو میں اسی اوپر دو　　　سنہ ہجری نبیوں کے تبا یو

رسالہ کے آخر میں خاتمہ کی عبارت ہے،

"نسخۂ قوت دین فقہ المبیں تصنیف حضرت شاہ یقین رحمۃ اللہ علیہ"

اس سے مصنف کا نام شاہ یقین، کتاب کا نام قوت دین المبین" اور تصنیف کا سال ۱۱۸۲ھ معلوم ہوتا ہے،

مثنوی کتخدائی | کسی رسم شادی کی تعریف و توصیف میں ہے، رسالہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

ثنا ، و ہے درگاہ یزداں — وہ خالق سب کا ہر کیا جن و انساں
ثنا و حمد کے لائق سدا ہے — سزا وار او خدائی کا خدا ہے

. . . . — . . . .

محمد اشرف اولادِ آدم — حبیب و سرورِ و سردارِ عالم
شہ آدم محمد سرورِ دیں — کہ ختم الانبیاء ہیں رہ بر دین
ہوا جس شان میں لولاک وارد — دیکھو محبوب کا رتبہ ہے شاہد

اس کے بعد خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کی مدح اور امامین علیہما السلام کی تعریف میں چند شعر ہیں، اس کے بعد نکاح کا قصہ شروع ہوتا ہے،

شروع کرتا ہوں اب شادی کی تعریف — نزاکت سیں لکھوں میں اسکی توصیف
مہیا سب کیا سامان اظہر — لباس و زیور و لولو و گوہر

اُس کے بعد ان سرخیوں کے ماتحت چند باب ہیں، در وصف[۱] الطعام، در وصف[۲] الحل، در وصف بروزن برات، در[۳] وصف[۴] شہر گشت، در وصف[۵] نکاح خوانی، در بیان[۶] خلوت،

خاتمہ اس پر ہوتا ہے،

سخن کو مختصر کاں تک لکھے گا — یہ ہے طومار آخر کوں تھکے گا،
بشرت عیش باد ا ساز واری — مری یو مثنوی ہے یادگاری
شب نسبت دودم از ماہ رجب — کہ شادی ہور شہر گشت ہے شب
سنہ ہجری دراں وقت بود و چو — ہزار و یک صد و تسعین و یک بود

آخر شعر سے تصنیف کا سال ۱۱۹۱ھ معلوم ہوتا ہے، وزن سے حرفوں کا گرنا،

اس وقت معیوب نہ ہوگا،

وفات نامہ حضرت نبیؐ | آغاز

بنا اول کروں حمد خدا میں | زباں اوپر آپس کی ابتدا میں
کیا قدرت سوں ظاہر اپنی قدرت | بنا کر جگ دکھایا اپنی حکمت

بیچ کا ایک شعر ہے جس میں زبان کا نام دکھنی بتایا گیا ہے،

مجھے توفیق دے یارب کہ بولوں، | بنا ہجر بنی دکھنی میں کھولوں

تصنیف کا سال معلوم نہیں، کتابت کا سال ۱۲۵۱ھ ہے،

قصہ بانو | اس مثنوی میں ایک قصہ بیان ہوا ہے جس کے متعلق شاعر کا دعویٰ ہے کہ یہ قصہ پہلے فارسی میں تھا، اور اب دکھنی میں اس کو نظم کیا جاتا ہے،

عزیزاں روایت سنوں کان دھر | اول فارسی تھی یہ دکھنی دگر
اتھا گو وڑہ ایک شہر کا جو نام | ہمیشہ فتح کا اتھا وان مقام
سبھی ایک دن اس جمعہ مسجد منے | اتھے خرد بزرگ او سارے جنے
ڈستے ہیں مسافر نیا آن کر | سلام علیک کہہ کے بیٹھا مگر
پوچھے سب نے اس کو تو کاں سوں آیا | شہر ہے دور ہے نام محمد حیا
لگا بولنے کوں اوپوں سن کے بات | زلیخا کا قصہ دونوں کے سنگات
مگر ساری مجلس نے سن کر کلام | سگے بولنے آفریں سب تمام

فتح شاعر کا تخلص ہے آخر میں ہے،

فتح مختصر کر تو اپنی زباں | کہاں یک تو لکھے گا اس کا بیاں

زمانہ معلوم نہیں، تاہم اس کے بعض الفاظ خاص لحاظ کے قابل ہیں، "تھا" اور "تھے" کی

جگہ "تھا"، اور "تھے" اور کی جگہ "او"، "تین" کی جگہ "تنے"، "کہاں" کی جگہ "کان"، "وہ" کی جگہ "او"

قصہ سوداگر عجم | یہ نظم حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت کے بیان میں ہے، آغاز اس طرح ہے:

ثنا اور حمد مولا کی صبح و شام کرتا ہوں، درود اں مصطفٰے اوپر دل و جان سیں میں پڑھتا ہوں
درود اں حمد کے پیچھوں حکایت ایک ہے نادر، عزیزاں تم سنو اس کوں کھولوں گا تمیں ظاہر

آخر میں تاریخ ہے،

گیارہ سو اور چھپیں برس گزرے تھے حضرت کے، تبھی تصنیف میں آئے خوارق پیر حضرت کے
تو قبہ رحمت اللہ پر کرو تم اے شہ پیراں، [illegible] باطنی ہوئے اٹھتے اے حضرت میراں

خالق باری | ہمارے فارسی و ہندی ادبیات میں خالق باری کی تاریخ ایک معما ہے، اس کی تصنیف کی نسبت امیر خسرو کی طرف مشہور ہے، لیکن محققین کو ہمیشہ سے اس میں شک ہے، تعجب کی بات ہے کہ اس کا کوئی قدیم نسخہ اب تک نہیں ملا ہے، اس کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ نظر آیا، لیکن وہ بھی قدیم نہیں، رسالہ تاریخ سے گو معرا ہے، مگر اس کے نستعلیق خط سے معلوم ہوتا ہے کہ سوا سو برس سے زیادہ عمر کا نہیں،

خالق باری کے پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں ایک لفظ ملتا ہے، جو بدا یا بڑا پڑھا جاتا ہے،

ع واحد ایک بڑا کرتار

مسلم یونیورسٹی کے سلسلۂ تصنیفات خسرو میں جو نسخہ چھپا ہے، اس میں یہ لفظ "بدا" چھاپا گیا ہے، اور اس کے نیچے "ع" لکھا گیا ہے، لیکن عربی میں بدا کرتار کے معنی میں میرے پندار میں نہیں آیا ہے، معلوم نہیں فاضل محشی کے پاس جو عربی اور سنسکرت دونوں کے

فاضل ہیں، اس کی سند کیا ہے، موجودہ نسخہ میں یہ لفظ بڑا لکھا گیا ہے لیکن یہ بھی مہمل ہی بعض مطبوعہ نسخوں میں "خدا" چھپا ہے، اور شاید یہ صحیح ہو،

زیر بیان نسخہ میں اوّل تو کچھ اشعار زیادہ معلوم ہوئے، دوسرے یہ کہ افعال اور ضمائر میں قدامتِ زبان کی جھلک دکھائی دی، یہ تین شعر نئے معلوم ہوئے، جو مطبوعہ نسخہ میں مجھے نہیں ملے،

چوں بہ پرسی خسر بودہ کیست، جو کا بھائی ہے، — در خسر پرسی جو کا باپ جن دی جائی ہے،

ریختند در گوش خود سیماب دی بورا بھتیا — پنبہ پھکپ روئی گالا جسم تن آمد - کیا (کذا)

دان نہالی بستر و بالیں تکیہ لے جوان — غلط بالا - لیٹ اوپر اُس بچھاؤ - گستران

حسب ذیل شعر ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے قلمی نسخہ سے مطبوعہ کے تتمہ نمبر ۴ ۱۸ میں اس طرح چھپا ہے

عطسہ چھینک شاخ سینگ کفش گر ہے کفش دوز

گازر و خیاط ہے، دھوبی و درزی جامہ دوز

پہلے مصرع کا وزن صحیح نہیں معلوم ہوتا، فاعلاتن کا دوسرا اور تیسرا رکن کم ہے، پیشِ نظر نسخہ میں یہ غلطی نہیں، پھر دوسرے مصرع میں قافیہ دوز مکرر ہے، جو درست بھی نہیں اور جامہ دوز تو خیاط، اور درزی کے تقابل کے بعد بے معنی سا ہے، پیشِ نظر نسخہ میں یہ شعر یوں ہے،

عطسہ چھینک و شاخ سینگ و کفش گر ہے کفش دوز

گازر و خیاط ہے دھوبی و درزی، دیں روز

اسی کے بعد تتمہ نسخہ مطبوعہ نمبر ۵ ۱۸ ایسا ہے،

دانکہ بے بخت ست بھاگ بخت بھاگ — فارسی آمد سرود و ہندوی گویند راگ

اس کا پہلا مصرع شروع میں غلط ہے، دوسرا رکن ٹوٹتا ہے، اور تیسرا رکن غائب ہے، چار بار فاعلاتن کے بجائے تین ہی بار ہے، پیش نظر نسخہ میں یہ غلطیاں نہیں،

ڈ آنکہ بدبخت است، بھاگا بخت درفرس است بھاگ
فارسی آمد سرود و ہندوی گویند راگ

مطبوعہ نسخہ میں ہے :-

ع "طعم سواد، و طعام خورش جو کہئے کھانا

پیش نظر نسخہ میں طعم کی جگہ "مزہ" ہے، جو زیادہ بامزہ ہے،

مطبوعہ میں ہے :-

دُرّ و مرداریہ موتی جانیے   ہم صدف سیپی، سمندر مانئے

پیش نظر قلمی نسخہ میں دوسرا مصرع یوں ہے

"ہم سُبد رانی گلے بہچانیے،

اس قسم کے اختلافات اور بھی ملیں گے لیکن اہم چیز ضمیر کا معاملہ ہے مطبوعہ نسخوں میں لوگوں نے زمانہ مابعد کی ضمیریں کر دی ہیں، مثلاً "قدیم توں" کی جگہ جدید "تو" "ہت" پرانی زبان میں "متکلم ہوں" تھا، جواب بھی ہوتا ہے واحد متکلم کا صیغہ ہے، حضرت خواجہ فرید شکر گنج ۵۸۳ھ میں پیدا ہوئے، اور ۶۶۴ھ میں وفات پائی، اور امیر خسرو نے جن کی طرف یہ خالق باری منسوب ہے ۷۲۵ھ میں وفات پائی ہے، غرض دونوں کا زمانہ کچھ ہی آگے پیچھے ہے، حضرت خواجہ شکر گنج کا جو فقرہ میں نے اپنے مضمون "ہندوستان میں ہندوستانی" کے عنوان سے شائع کیا ہے، اس میں واحد متکلم اور واحد مخاطب کی ضمیریں "ہوں" اور "توں" استعمال ہوئی ہیں، بعینہٖ یہی دونوں ضمیریں پیش نظر نسخہ میں ہیں، مثلاً

خواہم گفت کہوں گا ہوں — خواہم کرد کروں گا ہوں

خواہی آمد آوے گا توں — خواہی نشست بیٹھے گا توں

خواہم دید دیکھوں گا ہوں — خواہی دید دیکھے گا توں

خواہم داد دیوں گا ہوں — خواہی داد دیوے گا توں

خواہم دوید دوڑوں گا ہوں — خواہی دوید دوڑے گا توں

مطبوعہ نسخہ میں "ہوں" کی جگہ "میں" اور "توں" کی جگہ "تین" ہے۔

سفر گجرات کی کچھ اور باتیں بھی بیان کرنی تھیں، مگر دیکھتا ہوں کہ قلمی سفر بھی خاصہ طویل ہو گیا ہے، ہم سفر ناظرین کے ملال راہ کا اندیشہ ہے، اس لئے قلم کی باگ یہیں روک لیجاتی ہے۔

(معارف ستمبر ۱۹۳۶ء)

انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ

اس وقت میں معارف کے ناظرین سے سات ہزار میل دور ہوں، بار بار جی چاہا کہ اس عجائبستانِ عالم سے اُن کے لائق کوئی تحفہ بھیجوں، مگر واقعہ یہ ہے کہ ۲۶ر فروری سے (یعنی جس دن سے ہمارا وفد انگلستان کے ساحل پر اترا، آج ۲۷ر اپریل تک شاید ہی کوئی دن ایسا گذرا جو آمد و رفت اور ملاقات سے خالی ہو؛ لندن چھوڑ کر کبھی پیرس اور کبھی اور کہیں جانا پڑتا ہے، اور اب انگلستان کے دوسرے شہروں کا دورہ شروع ہوتا ہے، کل رات کو اڈنبرا، وہاں سے منچسٹر، ۳ر مئی کو کیمبرج اور واپسی کے بعد پھر پیرس، غرض

ع ایک چکر ہے میرے پانوں میں زنجیر نہیں

گو میری مصروفیت وفد کے دوسرے ارکانِ محترم محمد علی و سید حسین صاحب سے بہت کم ہے، پھر بھی آتنی کہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا، جس کی معافی چاہتا ہوں، اس دوران میں اس ایوانِ حکومت میں جس کا نام انڈیا آفس ہے، تین چار دفعہ جانے کا اتفاق ہوا، اس عمارت میں جہاں سیکڑوں حقیقی

مجازی زیارت گاہیں ہیں، ایک زیارت گاہ کا نام انڈیا آفس لائبریری ہے، یہ لائبریری اسی عمارت کے ایک گوشہ میں واقع ہے، اور ہندوستان کی علمی تاریخ کا مرقع ہے، ایک گول ریڈنگ روم (مطالعہ کا کمرہ) ہے، اس کے ایک پہلو میں کتب خانہ ہے، دوسرے پہلو میں کئی چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں، جو کتب خانہ کے مہتموں کے دفتر ہیں، مسٹر سٹوری جو پہلے علی گڈھ کالج میں عربی کے پروفیسر تھے، وہ یہاں اسسٹنٹ لائبریرین ہیں، ڈاکٹر آرنلڈ جو کسی زمانہ میں علی گڈھ کے گذشتہ علمی دور کے ایک ممبر تھے، وہ گو لائبریری سے تعلق نہیں رکھتے لیکن انڈیا آفس سے متعلق ہیں، ان دونوں بزرگوں کا ممنون ہوں کہ انھوں نے لائبریری کے دیکھنے میں ہر طرح مدد دی،

اس لائبریری میں عربی، فارسی، اردو، سنسکرت، بنگالی، گجراتی، ہندی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے، عربی اور فارسی کی بعض نادر قلمی کتابیں نظر سے گذریں، قطعات کا ایک نادر مجموعہ یہاں دیکھا، جو کبھی ممتاز محل بیگم کی ملک تھا، یہ وہی ممتاز محل ہیں جو شاہجہاں کی چہیتی بیوی تھیں، اور جن کے غیر فانی نام کو تاج محل ہمیشہ زندہ رکھے گا،

تصویروں کا ایک مرقع مجھے دکھایا گیا، جو دارا شکوہ کی ملکیت میں تھا اس میں شاہزادہ کے مختلف زمانوں بچپن تعلیم، جوانی کی تصویریں ہیں، کوفی خط میں لکھا ہوا قرآن مجید کا ایک نسخہ دیکھا، جو نہایت عتیق ہے، یہ نسخہ قدیم عربی خط کے مطابق زیر و زبر اور نقطوں سے خالی ہے، مجھے ہندوستان میں تاریخ شیر شاہی کی تلاش تھی، یہاں اس کے متعدد نسخے دیکھے، مگر افسوس کہ کتاب کی نوعیت کی نسبت ذہن میں جو خیال تھا، وہ صحیح نہیں نکلا،

اس وقت سرسری طور سے کتب خانہ کی اردو کتابوں کے ذخیرہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، انڈیا آفس لائبریری تقریباً اسی وقت سے قائم ہے، جب سے اردو نے اپنی ترقی کا آغاز ۱ھ انگلستان میں اردو کتابوں کے ذخیرہ کے متعلق پہلی اطلاع ہندوستان میں شائع ہوئی " سلیمان "

کیا ہے، اور اگلے انگریزوں کو چونکہ اپنی نئی حکومت کی تازہ ترین زبان سے غیر معمولی دلچسپی
تھی، اس لئے اس لائبریری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اردو کی قدیم ترین کتابیں جو ہندوستان
میں ناپید ہیں، وہ یہاں موجود ہیں، اردو کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست ایک جلد میں جو
۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے چھپی ہے، اس فہرست کو بلوم ہارٹ صاحب ([illegible] -
Blum hart) نے مرتب کیا ہے، یہ اردو کے فاضل ہیں، اور کسی زمانہ میں ہندوستان
میں بھی رہ چکے ہیں، قلمی کتابوں کی فہرست بھی اُن کے زیر تحریر ہے، مسٹر اسٹوری نے
اُس کا مسودہ خاص طور سے منگوا کر دکھایا، مگر چونکہ بلوم ہارٹ صاحب خود موجود نہ تھے
اس لئے ان کے بلا اجازت اس مسودہ سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔

بہر حال مطبوعہ اردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی
اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مغرور ہونا پڑا کہ اللہ اللہ ہماری زبان بھی اتنی ترقی پا چکی ہے
کہ تین سو صفحوں میں اس کی فہرست تمام ہوئی ہے، یہ فہرست سنہ ۱۸۸۹ء میں چھپی ہے، اس لئے
موجودہ بیسویں صدی کی کتابیں اس میں شامل نہیں ہیں، اس فہرست کو دیکھ کر یہ تعجب
ہوا کہ اردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک اچھی زبان بن گئی تھی، دوسری بات یہ نظر آئی کہ
اس زبان کو علمی بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہلِ قلم کا برابر کا ساجھا تھا، یہ وہ
زمانہ تھا جب ہندوستانی یونیورسٹیوں کی تاریخ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو حصوں
میں منقسم نہیں کیا تھا، بلکہ جب صرف ایک سالم اور متحد ہندوستان دنیا میں موجود تھا۔

بہر حال اردو کتابوں کی یہ فہرست جو صرف مطبوعہ کتابوں پر مشتمل ہے، چھ عنوانوں
پر بٹی ہے، علوم و فنون، تاریخ و جغرافیہ، ادبیات، کتب تعلیمی، الہٰیات، متفرقات، ہر ایک
عنوان کے تحت میں حسبِ ذیل تقسیمات ہیں:-

۱۔ علوم و فنون

۱۔ زراعت و نباتات
۲۔ صنعت و حرفت
۳۔ ہیئت و نجوم،
۴۔ علم الطبخ
۵۔ نیرنگ و طلسمات
۶۔ علم المنزل و قواعد صحت
۷۔ نقشہ کشی
۸۔ اخلاق
۹۔ ورزش و سپہ گری،
۱۰۔ قانون
۱۱۔ انگریزی قانون،
۱۲۔ ہندو قانون
۱۳۔ اسلامی قانون،
۱۴۔ منطق و فلسفہ،
۱۵۔ طب تشریح،
۱۶۔ علم الحرب،
۱۷۔ موسیقی
۱۸۔ لغت
۱۹۔ علم السفر
۲۰۔ طبعیات
۲۱۔ معاشیات
۲۲۔ علم المعانی والبیان،
۲۳۔ اجتماعیات،
۲۴۔ طب حیوانات (بیطاری)

۲۔ تاریخ و جغرافیہ

۱۔ عام سوانح عمریاں
۲۔ سوانح محمد صلی اللہ علیہ وسلم
۳۔ سوانح ائمہ کرام،
۴۔ حالات قبائل و فرق،
۵۔ علم الانساب،
۶۔ جغرافیہ و تقویم البلدان،
(ٹاپوگرافی)
۷۔ عام تاریخ،
۸۔ مقامی تاریخ،
۹۔ سفرنامہ

۳- ادبیات

۱- دواوین،
۲- ڈراما
۳- خطوط و مکاتیب،
۴- انتقاداتِ ادبیہ
۵- شاعری
۶- عام شاعری
۷- تذکرۂ شعراء
۸- مذہبی شاعری،
۹- مذہبی ہندو شاعری،
۱۰- مذہبی اسلامی شاعری
۱۱- محاورات و امثال
۱۲- قصص و افسانہ
۱۳- قصص منظومہ
۱۴- قصص منثورہ،

۴- تعلیمی کتابیں

۱- قواعد
۲- قواعد عربی
۳- قواعد برگسنا (پشتو)
۴- قواعد انگریزی
۵- قواعد ہندی
۶- قواعد ہندوستانی (اردو)
۷- قواعد کشمیری
۸- قواعد فارسی
۹- علم الخط،
۱۰- ریاضیات
۱۱- علم جبر و مقابلہ،
۱۲- علم الحساب
۱۳- علم حساب الکلیات والجزئیات
۱۴- اقلیدس،
۱۵- علم المساحت،
۱۶- علم وزن و پیمائش
۱۷- علم المخروطات والاشکال،
۱۸- علم المثلثات
۱۹- ابتدائی تعلیمی کتابیں، (ریڈرس)
۲۰- انتخابات،

۵ - الٰہیات

۱ - برہمنی اور لا مذہبی،	۱۰ - مناظرہ و موازنۂ ادیان
۲ - بودھی	۱۱ - ہندو مذہب
۳ - عیسائی	۱۲ - جینی مذہب،
۴ - بائبل	۱۳ - اسلام
۵ - بائبل لٹریچر	۱۴ - عبادات،
۶ - تاریخ کلیسا	۱۵ - عقائد،
۷ - تعلیمات	۱۶ - قرآنیات
۸ - ادعیہ و مزامیر	۱۷ - حدیث
۹ - قصص	۱۸ - سکھ مذہب،

۶ - متفرقات

۱ - تعلیمات	۴ - مجموعہ ہائے تقریر و مضامین،
۲ - تعلیم النسواں	۵ - رسائل موقت الشیوع،
۳ - تعلیم الصبیان،	۶ - روداد مجالس،

ذیل میں ان چھ عنوانوں میں سے چند کتابوں کے نام، مصنف کے نام، اور تاریخ طبع، اور مقام طبع لکھے جاتے ہیں، اس انتخاب میں قصداً صرف وہی کتابیں لی ہیں، جو غدر سے پہلے یا اس کے بعد کسی قریب زمانہ میں لکھی گئی ہیں قصص و منظومات کو ہاتھ نہیں لگایا ہے، کہ ہر شخص جانتا ہے کہ اردو میں ان کا بڑا ذخیرہ ہے، صرف علمی کتابیں لی ہیں، ان پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ علوم جدیدہ کی مختلف شاخوں میں

کس تیزی سے اردو اس وقت تک ترقی کر رہی تھی، جب تک وہ سارے ملک کی متحدہ زبان تھی، اور نفاقِ قومی سے نا آشنا تھی،

فنِ زراعت

۱- چا ے لگانے کی کتاب ۱۷ صفحہ مطبوعہ لاہور، ۱۸۵۳ء

۲- گنگا کی نہر مترجمہ سدا سکھ لال از انگریزی ص ۴۴ ۱۸۵۴ء مطبوعہ آگرہ

۳- کھیت کرم مصنفہ کالی رائے تین حصے دہلی ۱۸۴۶ء و ۱۸۴۹ء و ۱۸۵۰ء

۴- پندنامہ کاشتکاری مصنفہ موتی لال آگرہ ۱۸۵۲ء

۵- علم الفلاحت رابرٹ اسکاٹ برن صفحہ ۲۵۲ علی گڑھ ۱۸۶۵ء

۶- علم الفلاحت میجر کاربٹ الہ آباد، ۱۸۶۹ء

۷- ریشم کا کیڑا موتی لال لاہور ۱۸۵۳ء

۸- تجربۂ تخم غلام نبی میرٹھ ۱۸۶۵ء

۹- توصیفِ زراعت۔ کلب حسین خان آگرہ ۱۸۶۰ء

سائنٹفک کتابیں

۱- بحر الحکمت (اسٹیم انجن کا بیان) ریورنڈ پارکن ۱۸۴۷ء لکھنؤ،

۲- بخار کی کل ” اشوری لال ۱۸۵۵ء بنارس،

۳- نور النواظر احمد علی کانپور ۱۸۵۴ء

۴- علمِ تعمیر کالی پرشاد، اور سید علی ۱۸۶۳ء پٹنہ

۵- قانونِ انطباع (چھاپہ) ستیل سنگھ، دہلی ۱۸۶۷ء،

نجوم ہیئت

۱۔ خلاصۂ نظام آسمانی پنڈت واسی و ہیرا آگرہ ۱۸۵۲ء

۲۔ مفتاح الافلاک عبدالسلام کلکتہ ۱۸۳۳ء صفحہ ۲۷۲

۳۔ نظام آسمانی (انگریزی مع ترجمۂ ہندوستانی) کلکتہ ۱۸۳۶ء

۴۔ مختصر احوال نظام آسمانی ۱۸۴۰ء آگرہ

۵۔ مختصرۂ فائق النجوم، بڑے صاحب گھٹالے، مدراس ۱۸۴۰ء

۶۔ اصول علم ہیئت رام چندر دہلی، ۱۸۴۰ء صفحہ ۳۲۵،

۷۔ علم ہیئت، ترجمہ لفٹنٹ میلس لکھنؤ ۱۸۳۲ء

جغرافیہ

۱۔ ترجمہ مراصد الاطلاع (عربی) در اردو۔ عبدالمومن ۱۸۶۱-۶۲ء

پورٹ بلیر ۳ جلد

۲۔ فتح گڈھ نامہ (احوال ضلع فتح گڈھ) کالی رائے دہلی ۱۸۴۹ء ص ۲۰۴،

۳۔ علم جغرافیہ ترجمۂ میر غلام علی کلکتہ ۱۸۵۱ء صفحہ ۲۲۰،

۴۔ جغرافیۂ عالم دہلی ۱۸۵۳ء ص ۱۰۹،

۵۔ خلاصۂ علم الارض (مع انگریزی) کلکتہ ۱۸۲۴ء

۶۔ خلاصۃ الجغرافیہ آگرہ ۱۸۵۴ء

۷۔ مرآۃ الاقالیم کلکتہ ۱۸۳۶ء ص ۱۴۰،

۸ - مختصر بیان جغرافیۂ ہند، پنڈت چنتامنی کانپور ۱۸۶۷ء

۹ - جغرافیہ کا پہلا رسالہ، مترجم از انگریزی، میر غلام علی مدراس، ۱۸۵۲ء

۱۰ - جغرافیہ ہند از انگریزی، پنڈت سواروپ نرائن و سیواروپ نرائن دہلی - ۱۸۴۳ء صفحہ ۱۲۲،

طبیعیات

۱ - عجائب روزگار، رام چندر، دہلی، ۱۸۴۷ء

۲ - بجلی کی ڈاک، جے ڈبلو بیل آگرہ، ۱۸۵۴ء

۳ - ہوا کا بیان، بدری لال، بنارس، ۱۸۵۴ء

۴ - علم حکمت (میکینکس) چارلس فنک، کلکتہ ۱۸۴۳ء ص ۳۰۱،

۵ - معدنیات، جواہر لال آگرہ، ۱۸۵۵ء

۶ - خلاصۃ الصنائع (ترجمہ از انگریزی) بھولا ناتھ آگرہ ۱۸۵۲ء ص ۲۱۱،

۷ - مرآۃ العلوم، ہری ورمن لال، بنارس، ۱۸۴۹ء

۸ - رسالہ مقناطیس، ترجمہ از انگریزی، سید کمال الدین دہلی ۱۸۵۰ء ص ۲۶۱

۹ - تحصیل فی جر الثقیل، سید احمد خان آگرہ ۱۸۴۴ء

۱۰ - اصول علم طبیعی ترجمہ از انگریزی، اجودھیا پرشاد و سیوا پرشاد دہلی ۱۸۴۳ء ص ۱۶۹،

۱۱ - اصول جر الثقیل، محمد احسن بنارس، ۱۸۵۴ء

۱۲ - اصول قواعد مائیات، ترجمہ انگریزی، اجودھیا پرشاد دہلی ۱۸۵۰ء صفحہ ۲۶۴

۱۳- مقاصد العلوم ترجمۂ انگریزی ، سید محمد میر ۱۸۴۱ء ، کلکتہ ،

۱۴- دائرۂ علم (نیچرل فلاسفی) محمد کریم بخش ، لکھنؤ ۱۸۶۶ء

معاشیات (پولٹیکل اکانومی)

۱- ترجمۂ معاشیات مل ، وزیر علی دہلی ۱۸۴۴ء صفحہ ۴۱۸،

۲- اصول علم انتظام مدن ، ترجمۂ انگریزی ، (ہرم نرائن ، دہلی ۱۸۴۶ء ،)

۳- اصول سیاست مدن ، دھرم سہا ، علی گڑھ ، ۱۸۶۵ء

۴- علم انتظام مدن ، ترجمۂ انگریزی ناسو ولیم سینیر ، علی گڑھ ۱۸۶۴ء

علم معاشرت

۱- اقبال فرنگ ، بیان عادات وآداب و احوال فرنگ ، نواب اقبال الدولہ بہادر ، کلکتہ ۱۸۳۴ء

۲- دستور عمل امورات شادی و غمی ، چراغ شاہ ملتانی ۱۸۶۸ء

۳- اشتہار کمیٹی ، درباب تخفیف مصارف شادی آگرہ ۱۸۶۸ء

۴- ترمیم ضوابط شادی ، آگرہ ۱۸۶۸ء

۵- ضوابط شادی آرہ ۱۸۶۸ء ایضاً پٹنہ ۱۸۶۸ء

منطق

۱- ترجمۂ شمسیہ ، مولوی سید محمد ، دہلی ، ۱۸۴۴ء ،

۲- میزان العلوم، سید عبد العلی پٹنہ، ۱۸۶۹ء

۳- خلاصۃ المنطق، دیوی پرشاد، بدایوں ۱۸۶۹ء

لائبریری کے بند ہونے کا وقت آگیا، اس لئے مجبوراً یہ فہرست تمام ہوتی ہے، ورنہ جی تو چاہتا تھا کہ اس تمام ذخیرہ کا ایک سرسری جائزہ ناظرین معارف کے پیش کرسکتا،

۲۷/ اپریل ۱۹۲۰ء

البرٹ ہال مینشن لندن،

(معارف ماہ جون ۱۹۲۰ء)

کتبخانۂ حمیدیہ بھوپال

ایک زمانہ تھا کہ بھوپال مشرقی علوم وفنون کا مرکز تھا، سیکڑوں فضلا رہتے تھے، طلبہ کا ہجوم تھا، نوادر کتب کا ذخیرہ تھا، دنیائے اسلام سے ہر روز نادر اور قلمی کتابوں کے تحفے بھوپال میں پہونچتے تھے، اگر اس وقت ریاست کا کوئی پبلک کتابخانہ ہوتا، تو اس وقت وہ رام پور، ٹونک اور حیدر آباد کی برابری کرتا، مگر افسوس ہے کہ اُس وقت کے کتب خانے امراء کی ذاتی ملکیت اور نشان امارت کے طور پر تقسیم ہو کر فنا ہوگئے، اور اب اُن کا ایک نسخہ بھی بھوپال میں موجود نہیں

بھوپال کے امراء میں سے ایک نواب فوجدار محمد خان کی کتابیں بھوپال میں رہ گئیں ہیں، اور ان کی کچھ یادگاریں باقی ہیں، غالب کے دیوان کا مکمل اردو نسخہ اسی کتب خانہ سے برآمد ہوا، ابن تیمیہ کی الرد علی المنطقیین کا نایاب نسخہ جو اب کتبخانہ آصفیہ کا مایۂ ناز ہے وہ بھوپال ہی کی ملکیت تھا، اور اب بھی بڑے بڑے کتب خانوں میں بھوپال کی یادگاریں ملیں گی جن کو تقدیر نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے،

ریاست بھوپال میں اصلاحات کا دور سرکار عالیہ نواب سلطان جہان بیگم مرحومہ کے عہد سے شروع ہوا، انہی میں سے ایک پبلک کتبخانہ کا قیام ہے، جو سرکار مرحومہ کے

سب سے چھوٹے صاحبزادہ اور والی بھوپال نواب حمید اللہ خان بہادر کی طرف منسوب ہو کر حمیدیہ کہلاتا ہے، اس کی عمارت شاہجہان آباد کے خاتمہ پر ایک نہایت عمدہ پُرفضا موقع پر بڑی عمارت وسیع کلبہ اور شاندار ہے، مقام بھی پُرسکون اور مطالعہ کے لئے موزوں ہے،

میری آمد و رفت بھوپال میں ۱۹۱۰ء سے ہے، اس وقت تو اُس کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، اور معلوم بھی نہیں کہ وہ اس وقت تھا بھی یا نہیں مگر ۱۹۱۴ء کے آخر میں جب مولانا شبلی مرحوم کی وفات کے بعد سرکار عالیہ مرحومہ کی طلبی پر حاضری ہوئی، تو اس وقت اس کتب خانہ کی حالت نہایت معمولی تھی، اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً جاتا رہا، مگر دیکھا کہ انگریزی کتابوں کی طرف توجہ زیادہ تھی گوشہال صاحب ایک دیسی عیسائی اس کتبخانہ کے ناظم تھے، ظاہر ہے کہ ایک اسلامی اور مشرقی کتب خانہ کی خصوصیتوں اور ضرورتوں سے اُن کو کیا واقفیت ہوگی، گو اس وقت بھی کہنے کو مشرقی صیغہ موجود تھا، البرامکہ کے مشہور مصنف مولوی عبدالرزاق صاحب بھی یہیں بیٹھ کر سرکار عالیہ مرحومہ کے اخیر زمانہ میں تاریخ اسلام کی تالیف و ترتیب میں مصروف رہتے تھے،

اس وقت یہ کتابیں جو کچھ تھیں مطبوعہ تھیں، قلمی کتابیں گویا نہیں تھیں، افسوس ہوتا تھا کہ ایک مشہور اسلامی ریاست جس کی نیک نامی کی شہرت چار دانگ عالم میں ہے، وہ اس حیثیت سے تہی مایہ ہو،

سب سے اخیر جولائی ۱۹۳۳ء میں کئی سال کے بعد وہاں جانے کا اتفاق ہوا، اعلیٰ حضرت سکندر صولت بہادر کی فرماں روائی کے عہد میں یہ دوسری بار بھوپال کی حاضری تھی، خیال آیا کہ اس علمی سیرگاہ کی پھر زیارت کر لی جائے،

اس دفعہ جو کتب خانہ گیا تو اس کا رنگ بدلا پایا، کتابیں بھی زیادہ تھیں اور سلیقہ

سے تھیں، اور سب سے زیادہ یہ کہ بعض پرانے شاہی فرامین اور مغل شہزادیوں کی مشقی وصلیاں اور قطعات بھی نظر آئے،

بابر کا فرمان بھوپال | بابر کا وہ پرانا فرمان جس کو سنہ ۱۹۱۴ء میں دیکھ چکا تھا، اب بھی موجود تھا، یہ چھوٹی تقطیع کے معمولی کاغذ پر خط نستعلیق میں تحریر ہے، اس میں بابر نے ہمایون کو ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے یہ نصیحت کی ہے کہ وہ ہندؤوں کا دل اپنے ہاتھ میں لے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ گائے کی قربانی بند کرے،

میں اس فرمان کو پہلے بھی جعلی سمجھتا تھا، اور اب بھی سمجھتا ہوں، اس پر چند سال کے عرصہ میں بہت سے ارباب تحقیق نے مختلف خیالات ظاہر کئے ہیں، مسلمان فضلا نے مذہبی تعلق سے قطع نظر صرف علمی اور فنی حیثیت سے بھی اس کو بالکل غیر معتبر ٹھہرایا ہے، ابھی ایک سال ہوا ہوگا کہ بعض روزانہ انگریزی اخبارات میں وصیت نامہ کی روشنی میں مسلمان سلاطین کی بے تعصبی کو بہت کچھ سراہا گیا تھا،

میرے قیاس میں یہ دستاویز مغل حکمرانوں کے اخیر عہد میں تصنیف ہوئی ہے جب حکومت پر راجپوت راجاؤں کا اثر و اقتدار کافی مضبوط تھا، اور ان کے مشورہ سے بادشاہ وقت کی طرف سے ایک فرمان اسی مضمون کا تمام ممالکِ محروسہ میں جاری ہوا تھا،

نورجہان کا نوشتہ | کتب خانہ میں دو نہایت نادر وصلیاں ہیں، یہ دونوں دو مشہور مغل بیگموں کے ہاتھوں کی لکھی ہوئی ہیں، ایک نورجہان بیگم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، اور خطاطی کا بہترین نمونہ ہے، عبارت حسب ذیل ہے،

باعثِ انبساطِ شہنشاہی

بربیت مہ نور

از عدل شہنشاہی معمور جہاں باشد

وز نور جہانگیری پُر نور جہاں باشد

نمیقۂ نور جہاں سنہ ۱۰۲۹ھ

معلوم ہوتا ہے کہ نور جہاں نے یہ وصلی لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کی تھی،

زیب النسار کا نوشتہ

عالمگیر اورنگ زیب کی فاضل بیٹی زیب النسار کے علمی کمالات کا ذکر تاریخ کے اوراق میں رہ گیا ہے، اس کے نام سے علمائے وقت نے جو کتابیں تصنیف کی تھیں، اُن میں سے صرف ایک کا سُراغ مل سکا ہے، باقی کے صرف نام ہی نام اب تک سُنتے ہیں،

بیگم کو خطاطی میں بھی کمال حاصل تھا، چنانچہ نستعلیق، نسخ اور شکستہ خط نہایت عمدہ لکھتی تھی، مورخین کے اس متفقہ بیان کی تصدیق کتب خانۂ حمیدیہ کی ایک وصلی سے ہوتی ہے، یہ وصلی بیگم نے عالمگیر کی خدمت میں اس وقت پیش کی تھی، جب اوس نے سنہ ۱۱۱۱ھ میں مرہٹوں کے دار الحکومت ستارہ کو فتح کیا تھا، اس وصلی میں ایک شعر ہے، جس میں ستارہ کی فتح کی ایک نہایت عمدہ تاریخ کہی گئی ہے،

از معجزۂ شق القمر عیاں شُد

فتح ستارہ

اعجاز خسروی ہُ "شق ستارہ" آمد

زیب النسار

بیگم کے اُستاد مُلا سعید اسے اشرف عہد شاہجہانی کے مشہور خطاط آقا عبد الرشید دیلمی کے شاگرد تھے، شاید بیگم کو یہ فیض یہیں سے پہونچا،

کتابیں کتب خانہ کی قلمی فہرستیں موجود تھیں، سرسری نظر سے جو کتابیں یادداشت کے قابل نظر آئیں وہ حسب ذیل ہیں،

۱۔ اُستاد عبداللہ بن سالم بصری یہ بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شیخ ابوطاہر مدنی کے شیخ اور علوم حدیث میں یکتائے روزگار تھے، ۱۱۳۴ھ میں وفات پائی، مصنف نے اس رسالہ میں اپنے اسانید جمع کئے ہیں، رسالہ کی کتابت ۱۲۶۹ھ میں ہوئی ہے، اس رسالہ کو الامداد بمعرفۃ علو الاسناد، تشیخ سالم بن عبداللہ بن سالم بصری ثم مکی سے ملاکر دیکھنا چاہئے، شاید وہی ہو؛

۲۔ العلل المتناہیہ فی الاحادیث الواہیہ محدث ابن جوزی کی نہایت اہم تصنیف ہے، اس میں ضعیف و موضوع احادیث پر تبصرہ کیا گیا ہے، نسخہ نیا ہے ۱۲۹۹ھ میں نقل ہوا ہے،

۳۔ تفسیر وجیز واحدی واحدی نیشاپوری المتوفی ۴۶۸ھ کی مختصر عربی تفسیر، مصنف کی بڑی، اوسط اور چھوٹی تین تفسیریں بسیط، وسیط اور وجیز کے ناموں سے ہیں، یہ وجیز کا نسخہ ہے۔ اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی، اس کتاب کا عمدہ نسخہ رامپور میں ہے، جو ۹۷۷ھ میں جمپانیر واقع گجرات میں لکھا گیا ہے،

۴۔ تیسیر البیان فی تفسیر احکام القرآن مصنف کا نام محمد بن علی بن ابراہیم یمنی ہے، اس کا ایک نسخہ کتبخانۂ محمودیہ مدینہ منورہ میں نظر سے گذرا، دوسرا نسخہ کتبخانۂ آصفیہ حیدرآباد میں ہے، تیسرا نسخہ یہاں نظر آیا، ۸۰۸ھ میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، بھوپال کا نسخہ ۱۰۵۱ھ کا ہے،

۵۔ صحیح بخاری جلد اول کا ایک نہایت عمدہ مطلا نسخہ جس پر اکبر بادشاہ اور محمد شاہ کی مہر

ثبت ہیں،

۶- الدیباج علی مسلم بن الحجاج سیوطی	صحیح مسلم کی شرح ہے،

۷- التنقیح علی الجامع الصحیح	بدر الدین زرکشی کی شرح بخاری ہے، اس کتاب کے اور بھی نسخے نظر سے

گذرے، مگر یہ نسخہ زیادہ قدیم معلوم ہوا، ۸۵۷ھ کی کتابت ہے، اور مصنف کی وفات ۷۹۴ھ میں ہوئی ہے،

۸- الکواکب الدراری علی صحیح البخاری	صحیح بخاری کی شرح ہے، مصنف کا نام شمس الدین محمد بن یوسف کرمانی المتوفی ۷۹۶ھ ہے، شرح کا ممتاز پہلو یہ ہے کہ اس میں

احادیث کے لغات اور نحو سے خاص طور سے بحث کی گئی ہے، ۷۷۵ھ میں تکمیل کو پہونچی،

۹- ابن ابی شیبہ	اس کتاب کے متفرق اجزاء مختلف کتب خانوں میں نظر سے گذرے

مگر کامل کہیں نہیں دیکھی، یہاں بھی کامل نہیں ہے، یہاں کے نسخہ پر نام مسند ابن ابی شیبہ لکھا ہے،

۱۰- طبقات الفقہاء ابن کمال پاشا	حنفی فقہاء کے حالات میں جو چند کتابیں لکھی گئی ہیں ان

میں ایک آخر کتاب یہ ہے، مصنف کا نام شمس الدین احمد بن سلیمان بن کمال پاشا ہے، سلطان سلیم کے عہد میں مشہور ترکی عالم تھے، ۹۴۰ھ میں وفات پائی، کتاب گو مختصر ہے، مگر ابن قطلوبغا کی تاج التراجم کے بعد کے لئے یہ مفید ہے، اس کا کوئی اور نسخہ نظر سے نہیں گذرا،

۱۱- فتاوی واقعات المفتیین	مصنف کا نام عبد القادر بن یوسف ہے،

۱۲- فتاوی اکبر شاہی	مصنف کا نام عتیق اللہ ہے،

۱۳- ارشاد	شاہ ولی اللہ صاحب کی تصانیف میں سے یہ رسالہ یہیں نظر آیا، یہ اصول حدیث میں ہے،

۱۴- عجائب البلدان	فارسی،

۱۵- تاریخ افغانی	شیر شاہ سوری کے حالات میں عبد اللطیف بیجاپوری کی تصنیف،

۱۶- تاریخ ناصر شاہی	مانڈو (مالوہ) کے سلطان ناصر الدین خلجی کے حالات،

۱۷- رقعات عالمگیری | رقعات کا یہ نسخہ دوسرے نسخوں سے الگ معلوم ہوا، اس کے مُرتّب کا نام آل محمد صالح ہے اس میں پہلا خط شاہ ایران کے نام ہے، عبارت یہ ہے،

"نامۂ اورنگزیب بہ اورنگ آرائے ولایت طہران،

آغاز یہ ہے :-

"حمدے کہ طائرانِ ریاض ملکوت"

۱۸- کلیات انوری کا ایک عمدہ نسخہ مع غزلیات و رباعیات،

اور بھی کچھ نادر کتابیں ہوں گی جو سرسری نظر میں رہ گئی ہوں گی،

کتب خانۂ حمیدیہ کا موجودہ ذخیرہ بہرحال ترقی و تکمیل کا بہت زیادہ محتاج ہے اس وقت بھی صرف بھوپال میں اتنی کتابیں ہیں جن کو اگر ایک جگہ جمع ہی کر دیا جائے تو بہت کافی ہو سکتا ہے، وہاں کے ایک تاجر کتب قلمی کے پاس سیکڑوں کتابیں ہیں، اگر سال میں تین ہزار روپیہ بھی قلمی کتابوں کی خریداری پر صرف کیا جائے تو بھوپال کا کتب خانہ بھی چند برسوں میں دوسری ریاستوں کے کتب خانوں کا مقابلہ کرنے لگے، مگر ابھی تو جو کچھ ہے، وہ آغاز ہے اسلاف کا سرمایہ ہندوستان سے یورپ کو بہا جا رہا ہے، ہمارے امراء کی تھوڑی سی قدردانی کا ہاتھ اس سیلاب کو روک سکتا ہے، کیا سرکار بھوپال کی توجہ ادھر مبذول ہو سکتی ہے؟

معارف ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء

سلسلۂ مقالاتِ سلیمان

مقالاتِ سلیمان تاریخی جلد اوّل

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد بلند پایہ تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی و مذہبی و فقہی و تاریخی و ادبی و تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں، جو الندوہ اور معارف کے ہزاروں صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں، ان میں سے بعض بعض تو مستقل رسالوں کا حکم رکھتے ہیں، اور وہ صاحبِ مقالات کی زندگی میں رسالوں کی صورت میں شائع بھی ہوئے، اور مقبول بھی ہوئے، اور اُن کی اعلیٰ تحقیقات اور مواد کی تلاش و جستجو پر یورپ کے مستشرقین اور ہندوستان کے علمأ و محققین نے اُن کو داد بھی دی، مثلاً حیاتِ امام مالک، بہادر خواتین اسلام، رسالہ اہلِ سنت والجماعۃ، مسئلہ خلافت، اور ہندوستان، اور خیام وغیرہ وغیرہ، سید صاحب کے سلسلۂ مقالات کی یہ پہلی جلد جو ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، اُن کے ان اہم تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر رقام فرمائے، اور ہندوستان و بیرونِ ہند کے اہلِ قلم و تحقیق سے داد حاصل کی، اس مجموعہ کے بعض اہم مضامین یہ ہیں، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی اور علمی ترقیاں، سلطان ٹیپو کی چند باتیں، ہندوستان میں اسلام کی اشاعت، ہند دکش عالمگیر کے عہد کی دو عجیب کتابیں، لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان، نالندہ کی سیر، تاج محل اور لال قلعہ کے معمار، اُستاد احمد معمار کے خاندان کی ایک دریادگار، مُلّا خیر اللہ مہندس، کے چند نئے رسائل، قنوج، خطبۂ صدارت شعبۂ تاریخ ہند از منۂ وسطی آل انڈیا ہسٹری کانگرس منعقدہ ۱۱ دسمبر ۱۹۴۲ء، ہندی الاصل اور ہندوی النسل مسلمان سلاطین، اُن کے علاوہ اس میں مسئلۂ خلافت کے سلسلہ کے بھی تمام مضامین آگئے ہیں، جن سے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں سے ترک سلاطین خلفاء کا تعلق ظاہر ہوگا، قیمت ؏

سید صباح الدین عبد الرحمٰن، ایم - اے،

"منیجر"